

READING SECTION

Online Library For Pakistan

WWW.PAKSOCIETY.COM

READING SECTION

Online Library For Pakistan

WWW.PAKSOCIETY.COM

SEPTEMBER  
2015

READING SECTION

Online Library For Pakistan

WWW.PAKSOCIETY.COM

READING SECTION

Online Library For Pakistan

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

میک اپ روز پھوٹی پارلر  
فونو گرانڈ میوکی ارضیا

WWW.PAKSOCIETY.COM



چیف ایڈیٹر

# رداء الجسٹ

## صالحہ محمود

ایڈیٹر

صدی گورد جعفری

فائنڈنگ، فراز جعفری

E-Mail: trajo@red.com

فائنڈنگ، UAE، عمیر عسلی جعفری

Mail: eesli@red.com

فائنڈنگ، فرائز آصف نوجوان

عید الفصحی مبارک



READING Section





ناولٹ

ملاقات

۶۴

رمضانور

فیصلہ

افسانے

۱۸۸

نگہت اکرم

عامر حیات

سلسلے وار ناول

۷۸ فرحین اظفر

لا پرواہ

۸۸ سارہ راجکمار

۱۶۲ جذبہ قربانی

۱۱۶ اقرا چنا

۱۰ سفر سے ہم سفر تک

۱۲۶ سائرہ عبدالغفار

۹۲ یہ اور ان

۱۳۰ عائشہ الیاس

انجام

۱۳۴ رابعہ افضل

یہ وطن ہمارا ہے

۱۳۸ فرح ناز رفیق

دل کا مکین

۱۴۲ حنا شرف

عید ایثار اور خوشی

۱۴۸ ریمانور

اعتماد ریزہ ریزہ

۱۶۰ سدرہ شاہین

یقین کامل

۱۵۲ افسانہ آفتاب

اڑان

۱۶۶ شہلا گل سحر

جنت کارتہ

ستمبر 2015ء

جلد نمبر 21 شمارہ نمبر 9

قیمت 60 روپے

ذریعہ سالانہ بذریعہ رجسٹری

720 روپے



34535726

پبلشر و ایڈیٹر صالحہ محمود نے ابن حسن پر تنقید پر پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔  
مقام اشاعت: ۱۱۲۹ ڈی بلاک - 2 - پی - ای - سی - ایچ - سوسائٹی، کراچی

انتباہ:-

ہماری "روزانہ" ڈائجسٹ میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق بحق ادارہ محفوظ ہیں اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی ٹی وی چینل یا ڈرامہ، ڈرامائی ٹیلی ویژن اور سلسلے وار کسی اور ذریعہ سے اشاعت پر ادارہ چوری کی ایف آئی آر درج کرادے گا اس لئے پبلشر سے اجازت لینا ضروری ہے ادارہ "روزانہ" پبلشر۔

READING Section



مستقل سلسلے

۲۰۸	صالحہ محمود	۷	سندیے	صالحہ محمود	روائے جنت
۲۲۰	ثریا اقبال	۱۹۲	کچن	صدق سعد	روا کی ڈائری
۲۲۵	شہلا مشائق	۲۰۱	سنگھار	شہلا مشائق	ذرا پھر سے کہنا
۱۹۳	نورین ملک	۱۹۸	اشعار	نورین ملک	خوشبو
۲۱۳	ادارہ	۱۹۵	دوستوں کے نام پیغام	نورین ملک	اس ماہ میں
۲۱۸	ادارہ		گوشہ چشم		



READING  
Section





خوبصورت رنگ بھرے موسموں میں اس بار عید قربان آن پہنچی ہے اس خوش نصیب ساعت میں آپ اپنے لیے کچھ اہم سوچنے اپنے ماحول اور اپنے گھر میں کچھ نئے انداز سے تبدیلی لائیں یعنی حقیقت پسندانہ انداز میں وقت کی تقسیم کر کے اپنی روٹین کو بامقصد بنائیں پرسکون رہیں۔ خلوص اور محنت کے ساتھ اپنے کسی بھی مقصد کو حاصل کریں۔ اپنی ناکامی پر بھی دلبرداشتہ نہ ہوں حصول علم کی جدوجہد جاری رکھیں اگر دیگر مسائل سے آپ دوچار ہیں تو اللہ پر بھروسہ رکھیں کہ آج نہیں تو کل اللہ کا کرم ہو جائے گا۔ بات صرف یہ کہنے کی ہے کہ ہمت نہ ہاریے چھوٹے سے چھوٹے کام کو بھی دوسرے کام سے جوڑ کر رکھیے۔ کامیاب زندگی کا راز یہی ہے کہ ایک دن پہلے آپ اپنا شیڈول ترتیب دے لیں کہ صبح پہلی فرصت میں کیا کرنا ہے۔ دوسری بات بہت اہم یہ ہے کہ انسانی حیات نو کے لیے سب سے اہم جزو جو صحت کے لیے ہے اپنی روح پاک اور صاف رکھیں۔ روح ہمارے جسم کے اندر قید ہے جب روح جسم کو آزاد کرتی ہے تو کیا ہوتا ہے؟ یہ آپ سب جانتے ہیں اگر ہم اپنی روح کو اتنا پاک و صاف رکھیں یعنی بعض اور کینہ، نفرت، حسرت ان شیطانی عناصر سے ہم اگر بچ جائیں تو ہمارا جسم صحت مند اور تندرست رہے گا۔ اس پر بہت سارے دانشوروں نے اپنی رائے دی ہے ناچیز کا مشاہدہ بھی یہی ہے خوش، حسد اور بعض اور ہر وقت کے تناؤ سے اگر دور رہا جائے تو انسان صحت مند رہتا ہے۔ ماحول جتنا خوشگوار ہوگا آپس میں تعلقات ہوں گے اور آپ صحت مند رہیں گے۔ آپ کے فکر و عمل کی دنیا آباد رہے گی۔ یہ خاص پیغام ہے میرا اس حج کی سعادت کے موقع پر پیغام محبت ہے۔ میرا یہ ایک ایسا مکمل تجزیہ ہے آپ کی صحت کا راز آپ کے خوشگوار ماحول میں ہے رشتے داریاں چھوڑ کر اہل و عیال سے تعلقات بگاڑ کر غیروں سے رشتے داریاں قائم کرنا کوئی بڑی بات نہیں ہے جو قرب و جوار میں رہتے ہیں پہلے ان کو دیکھیے ان کو سمجھئے ان پر خرچ کریں بلا جواز تناؤ آپ کو کسی بھی بیماری میں مبتلا کر سکتا ہے اس سے بچنے کا ایک ہی طریقہ ہے آپ اللہ کے نام پر سب سے اپنے تعلقات استوار کریں۔ پھر دیکھئے آپ کتنی صحت مند رہتی ہیں۔ صحت کا راز یہی یہی ہے۔

خوب صورت رت موسم میں آپ عید قربان کو انجوائے کریں۔ جن کے گھر قربان نہیں ہوئی یا جو ضرورت مند ہیں ان کو زیادہ سے زیادہ گوشت کا حقدار بنائیے۔ خوشگوار موڈ میں اس حسین موسم کو انجوائے کریں اور میری باتوں پر عمل کریں۔ آپ کے سندرے مجھے خوش فہمی میں مبتلا رکھتے ہیں کہ آپ سب مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں، ہم بھی آپ سے بہت محبت کرتے ہیں۔ کبھی کبھی تو دل چاہتا ہے کہ دل کی ساری باتیں آپ سے شیئر کروں اور یہی وجہ ہے کہ کبھی کبھی میں آپ لوگوں سے دل کی بات شیئر کر لیتی ہوں اس بار بہت اہم بات ہے جو میں نے آپ سے شیئر کی ہے۔ اس کو آپ دوسروں سے بھی شیئر کریں۔ اپنی ڈائری میں اسے ضرور لکھیں۔

نئے لکھنے والے رابطہ رکھیں، ہم کوشش کر رہے ہیں کہ انہیں کسی نئے پلیٹ فارم پر لے آئیں۔ بس میری ہمت اور آپ کی دعا ہمیں آگے تک لے جائے گی۔ اس یقین کے ساتھ کہ ہم نے اپنے قلم کے ساتھ دیانتداری کی ہے ورنہ میں اس مقام پر بھی نہ ہوتی۔

Downloaded from paksociety.com

آپی

### میڈیا چینلز متوجہ ہوں

ایک اہم بات میڈیا چینلز پر اکثر و بیشتر اپنے موضوع میں ڈیکوریٹی کی واردات دکھاتے وقت اب ایک نئی چیز پیش کر رہے ہیں کہ مال و دولت کے ساتھ بہن اور بیٹیوں کی عزت کو بھی پامال کرتے ہیں۔ معاشرے میں یہ گھناؤنا عمل مت پھیلائے قلم کو روکیے۔ خودکشی سے کہیں گندامل جو آپ اپنے قلم سے موضوع بنا رہے ہیں میں گزارش کرتی ہوں تمام چینل والوں سے بھی کہ آپ ایسے موضوعات کو سنسر کریں۔ ورنہ یہ نہ ہو کہ ڈیکوریٹی کی واردات میں عزت نفس کا بھی سودا ہونے لگے۔

رواڈ انجسٹ 6 ستمبر 2015ء

READING  
Section



# قربانی

صالحہ محمود

مبارک سے نحر فرمائے باقی اونٹوں کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سپرد فرمایا۔ (صحیح مسلم)

قربانی ایک اہم مالی عبادت ہے اور شعائر اسلام میں سے ہے اور سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سنت ہے۔ قربانی کی احادیث میں بہت فضیلت آئی ہے حضرت زید بن ارم فرماتے ہیں کہ صحابہ کرام نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ قربانی کیا ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمہارا فائدہ یہ ہے کہ تمہیں قربانی کے جانور کے ہر بال کے بدلے میں ایک نیکی ملے گی صحابہ کرام نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جن جانوروں کے بدن پر اون ہے تو اس اون کا کیا حکم ہے، اس پر بھی کچھ ملے گا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اون کے ہر بال کے عوض بھی ایک نیکی ہے (سنن ابن ماجہ) غور کیجئے۔ اس سے بڑھ کر اور کیا ثواب ہوگا کہ ایک قربانی کرنے سے ہزاروں لاکھوں نیکیاں مل جائیں، بھیڑ اور دنبے کے بدن پر لاکھوں بال ہوتے ہیں اگر کوئی صبح سے شام تک گننا چاہے تو بھی نہیں گن سکے گا۔ صحابہ کرام نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ قربانی کیا ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ تمہارے والد حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سنت ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس کے ہر بال کے عوض میں ایک نیکی ہے۔

اللہ سبحانہ و تعالیٰ کا فرمان ہے:

اللہ تعالیٰ کے لیے ہی نماز ادا کرو اور قربانی کرو۔ اور ایک دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے کچھ اس طرح فرمایا: آپ کہہ دیجیے یقیناً میری نماز اور میری ساری عبادت اور جینا میرا مرنا یہ سب خالص اللہ تعالیٰ ہی کا ہے جو سارے جہاں کا مالک ہے، اس کا کوئی شریک نہیں اور مجھ کو اسی کا حکم ہوا ہے اور میں سب ماننے والوں میں سے پہلا ہوں۔

تیسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے اس طرح فرمایا: اور ہر امت کے لیے ہم نے قربانی کے طریقے مقرر فرمائے تاکہ وہ ان چوپائے جانوروں پر اللہ تعالیٰ کا نام لیں جو اللہ تعالیٰ نے انہیں ولے رکھے ہیں، سمجھ لو کہ تم سب کا معبود والہ برحق صرف ایک ہی ہے تم اسی کے تابع فرمان ہو جاؤ اور عاجزی کرنے والوں کو خوشخبری سنا دیجیے۔

سورہ کوثر میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اپنے پروردگار کی نماز پڑھئے اور قربانی کیجئے۔ مذکورہ بالا آیات میں اللہ تعالیٰ نے قربانی کا حکم بڑے واضح انداز میں دیا۔ ہجرت کے بعد دس سال تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ طیبہ میں قیام فرمایا اور ہر سال قربانی فرماتے رہے۔ روایتوں میں آتا ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حج ادا فرمایا تو سوا اونٹوں کی قربانی کی جن میں سے ترسٹھ اونٹ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنے دست



حدیث پاک کا مفہوم ہے کہ قربانی بہت بڑا عمل ہے اور قربانی کے ایام میں اللہ تعالیٰ کو قربانی کرنے سے زیادہ کوئی عمل پسند نہیں ہے۔

قربانی کرتے وقت خون کا جو پہلا قطرہ زمین پر گرتا ہے تو گرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ کے پاس مقبول ہو جاتا ہے۔ قربانی واجب ہوتے ہوئے اور مالی وسعت ہوتے ہوئے قربانی کا نہ کرنا بہت بڑی بد نصیبی اور نیکی سے محرومی کا اور جان کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ناراضگی کا سبب ہے۔ قربانی کی فضیلت میں اور بہت سی روایات آئی ہیں، ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ قربانی کے جانور کے کھر، بال اور سینگ قیامت کے دن نامہ اعمال میں نیکیوں میں شامل ہوں گے۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ احادیث میں یہ بھی ہے کہ قربانی کا جانور قیامت کے دن سواری کے لئے لایا جائے گا، اور یہ پل صراط کی سواری ہوگی۔

دیگر عبادت کا عمل کرنے کے بعد ثواب ملتا ہے اور قربانی کا ثواب ابھی عمل بھی پورا نہیں ہوتا، بلکہ ادھر عمل شروع ہوا کہ ادھر ثواب لکھ دیا جاتا ہے اور ہر بال کے بدلے نیکی حتیٰ کہ دینے یا بھیڑ کے جسم پر جتنی بالوں کی شکل میں اون ہوتی ہے، ہر بال کے حساب سے ثواب ملتا ہے۔

جس طرح قربانی دینے والے کو زیادہ ثواب ملتا ہے اس طرح اگر کوئی صاحب نصاب ہو اور وہ قربانی نہ کرے تو اس کا گناہ ہوتا ہے کیونکہ قربانی واجب ہے اور ترک واجب گناہ کبیرہ ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے شخص کو سخت وعید سنائی ہے۔

حدیث شریف میں ہے: حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے

ارشاد فرمایا: جس کے پاس قربانی کرنے کی گنجائش ہو اور وہ قربانی نہ کرے تو وہ ہماری عید گاہ کے قریب نہ آئے۔ حدیث شریف میں قربانی نہ کرنے والوں کیلئے یہ بہت بڑی وعید ہے کیونکہ عید گاہ کو عید کی نماز پڑھنے کیلئے مسلمان جاتے ہیں اور جو مسلمان نہیں وہ عید گاہ سے دور رہتے ہیں، یہ بہت سخت وعید ہے کہ مسلمان ہو اور گنجائش بھی ہو اور قربانی نہ دے، یہ نہایت بد بختی ہے جس طرح عید کی نماز ہر مسلمان مرد عاقل و بالغ پر واجب ہے اسی طرح ہر صاحب نصاب مسلمان مرد و عورت پر قربانی واجب ہے۔

صحیح بخاری اور مسلم کی روایت ہے کہ انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دو سیاہ و سفید مینڈھوں کی قربانی دی انہیں اپنے ہاتھ سے ذبح کیا اور (ذبح کرتے ہوئے) بسم اللہ اکبر کہا۔

عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما بیان کرتے ہیں کہ: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ شریف میں دس برس قیام کیا اور ہر برس قربانی کیا کرتے تھے۔

جس نے بھی نماز (عید) کے بعد (قربانی کا جانور) ذبح کیا تو اس کی قربانی ہوگئی، اور اس نے مسلمانوں کی سنت پر عمل کر لیا۔

(صحیح بخاری حدیث)

جو شخص قربانی کرنے کی استطاعت رکھتا ہو اس کے لیے قربانی کرنا سنت مؤکدہ ہے، لہذا انسان اپنی اور اپنے اہل و عیال کی جانب سے قربانی کرے۔

☆.....



# چہرے سانگے میں چہرے کو

اگر وہ امی کو احساس نہیں دلاتی تو وہ تو برے سے برا کرتی ہی چلی جاتیں، کیسے پیشم کی شادی پر بھی واویلا مچایا تھا۔ ان کی مرضی تھی جو ہم سے ہو اور جو ہم اس نے کبھی پیشم کو اس نظر سے دیکھا ہی نہیں تھا۔ عمر



READING  
Section



میں بھی تو خاصی چھوٹی تھی وہ بیشم کو فاران کی طرح ہی بھائی سمجھتی تھی۔

”بیشم بھائی! کتنے اچھے ہیں، سب کا خیال رکھتے ہیں۔“ اس نے اپنے آنسو صاف کیے دل تو اس کا ماں کی طرف سے ادا تھا کیوں کہ انہوں نے کتنا سے برا بھلا کہا تھا۔

”امی! میں آپ کو کچھ بھی برا نہیں کرنے دوں گی اور رے فاران بھائی ہمیں ان کی پسند بھی قبول کرنی ہوگی۔“ اس نے عزم کر لیا تھا۔ وہ سب کچھ ٹھیک کر کے رہے گی اس کے لیے اسے کچھ بھی کرنا پڑے۔

”جو ہم امی کے لیے دودھ گرم کر کے لے جاؤ، انہیں میں نے دوائی کھلا دی ہے۔“ میران امی کے روم سے باہر آ کے اسے ہدایت دینے لگا۔

”اچھا!“ اس نے سر ہلایا۔

”اور ہاں مزید کچھ بولنے کی ضرورت نہیں کیوں کہ وہ بہت رور ہی ہیں۔“

”میران میں نے کیا غلط کہا ہے؟“





”تم نے سب ٹھیک کہا مگر مزید انہیں کچھ کہنا ٹھیک نہیں ہے کہیں زیادہ طبیعت خراب نہ ہو جائے۔“  
میرا ان کا کافی دیر سے نزہت کے پاس ہی تھا کیوں کہ ارتضیٰ علی کو تو خود وقتی غصہ تھا جو مرتضیٰ علی نے کہہ کر  
انہیں کم کر دیا تھا مگر وہ نزہت سے ناراض تھے جو پیشم کو بہت برا بھلا کہہ رہی تھیں۔

☆.....☆

حسنی ضرورت سے زیادہ ہی سنجیدہ ہو گئی تھی۔ شہر یارا سے کاموں میں لگائے رکھتا تھا۔ ابھی بھی وہ سارا  
کمراسمیٹ کے نہانے جا رہی تھی۔ یاز یہ بھابی میسے رہنے گئی ہوئی تھیں۔ ابھی تک حسنی کا ہاتھ کھیر میں بھی  
نہیں پڑا تھا وہ اور ہی آرام سے ہو گئی تھی کام کی تو ویسے ہی چورھی۔

”سنو مجھے روٹی بنا کے دو بھوک لگ رہی ہے۔“

”بھابی سے کہہ دیں۔“ وہ اپنے ہاتھ پیروں کی کلیننگ کر رہی تھی۔

”بھابی سے کیوں کہہ دوں تمہاری ذمہ داری ہوں، ان کی نہیں۔“ اس نے اس کے سرخ و سپید سراپے  
کو بغور دیکھا جب سے اس نے ویٹ کم کیا تھا اور زیادہ خوب صورت اور دلکش ہو گئی تھی۔ شہر یارا سے ذرا  
بھی اس کی خوب صورتی کا احساس نہیں دلاتا تھا۔

”بھابی اپنی امی کے گئی ہوئی ہیں۔“

”مگر میری تو ابھی کھیر پکانی کی رسم بھی نہیں ہوئی۔“ وہ جھٹ بولی۔

”ضروری ہے یہ فضول رسم ہوگی تو ہی تم بچن کا کام کرو گی کوئی کھیر پکانی نہیں ہوگی۔ میں نے منع کر دیا ہے۔“

”واٹ! آپ کی امی تو کہہ رہی تھیں کہ وہ ضرور کریں گی۔“

”میں نے منع کر دیا ہے۔“

”آپ کی امی کو ویسے بھی بچانے کی پڑی رہتی ہے۔“ وہ تو بہت ہی بھنارہی تھی۔

”زیادہ بکو اس کی ضرورت نہیں ہے اور یاد رکھنا میں تمہاری بکو اس برداشت بھی نہیں کروں گا۔“ وہ تو

آنکھیں نکال کے اسے وارنگ دے رہا تھا۔

حسنی کا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ شہر یارا ذرا بھی تو اس کا خیال نہیں کر رہا تھا۔ نئی دہن کے تو شروع  
شروع میں شوہر ہر نازنخرے بھی اٹھاتے ہیں یہاں شوہر تو کیا سسرال والے بھی اس کے کوئی نازنخرے نہیں  
اٹھا رہے تھے۔

”جلدی سے نہا کے آؤ پھر مجھے روٹی بنا کے دو اور ہاں رات کا بھی کھانا بنا لینا کیوں کہ اماں گھر میں ہی

ہوں گی۔ میرے دوست کے گھر دعوت ہے اس نے بلایا ہے وہاں جانا ہوگا۔“ وہ اسے ساتھ ساتھ ہدایتیں

بھی دیئے جا رہا تھا اور وہ جل کے کلس ہی رہی تھی اسے کیا خبر تھی اسے یہ دن بھی دیکھنا پڑیں گے۔ کیسے اس

کی نوابوں والی زندگی تھی۔ رفعت تو اسے کسی کام کو ہاتھ لگانے نہیں دیتی تھیں مگر نسرین اس سے سارے کام

لیتی تھیں مگر اسے یہ سب اس وقت کرنا ناگوار نہیں گزرتا تھا مگر یہاں شہر یارا کے حکم پر ہر کام کرنا اس کی جان

ہی جلا رہا تھا۔

”دل میں خوب کوس رہی ہوگی۔ ہے ناں۔“ اس کا چائزہ لینے لگا۔ پنک لان کے پرنٹڈ کپڑوں میں

اس کی سرخ و سپید رنگت غصے کی وجہ سے اور سرخ ہی ہو رہی تھی۔

”کوئے کا بھی کوئی فائدہ نہیں۔“ وہ طنز کرنی ہوئی ڈرینگ ٹیبل پر اپنی گولڈ کی چوڑیاں اتار کے رکھنے لگی۔







”نانا جان یہ آپ کہہ رہے ہیں۔“

”میں تم سے پہلے بھی کہہ چکا ہوں اس لڑکی کی بھی حق تلفی نہیں ہو اور خوشی بیٹی کی بھی۔“ نو جوان پارٹی کو مرتضیٰ علی نے آنکھ کے اشارے سے جانے کو کہا تھا۔

”پشیم میں چاہتا ہوں تم خوشی بیٹا سے بات کرو اور راضی خوشی اس لڑکی کو لاؤ۔“ خوشنما فوراً ہی جھٹکے سے اٹھ گئی سب کی حیرانگی سے استفہامیہ نگاہیں اٹھ گئی تھیں۔

”خوشی کو میری یہ بات بری لگی ہے میں چاہتا تو یہ بات میں اس کے سامنے نہیں کرتا مگر میں نے جان کے یہ بات کی تا کہ اسے اندازہ ہو جائے کہ میں اس کا بھی خیال رکھتا ہوں۔“ مرتضیٰ علی سمجھ رہے تھے خوشنما کا وہ خیال کر رہے ہیں جب کہ ایسا کچھ نہیں تھا خوشنما کو ان کی یہ بات بری لگی تھی۔

”نانا جان! آپ کو چاہئے کہ یہ خیال کیوں آیا۔“

”میں نے فیصلہ کیا ہے تم اور فاران سیدھے طریقے سے اپنی زندگی گزارو۔ فاران نے بھی اپنی ماں کو دھوکا دیا ہے مگر اب کچھ نہیں ہو سکتا اس کا یہی حل ہے کہ فاران اس لڑکی کو لے آئے اور وہ لڑکی نرہت کا دل جیتنے کی کوشش کرے۔“ وہ بڑے نرم اور مدبرانہ انداز میں ان دونوں کو ہی سمجھا رہے تھے۔ اشرف علی اور مرتضیٰ علی اور شاہدہ خاموش بیٹھے ان کی بات سن رہے تھے۔

پشیم کا سارا دھیان خوشنما کی طرف تھا کیوں کہ اسے اب موقع ملا تھا خوشنما کو ذہنی ٹارچہ کرنے کا۔

”شاہدہ بیٹا! آپ دہنوں کی تیاریاں شروع کریں یہ فرض تو ادا کرنا ہی ہے۔“ مرتضیٰ علی خاصے تھکے لہجے میں کہہ رہے تھے۔

”چلو مرتضیٰ میں نرہت سے بھی بات کر لوں ایسے کب تک وہ ناراض رہیں گی۔“ وہ گھٹنوں پر ہاتھ رکھے کھڑے ہو گئے۔

فاران نے بڑی فکر مندی سے پہلو بدلاتھا کیوں کہ نرہت اس سے بالکل بھی بات نہیں کر رہی تھیں۔ کتنی ہی وہ معافیاں مانگ چکا تھا۔

”چلو دلہا میاں تیار ہو جاؤ اپنی دلہن لانے کو۔“ پشیم نے شوخی سے کہہ کے اس کی پشت معنی خیزی سے تھپکی تھی۔

”تمہیں بھی تو کہا ہے۔“

”مجھ سے ایک سنہالی نہیں جا رہی ہے۔ دوسری کہاں انورڈ کر سکتا ہوں۔“ اس نے خود ہی اپنا تمسخر اڑایا۔

”پھر پشیم تم اس لڑکی کا کیا کرو گے جسے تم گھر لائے تھے نکاح کر کے۔“

”مامی میں اس لڑکی کو کچھ دے دلا کے چپ کرادوں گا۔“ اسے اب اندازہ ہو رہا تھا ایک جھوٹ

چھپانے کے لیے کتنے جھوٹ بولنے پڑ رہے تھے۔

”لگتا ہے خوشنما بھابی کو دادا جان کی یہ بات پسند نہیں آئی ہے۔“ فاران نے خوشنما کے تیور نوٹ کیے تھے۔

”اگر نانا جان نے مجھ سے زیادہ ہی فورس کیا تو مجھے پھر کچھ تو کرنا پڑے گا۔“

”اپنی اس بیگم کا کیا کرو گے وہ تو بالکل برداشت نہیں کریں گی۔“

”ارے پشیم کے لیے کوئی مشکل تھوڑی ہے دوسرا فلیٹ خرید کے اس میں رکھ لے گا کیوں پشیم۔“

”مسلے کا حل پیش کیا ہو۔“



”مائی وہ میں نے نکاح مجبوری میں کیا تھا کہ نانا جان میری خوشنما سے جان چھڑادیں اور اب میں ایسا بالکل نہیں چاہتا۔“ وہ اس وقت بہت مشکل میں تھا کیسے سچ بتائے اگر نانا جان کو یہ پتا چلا کہ اس نے جھوٹ ہی کہا تھا وہ کتنا ناراض ہوں گے۔

”میں ذرا چلتا ہوں امی کے روم میں۔“ فاران کو وہاں کی بھی فکر تھی اور بیٹھم کو اس وقت صرف یہ فکر بھی کہ وہ کیا کرے کہ یہ جھوٹ ختم ہو اور خوشنما بھی غصے میں ہوگی۔

☆.....☆

”یہ کارنامہ انجام دے کر بہت اچھا کیا ہے۔ یہ نظر نہیں آیا بہن کی خوشیاں ضمیر ان کسی اور کی جھولی میں ڈال چکا ہے۔“ راشدہ، نوین پر بہت ناراض ہو رہی تھیں۔

”ہم زبردستی کسی کو بھی مجبور نہیں کر سکتے کہ وہ ہم سے شادی کرے۔ ضمیر ان بھائی نے کبھی نوشین باجی کو پسند ہی نہیں کیا یہ آپ ہی تھیں جو آئے دن جا کے وہاں رک جاتی تھیں اور اپنی عزت اور اہمیت کم کرتی تھیں۔“ نوین کو کب اچھا لگتا کانوں سے بھی سنتی تھی کتنا دکھ ہوتا تھا صرف اپنی ماں اور بہن کی وجہ سے۔

”عتیق بھائی کو کیا کہا جو وہ سیدھے یہاں سے چلے گئے۔“  
”ماموں کو احساس دلانا تھا جو میں نے دلا دیا۔ ان کی سمجھ میں آ گیا جو وہ چلے بھی گئے۔“

”نوین کیسی اولاد ہے تجھے ذرا اپنی ماں اور بہن کا خیال نہیں۔“  
”آپ سب کا ہی خیال تھا جو میں نے ایسے کہا۔“ وہ بڑی سنجیدہ تھی اپنی ماں اور بہن کی عقلوں پر ماتم کرنے کو دل چاہتا تھا۔

”تم کیا سمجھ رہی ہو میں ضمیر ان کو ایسے ہی پھوڑ دوں گی۔“  
”نوشین باجی! آپ کو اللہ کا واسطہ کیوں اپنی عزت کر رہی ہیں کیوں ان کی ہنستی بستی زندگی میں ٹانگ اڑا رہی ہیں۔“

”بکو اس بند کرو۔“ اس نے نوین کو ڈانٹ دیا۔  
”مجھے تو رضوانہ بھابی پر شک ہو رہا ہے ضرور اسے کچھ گھول کے پلا دیا ہے جو یہ ان کی کہے جا رہی ہے۔“

”امی اگر مائی کو پلانا ہوتا تو ماموں کو آپ کو اور نانی جان کو پلاتیں تاکہ آپ سب ان کے گن گاتے۔  
نہ ماموں گھر سے بھاگتے اپنی ذمے داریوں سے منہ چھپا کے۔“

”امی دیکھیں کیسی اس کی زبان چلے جا رہی ہے۔“ نوشین کے تو اور ہی پٹنگے لگ رہے تھے وہ حیران بھی تھی جو نوین بالکل چپ رہتی تھی۔ آج کیسے اس کی زبان چل رہی تھی۔

”نوین! بالکل ٹھیک کہہ رہی ہے۔“ کرن نے بھی آ کے تائید کی۔  
”ہاں تمہاری کمی تھی آ جاؤ اس کے ساتھ بیٹھ جاؤ اور ماں کے خلاف محاذ کھول لو۔“

”آپ غلط بات کر رہی ہیں۔ میں صرف حقیقت بیان کر رہی ہوں اور سچ بول رہی ہوں۔“ وہ ترکی بہ ترکی بول رہی تھی۔

”دونوں کیسی گھنی میسنی ہیں مائی کے گھر والوں سے ملی ہوئی ہیں۔“ نوشین کے تو پٹنگے لگ رہے تھے۔



”آپی یہ آپ کی سوچ ہے ہم کوئی مامی کے گھر والوں سے نہیں ملے ہوئے ہیں آپ اپنی فکر کریں ضمیر ان بھائی کے سسرال والوں میں بھی آپ کی خاصی شہرت ہو گئی ہے۔ مہندی کے دن کا ہنگامہ یاد ہے۔“  
 ”میرے حق پر وہ لڑکی ڈاکہ ڈالنے آگئی میرے آگ نہیں لگے گی تو کیا کروں۔“  
 ”آپی آپ بالکل ان پڑ لوگوں کی طرح ری ایکٹ کرنے لگی ہیں۔ پڑھی لکھی باشعور ہیں کچھ تو عقل سے سوچیں۔“

”زیادہ بک بک کرنے کی ضرورت نہیں جاؤ تم اپنا کام کرو۔“ اس نے کرن کو ڈانٹ دیا۔ نوین اور کرن ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں۔ ان دونوں کو اپنی ماں اور بہن کی سوچوں پر دکھ ہو رہا تھا جو پتا نہیں کیوں نہیں سوچ رہی تھیں۔

”آپ کو اس طرح کرنے سے کچھ حاصل وصول نہیں ہوگا۔“  
 ”میں حساب کو بھی ضمیر ان کے ساتھ رہنے نہیں دوں گی۔ دونوں کو الگ کر دیا کروں گی۔“ اس نے نوین کو بتایا نوشین کی آنکھوں میں تو جیسے خون اتر رہا تھا۔  
 ”نوین پھوڑوان کو ان کے حالوں پر جیسے ابو نے چھوڑ دیا ہے۔“ کرن نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔  
 ”دونوں لڑکیوں کو دیکھو کیسے میرے منہ کو آ رہی ہیں۔“

”امی ایسی کوئی بات نہیں ہے آپ ہماری ماں ہیں اور آپ ہی ہماری بہن ہیں۔ میں نہیں چاہتی کوئی آپ دونوں کو برا کہے پلیز آپ دونوں اپنی سوچوں کو وسیع کریں غلط سوچنا بند کریں دوسروں کی خوشی میں خوش رہنا سیکھیں۔“ نوین نے برانہ انداز میں سمجھا رہی تھی۔  
 نوشین تو ہنکارے ہی چلی گئی اور راشدہ اسے گھورنے لگیں۔  
 ”دونوں اپنے باپ پر کئی ہیں جیسے وہ کسی کی نہیں سنتا ایسی تم ہو۔“ انہوں نے نوین کو براہم ہوئے کہا۔  
 نوین اپنا سرتاسف سے ہاتھوں میں تھام کے ہی رہ گئی کیوں کہ اس وقت راشدہ اور نوشین جیسے کچھ سوچنا سمجھنا نہیں چاہتی تھیں غصے اور رقابت کی آگ میں دونوں جل رہی تھیں۔

☆.....☆

”یار! میں نے تجھ سے ایک کام کہا تھا۔“ اشعر اسے اپنی گزشتہ دنوں کہی گئی بات یاد دلانے لگا۔  
 ”تمہیں اپنی پڑی ہے وہاں گھر میں الگ ہنگامہ پڑا ہے۔ ایسے میں مجھے خوشنما سے بات کرنے کا بھی موقع نہیں ملا۔“ یشم خاصا پریشان اپنی ریو الونگ چیئر پر ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔  
 ”خیریت تو ہے۔“ اشعر نے بھی فکر مندی سے پوچھا۔  
 ”یار! وہی میرا جھوٹ میرے لیے مسئلہ بن رہا ہے۔“  
 ”جھوٹ۔“ وہ سمجھا نہیں۔

”وہی جو میں نے خوشنما کو گھیرنے کے لیے کیا تھا کہ میں نے نکاح کر لیا ہے۔“  
 ”تم نے ابھی تک کسی کو حقیقت نہیں بتائی کہ وہ خوشنما تھی۔“ اشعر گویا ہوا۔  
 ”نہیں نا میں نے کسی کو یہ تھوڑی ہی بتایا ہے خوشنما میرے آفس میں جا ب کرتی تھی اور میں بتانا بھی نہیں چاہتا۔“ یشم خاصی گہری سوچ میں مستغرق تھا۔



”ایسے میں بھابی کیا کہتی ہیں؟“

”ارے اس سے تو میری بات ہی نہیں ہو رہی ہے۔“ پیشم نے اپنے اور اس کے درمیان کی ناراضی بھی اسے بتادی۔

”تم بھی اتنی سی بات لے کے بیٹھ گئے ان کا غصہ بجا ہے تم نے کون سا ان کے ساتھ اچھا کیا تھا۔“ اس نے پیشم کو احساس دلایا۔

”یار! ہر بات کی حد ہوتی ہے ایک بندہ جھکا جا رہا ہے مگر اسے ذرا احساس نہیں۔“ وہ خاصا جھنجھلایا ہوا تھا۔

”یار! میرے مسئلے کا کیا ہوگا۔ امی مجھے فورس کر رہی ہیں۔ شادی کرو جب تک میں بھابی سے بات نہیں کر لوں گا کیسے بات آگے بڑھ سکتی ہے۔“

”تم ایسا کرو خوشنما کو کال کر لو۔“

”نانا میں خود سے!“ وہ گھبرایا۔

”تم تو ایسے گھبرار ہے ہو جسے لڑکی کو اپنے رشتے کی بات کرتے ہوئے جھجکتے رہیں۔“

”میری بھابی سے ایسی کوئی زیادہ بات چیت نہیں ہے تم خود ہی یہ کام سرانجام دے دو پلیز بعد میں میرے بچے بھی دعادیں گے۔“ وہ منت بھرے انداز میں گویا ہوا۔

”چل بکو اس نہیں کر پہلے شادی تو کر لے بچے بعد کی بات ہے۔“ پیشم کے چہرے پر بھی ایک سایہ سا آگے گزر گیا۔

”یار بچے بھی اللہ کی نعمت ہوتے ہیں کیسے زندگی میں رونق آجاتی ہے۔“

”اے ہیلو کیا بات ہے کوئی خوش خبری ہے کیا۔“ اشعر نے معنی خیزی سے مسکرا کے پوچھا۔

”نہیں..... نہیں..... تو۔“ وہ سیدھا ہوا گیا۔ ”خوشنما ایسے حالات ہی نہیں پیدا کر رہی کہ ایسی کوئی بات ہو۔“

”وہ تو میں تمہاری بات پر کہہ رہا تھا۔“ اس نے انٹرکام پر جوس کا آرڈر دیا۔

”میں آج خوشنما سے بات کروں گا۔“

”بچے کے متعلق۔“ اشعر نے جھٹ سے کہا۔

”یار! کیا بکو اس ہے۔“ وہ جھینپ گیا۔

”تمہارے رشتے کی تمہارا کیا ارادہ ہے ویسے یار جو ہم بھی بری نہیں ہے۔“

”دیکھو پیشم! میں نے تمہاری کزن کو صرف تمہاری شادی پر دیکھا تھا اور میں ایسا کچھ اس کے متعلق

جاننا بھی نہیں ہوں۔“

”اچھی لڑکی ہے تمہیں خوش رکھے گی۔“

”تمہاری بات ٹھیک ہے مگر مجھے کچھ میچور لڑکی چاہیے رمناس کے مقابلے میں سمجھدار ہے کیوں کہ

میں نے اس کی سمجھداری دیکھی ہے۔“

”سوچ لو تمہاری بھابی کی طرح نہ نکلے یہ بھی تمہیں بھی تڑا کے لے جائے۔“ پیشم نے مسکرا کے

آگئی دی۔

”جب خوشنما بھابی تمہیں تڑا کے نہیں گئیں۔ وہ بھی انہی کی بہن ہے ایسا بالکل نہیں کرے گی۔“ اشعر کو



جیسے اس پر بہت یقین تھا۔  
”خوشنما کی تو بات ہی نہیں کرو۔“ وہ اس دن کے بعد سے خوشنما سے بہت مایوس ہو گیا تھا۔  
”میں بھابی کی بات ضرور کروں گا کیوں کہ تمہاری لائف انہوں نے اچھی بنا دی ہے تمہارا بزنس اور تمہیں بھی۔“

”ہوں۔“ بیٹشم نے جیسے اس کی بات سے اتفاق بھی کیا۔  
اتنے میں جوس بھی آ گیا تھا۔ دونوں ہی سنبھل گئے۔  
”یار! اب میں چلوں گا کیونکہ میں تو آج جلدی آفس سے اٹھ کے آ گیا تھا امی کا چیک اپ کروانا ہے۔“ اس نے جلدی جلدی جوس کا گلاس ختم کیا۔  
”سن جلدی بات کر لینا۔“

”ہاں ہاں کر لوں گا بہت بے قراری ہے۔“ وہ معنی خیزی سے کہہ کر ہنسا تھا۔  
اشعر پھر اس سے ہاتھ ملا کے رخصت ہو گیا تھا۔

☆.....☆  
”کسی دن شہر یار کو اس کی مسز کو کھانا پر بلا لیتے ہیں۔“ ضمیر ان نے اسے مخاطب کیا جو سارے کام سے فارغ ہو کے کمرے میں آ گئی تھی۔

”شہر یار ماموں منع کر رہے تھے۔“ اپنے دراز بالوں میں برش پھیرنے کے لیے اٹھا رہی تھی۔  
”بٹ وائے۔“ وہ تکیوں کے سہارے نیم دراز ہو گیا۔

”کہہ رہے تھے کھانے پر بلانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم خود کسی دن آ جائیں گے۔“  
”شہر یار! بھئی عجیب ہے بھانجی کا گھر سمجھ کے گریز کر رہا ہے۔“  
”ہوں شاید۔“ اس نے صرف سر ہلایا۔

”پھر میں خود ہی بات کر لوں گا۔“ اسی دوران دروازے پر ٹاک ہو گئی۔  
”ارے بھئی کون ہے آ جاؤ۔“ ضمیر ان نے چونک کے کہا۔  
”واقعی آ جاؤں۔“ منزل کی شوخ آواز ابھری  
”ہاں یار۔“ وہ ہنسا۔

”آپ دونوں کے لیے ایک اطلاع ہے دادی جان آئی ہیں۔ آپ دونوں کو پوچھ رہی تھیں امی نے کہا کہ میں آپ کو بلا کے لے آؤں۔“ حباب تو گھبرانے لگی ان کی آمد کسی طوفان سے تو کم نہیں تھی۔  
”ابو کے آنے کی خبر ہو گئی ہوگی راشدہ پھپھو سے کہاں برداشت ہو رہا ہوگا سوچا آگ لگا کے تماشا دیکھ لوں۔“

”منزل کوئی فضول بات نہیں۔“ ضمیر ان نے ٹوکا۔  
”بھائی جان مزے کی بات بتاؤں اب تو دادی جان کو قصور وار ٹھہرا رہے ہیں۔“  
”تم کیا ان باتوں میں پڑے ہو جاؤ اور ہاں بڑوں کی باتوں میں بیٹھنے کی ضرورت نہیں ہے۔“  
”اوکے..... اوکے۔“ اس نے گم صم حباب کو دیکھا۔ جوب پلپتی گہری سوچ میں مستغرق تھی۔  
”بھابی کو لگتا ہے، دادی جان کا آنا فکر مند کر رہا ہے۔“



”تم فضول بکواس میں لگ جاؤ لسی کوئی بات ہے جاؤ تم۔“ منزل مسکراتا ہوا چلا گیا۔ ضمیر ان کی نگاہیں اس پر چلی گئیں۔

”حباب تم گھبراؤ نہیں میں تمہارے ساتھ ہوں۔“  
”مگر وہ تو پھر پوچھنے لگیں گی میں کیا جواب دوں گی۔“ وہ حیران پریشان سی سکتے کے عالم تھی۔  
”کیا تو پوچھیں گی.....“ وہ جیسے سمجھا نہیں۔

”یہی کہ کچھ نہیں۔“ اسے احساس ہوا تو وہ جھینپ کے رہ گئی وہ کیا بولنے والی تھی۔  
”ابھی تم جو کچھ سوچ رہی ہو بعد میں سوچ لینا۔“ ضمیر ان نے جلدی جیسے چپل پاؤں میں ڈالی۔ اس نے بھی بالوں کو سمیٹ کر کچر لگا کے کھلے چھوڑ دیے۔ ضمیر ان کی ہمراہی میں جھکتے ہوئے باہر آ گئی۔ ابھی وہ لوگ عشق احمد کے کمرے کی طرف بڑھے ہی تھے کہ عشق کی آواز پرر کے۔  
”آپ نے بھی مجھ سے پار ہی نہیں کیا میرے بچوں اور بیوی کو دردر بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیا میری تو غلطی تھی ہی بس ہی آپ نے مجھے اچھی صلاح نہیں دی۔ مجھے گمراہ ہی کرتی رہیں اور راشدہ اس نے بھی کبھی کوئی اچھی بات نہیں کی۔ مجھے اپنے گھر میں رکھا اور خود میری بیوی اور بچوں سے ملتی رہی اور آ کے برائیاں ہی کرتی رہی۔ آپ نے بھی اسے نہیں سمجھایا۔“ عشق احمد کی روہاسی آواز نکل رہی تھی۔  
”مجھے خود عقل نہیں تھی۔“ دادی جان بولیں۔ ضمیر ان نے جب دیکھا بات بہت زیادہ تلخی میں جا رہی ہے تو وہ اندر آ گیا۔

”امی! یہ میرے بچے ہیں ان کی رضوانہ نے بہت اچھی تربیت کی ہے اتنے سال گزرنے کے بعد بھی ان بچوں نے مجھے گلے سے لگایا اگر نوین میری آنکھیں نہیں کھولتی تو میں شاید ایسے ہی زندگی گزارتا رہتا۔“ وہ نوین بھی بہت گھنی ہے۔ ماں کا دماغ خراب کر رکھا ہے اس نے۔“ دادی جان کونوین کی بھی خبریں مل گئی تھیں۔

”کیوں آپ کو خوشی نہیں ہوئی میں اپنے بچوں سے مل گیا۔“ وہ انہیں حیرانگی سے دیکھ رہے تھے جو ذرا بھی خوش نہیں لگ رہی تھیں۔

”عشق احمد دیکھنا یہ بچے تجھے ایک دن لات مار کے نکال دیں گے وہ آدم اس کی تو زبان ہی بہت چلتی ہے وہ تو تجھے بالکل برداشت نہیں کرے گا۔“

رضوانہ چپ بیٹھی تھیں۔ ان ماں بیٹے کی باتوں میں مداخلت نہیں کر رہی تھیں مگر انہیں اس رات کا بہت دکھ ہو رہا تھا کہ کسی ماں تھیں بیٹے کو پھر غلط بات کر کے چڑھا رہی تھیں۔  
حباب تو ان کی بزرگی کا خیال کر کے خاموش تھی۔ ورنہ وہ بھی بول سکتی تھی۔

”کوئی بات نہیں میرے چاروں بیٹوں میں سے کوئی تو ایک ہوگا جو اپنے باپ کو رکھ لے گا۔“  
”ارے ابو آپ بالکل بھی ایسا نہیں سوچیں ہم آپ کے بیٹے ہیں ہم ایسا بالکل نہیں کریں گے دادی جان سے آدم ذرا بچ ہو جاتا ہے تو یہ ایسا بول رہی ہیں ورنہ آدم ایسا نہیں ہے۔“ ضمیر ان نے حمایت میں وضاحت دی۔

”بیٹا مجھے اندازہ ہے مگر میری ماں کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہے۔ صحیح اور غلط کا اندازہ نہیں

ہو رہا۔“



”چل چل مجھے سب اندازہ ہے۔“ وہ ہاتھ اٹھا کے بولیں۔  
”اے لڑکی تمہیں سلام دعا سب بھول گیا۔“ ان کا نزلہ جناب پر گرا وہ تو ویسے ہی پہلے سے گھبرائی ہوئی تھی۔ جھٹ سلام کیا۔

”رضوانہ چائے تو بنا کے بھیج دینا میں باہر بیٹھا ہوں۔“ عتیق احمد بہت تھکے تھکے ہو گئے تھے۔ انہیں اپنی ماں کا رویہ اور سوچ پر بہت دکھ اور افسوس ہو رہا تھا۔  
”ہاں ماں کی شکل بری لگ رہی ہے۔“

”امی ایسی کوئی بات نہیں ہے میرے سر میں درد ہو رہا ہے نیند بھی آرہی ہے۔“ انہوں نے عذر پیش کیا۔  
”ابو آپ اپنے کمرے میں ہی آرام کریں ہم صبح ملتے ہیں۔“ ضمیر ان نے ہی ماحول کی کچی کو دور کرنا چاہا۔  
”آدم آجائے میں پھر سوؤں گا۔“ وہ جب سے یہاں آئے تھے ان کے اندر بچوں کی محبت اور زیادہ ہی بڑھ گئی تھی۔

دادی جان عتیق احمد کے بیڈ پر ہی دراز ہو گئیں۔  
”بیٹا تم جاؤ آرام کرو۔“ انہوں نے جناب کے سر پر ہاتھ رکھا۔  
ضمیر ان اور وہ دونوں چلے گئے۔ عتیق احمد کو یہی دکھ اور افسوس تھا۔ ان کی ماں کو کوئی پشیمانی اور دکھ نہیں تھا وہ کتنے سالوں سے اپنے بیوی اور بچوں سے دور تھے۔  
”رضوانہ تم بے فکر ہو جانا اب مجھے کوئی بھی گمراہ نہیں کر سکتا۔“ انہوں نے کچن میں چائے بناتی رضوانہ سے کہا کیوں کہ ان کے چہرے پر فکر مندی کے آثار تھے۔

☆.....☆

وہ سب رات میں کھانے وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد اپنے اپنے کمروں کا رخ کر رہے تھے۔ جب کہ ہیشم گہری سوچ میں ڈوبا ہال کمرے میں بیٹھا تھا۔ اشعر نے بھی ایک ذمہ داری اسے سونپی تھی اس کی سمجھ نہیں آ رہا تھا خوشنما سے بات کرے یا نہیں کیوں کہ اس دن کے بعد سے وہ اس سے ہنوز اسی طرح ناراضی رکھے ہوئے تھا اس نے ذرا زور دار انداز میں اپنے کمرے کا دروازہ بند کیا تھا۔ وہ تو اچھل ہی گئی بیڈ شیٹ ٹھیک کر رہی تھی۔ دونوں کی نگاہوں کا تصادم ہوا۔ ڈارک مہرون پر بیڈ کپڑوں میں اس کی سرخ و سپید رنگت اور زیادہ چمک رہی تھی یا پھر وہ دن بہ دن نکھرتی جا رہی تھی۔ اس کا ایک ایک نقش اتنا حسین تھا وہ اکثر رات کے اندھیرے میں نائٹ بلب کی ملگجی روشنی میں اس کا چہرہ دیکھتا رہتا تھا۔ کیوں کہ دن کے اجالے میں تو وہ اس کی جانب دیکھنے سے گریز کرتا تھا۔

خوشنما نے اپنے چہرے کا رخ نیچے کیا اور بیڈ شیٹ کی شکنیں ہاتھوں سے نکالنے لگی تھی۔  
”کیسے بات کروں اور اب میں اس سے بات کروں، کبھی نہیں میری ہر وقت تو ہیں اور تضحیک کیے جاتی ہے میں پھر کبھی نرم پڑ جاتا ہوں مگر اب نہیں جھکوں گا۔“ ڈرینگ ٹیبل پر اپنا سیل رکھا اور چینیج کرنے کے لیے واٹس روم کھس گیا۔

”لگتا ہے زیادہ ہی برا لگ گیا ہے جو اتنے دن گزرنے کے بعد بھی بات نہیں کر رہے ہیں۔“ خوشنما کو اس کی یہ خاموشی کسی حیرانگی سے کم نہیں لگ رہی تھی وہ بات نہیں کر رہا تھا تو یہ بھی اسے مخاطب نہیں کر رہی تھی۔



یہی تو وہ چاہتی تھی اس شخص کو پل پل کی مار مارے اور اسے احساس ہو بے عزتی کیا چیز ہوتی ہے۔ سوچے جا رہی تھی اور اپنا کام بھی کیے جا رہی تھی۔ بال ایک دم ہی آبخار کی طرح بکھر کے پشت پر لہرانے لگے۔ ہشتم اسی وقت واش روم سے ایزی سے میض شلوار میں ملبوس باہر آیا تھا اس نے جلدی سے بالوں کو سمیٹا تھا وہ بیڈ پر تکیہ درست کر کے لیٹ گیا۔  
خوشنما جھک کے پیچھے ہٹ گئی تھی۔

”موصوف کو کچھ زیادہ ہی برا لگ گیا ہے۔“ وہ ایسے چوری چھپے دیکھنے لگی اس وقت ہشتم نے اس کی چوری پکڑی وہ گڑبڑا کے ڈریسنگ ٹیبل کی طرف بڑھ گئی تھی۔

وہ اٹھا اور بیڈ کی سائیڈ کی لائٹ آف کر دی۔ آدھے حصے میں بیڈ روم سیٹ تھا اور آدھے میں ڈریسنگ ٹیبل اور دیگر فرنیچر سیٹ تھا۔ ہشتم ذرا اسٹائلش بندہ تھا۔ اس نے اپنا بیڈ روم بھی اسٹائلش ہی سیٹ کیا تھا۔  
”پلیز یہ کھڑ پٹر بعد میں کر لینا میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔“ اس نے ناگواری سے کہہ کر اپنا رخ دوسری طرف کر لیا۔

”اگر زیادہ ہی میں آپ کو بری لگ رہی ہوں تو مجھے روانہ کیوں نہیں کر دیتے۔“ وہ تیز لہجے میں دھاڑی۔

”پلیز آہستہ بولو اور مجھ پر دھاڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں پہلے ہی پریشان ہوں۔“ وہ نانا جان کے فیصلے کی وجہ سے بہت الجھا ہوا تھا۔

”جو دوسروں کو پریشان کرتے ہیں بعد میں خود ہی اپنی پریشانیوں میں الجھ جاتے ہیں۔“ خوشنما نے گہرا طنز کیا۔

”پلیز! اگر درد کم نہیں کر سکتی ہو۔ پریشانی دور نہیں کر سکتی ہو تو سرچیں لگانے کا کام بھی نہیں کرو۔“ وہ تو بری طرح بھنایا مگر خود کو کنٹرول میں رکھا ہوا تھا۔ وہ ایسا کوئی ری ایکٹ نہیں کرنا چاہتا تھا جو بعد میں پھر خوشنما کو اس کی کمزوری ہاتھ لگ جائے۔

”درد اور پریشانی آپ کو کیا پتا کیا ہوتی ہے۔“ وہ ترش روی سے جلتا ہوا تیرا اس پر اچھا لنے لگی۔  
”تم کیا چاہتی ہو میں سولی پر تنگ جاؤں کیوں کہ تمہارا بدلہ ہی پورا نہیں ہو رہا۔ ایک شخص معافیاں مانگ رہا ہے مگر تم ایسی بے حس بن گئی ہو کہ ذرا احساس نہیں۔“ وہ لیٹے سے اٹھ بیٹھا۔  
خوشنما نے دیکھا اس کا چہرہ پریشانی اور غصے کی وجہ سے تمتمار ہا تھا۔

”ہاں میں بے حس ہوں اور مجھے احساس نہیں سارے احساس تو آپ رکھتے ہیں۔“ وہ اس کے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے بولی۔

”اگر بعد میں نتائج کا اندازہ نہیں ہوا کرے تو جذبات میں آکر غلط بات نہیں کیا کریں۔“ وہ طنزیہ اس کے سامنے کھڑی تھی۔

”ساری پریشانیوں آپ کی پیدا کردہ ہیں۔ ایک جھوٹ کو جھوٹ کسے ثابت کریں گے یہ آپ کا درد سر سے میرا نہیں۔“ وہ یہ کہہ کر کمرے سے ہی نکل گئی۔ وہ اتنی تو بے حس بالکل نہیں تھی ہشتم کتنا اسے منانے کی کوشش کر چکا تھا۔ اس کے لیے بڑی مایہ نگی سے لڑ لیا۔ اتنا تو وہ اس کے ساتھ برا نہیں تھا اسے بھی بعد میں یقین دلانا مشکل ہو جائے۔ ہشتم کو اپنی غلطی کا احساس تھا اور کیا چاہیے تھا۔



وہ ابھی تک پڑی ہوئی سو رہی تھی اور وہ اسے کئی آوازیں بھی دے چکا تھا۔

”حسنیٰ کم آن یار اٹھ جاؤ۔“ وہ بہت بے زار کھڑا تھا۔ بھوک سے برا حال تھا اور ناز یہ بھابی تو ابھی تک نہیں اٹھی تھیں۔ حسین بیگم بھی سو رہی تھیں اور وہ کچن میں کبھی اسنے لیے کچھ بنانے گیا نہیں تھا۔

”آپ کو کھانے کے علاوہ کوئی اور کام نہیں ہوتا۔“ وہ تو چلبلا ہی گئی۔

”سنو! زیادہ بکواس کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں تمہارا شو ہر ہوں کوئی ملازم نہیں ہوں۔“ اس نے حسنیٰ کی کلائی پکڑی اور اٹھا کے بٹھا دیا وہ تو تکلیف سے چیخ ہی پڑی۔

”کیا وحشت ہے۔“ وہ کلائی چھڑا کے سہلانے لگی۔

”تم بکواس کرتی رہو اور میں سنتا رہوں۔“

”میں ابھی نئی دلہن ہوں آپ کو اور آپ کے گھر والوں کو ذرا بھی خیال نہیں ہے چاہتے ہیں کہ کولہوکا

بیل بنی رہوں۔“ وہ تو غصے میں دانت پیسنے لگی۔

”تمہاری ماں نے بھی تو اپنی بیٹی کو کولہوکا بیل بنایا ہوا ہے اس کے لیے تو کبھی احساس نہیں کیا ایسا۔“

شہر یار دبنے والوں میں سے تو تھا ہی نہیں۔ وہ حسنیٰ سے رعب اور ڈھونس رکھے ہوئے کہ جیسے اگلے پچھلے سارے حساب اس سے لے رہا ہو۔

”آپ کو بڑا خیال ہے میری ماں کی بیٹی کا۔“ اس نے فہمائشی انداز میں طنز ہی کیا۔

”فضول بکنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جاؤ ناشتہ بناؤ مجھے بھوک لگ رہی ہے۔“ وہ اسے حکم دے کے

صوفے پر دھڑ سے لیٹا تھا۔

حسنیٰ دانت پیس رہی تھی اس گھر میں آ کے اسے لگتا تھا کسی کو بھی فکر نہیں نہ ہی عزت و قدر ہے۔

”الٹا سیدھا سوچتی رہو گی تو ایسے ہی برے منہ بناتی رہو گی۔“ وہ اس کے چہرے کے زاویے دیکھ رہا

تھا۔ وہ تلملا کے واش روم میں کھس گئی۔

”حسنیٰ بیگم جب تک تم اپنے مزاج میں تبدیلی نہیں لاؤ گی میں ایسے ہی تمہاری بے عزتی کرتا رہوں

گا۔ تمہارا دماغ ہمیشہ آسمان پر رہتا ہے۔“ شہر یار سوچے جا رہا تھا۔ حسنیٰ باہر نکل کے اسے گھورنے لگی۔

”تمہیں لگتا ہے یہ احساس نہیں کہ میں تمہارا شو ہر ہوں۔“

”شوہر ہیں تو کیا سر پر بیٹھا کے ناچوں۔“ وہ تو تنگ ہی گئی۔

”شٹ اپ تمہیں ذرا بڑے چھوٹے کی تمیز نہیں ہے۔“

”آپ کو جیسے بہت ہے۔“ بالوں کو تیزی سے برش چلا کے سیدھے کر رہی تھی۔

”خیر میں تو اپنی بات کر رہی نہیں رہا۔“ اس نے سیل پر کال چیک کی۔

اور وہ منہ ہی منہ میں بڑ پڑاتی ہوئی چلی گئی۔ اسے سب کا ہی ناشتہ بنانا پڑا تھا۔ حسنیٰ بیگم تو کب کسی کے

احسان ماننے والوں میں سے تھیں۔

”ہمارے ہاں تو بہوئیں گھر کے سارے کام کرتی ہی ہیں۔“ وہ پراٹھے کا لقمہ منہ میں رکھ کے گویا

ہوئیں۔

حسنیٰ غصے میں پہلو بدل کے رہ گئی۔



”ہاں بہوؤں کے دل تو ہوتے نہیں ہیں وہ محض نوکرائیاں ہوتی ہیں اپنے ماں باپ کے گھر فالٹو ہوتی ہیں جو سسرال بھیج کے ایک نوکرانی مہیا جو کر دیتے ہیں۔“ وہ دل ہی دل میں بہت بھنا رہی تھی غصے میں ناشتہ بھی نہیں کیا تھا۔ کسی نے بھی اسے ناشتہ کا کہا بھی نہیں تھا۔

شہریار اس کا غصہ سب سمجھ رہا تھا مگر وہ بھی کچھ نہیں بولا تھا۔

”مجھے کچھ دنوں کے لیے گھر جانا ہے۔“

”کیوں خیریت؟“ شہریار نے حیرانگی سے پوچھا۔

”میرا دل چاہ رہا ہے ماما یاد آرہی ہیں۔“

”کام سے بچنے کے طریقے تھے ہیں۔“ وہ حسنیٰ کو ہر طرح سے ہی سلگا کر رکھتا تھا۔

”ایسی کوئی بات نہیں ہے جب سے ہماری شادی ہوئی ہے میں ابھی تک رکنے نہیں گئی۔“ وہ خاصی برا

مان کے گویا ہوئی تھی۔

”ابھی تو تم نہیں جا سکتیں۔ کیونکہ میری چند دن کی چھٹیاں اور ہیں پھر تم بعد میں رکنے چلی جانا۔“ وہ

ٹی وی کی اسکرین پر ہنوز نگاہ جمائے بیٹھا تھا۔

حسنیٰ نے حیرت بھری نگاہ اس پر ڈالی جب سے شادی ہوئی تھی شہریار نے ایک دفعہ بھی اس سے پیار

بھرے لہجے میں بات نہیں کی تھی نہ ہی وہ اسے وہ کھانے کے لیے باہر لے کے گیا تھا اس کا بھی دل چاہتا

تھا شہریار بھی اس کے نازنخرے اٹھائے مگر وہ تو اس سے لٹھ مار ہی انداز میں بات کرتا تھا حسنیٰ جانتی تھی اس

کی ذمہ دار تھی شہریار اس سے بدلے ہی لے رہا تھا۔ وہ اس کے آگے جھکنے کو تیار نہیں تھی اور شہریار اس پر

توجہ دیتا نہیں تھا۔

”پتا نہیں ایسے کیسے کب تک چلے گا۔“ وہ سوچ رہی تھی۔

☆.....☆

”آخر کب تک وہ اس کے ساتھ ایسا کرے گی۔“ کتنا وہ اس کا خیال رکھتا تھا اور وہ جواب میں اسے

کیا دے رہی تھی۔ بے رخی مگر وہ بھی کیا کرے۔

”نہیں تم غلط ہو۔“ اندر سے کوئی بول رہا تھا۔

وہ جھنجھلائی ہوئی بیٹھی تھی۔ دل اس کا بہت ادا اس تھا ضمیر ان کی دادی کی باتیں اسے برداشت نہیں

ہوتی تھیں۔ وہ اور زیادہ ضمیر ان سے دور ہو رہی تھی نوشین کے نام کی غلط فہمی دل میں بال رکھتی تھی

حالانکہ رضوانہ نے اور ضمیر ان نے کلیئر بھی کر دیا تھا ایسی کوئی بات نہیں ہے مگر جانے کیوں حجاب کو ایسا لگتا

تھا اس نے نوشین کے حق پر ڈاکا ڈالا ہے جب کہ ضمیر ان کی ذرا بھی توجہ نوشین کی طرف نہیں تھی۔

”حجاب، شہریار کی کال ہے وہ تم سے بات کرنا چاہتا ہے۔“ ضمیر ان کی آواز پر وہ چونک گئی۔ ناشتے

کے بعد وہ برتن دھور ہی تھی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

شہریار سے بات کرنے لگی تھی۔

”جی کوشش کرتی ہوں آ جاؤں گی۔“ اس نے کہا تھا۔ شہریار اسے گھر بلا رہا تھا اس نے رات میں

کھانے پر سب کو بھی بلایا تھا اور ناہید کو بھی مگر ناہید کو نخرے کرنے سے فرصت نہیں تھی اس لیے انہوں نے



”ناہید باجی نہیں آرہیں۔“ شہریار بولا۔

”اچھا اچھا آ جاؤں گی میں۔“ اس نے کہا اور پھر سیل آف کیا۔

”شہریار ماموں مجھے بلا رہے ہیں۔“

”چلی جاؤ میں تمہیں ڈراپ کر دوں گا۔ میں آفس کے لیے تیار ہو رہا ہوں۔ جب تک تم ریڈی ہو جاؤ

گی۔“ اس نے کہا۔

”میں اتنی جلدی تو نہیں جاسکتی آپ آفس چلے جائیں۔ میں خود چلی جاؤں گی کیوں کہ ابھی کچن کا کام

بھی رہتا ہے۔“ وہ اپنی ذمے داریوں سے بھاگتی نہیں تھی۔

”ٹھیک ہے جیسا تم مناسب سمجھو میں امی کو کہہ دوں گا وہ تمہارے ساتھ چلی جائیں گی۔“ میں نے کہا۔

حباب نے پھر بقیہ کام سمیٹا دوپہر کا سالن بنا دیا تھا ضمیر ان کی دادی ابھی گھر میں موجود تھیں ان کے

اعتراضات بھی ہوتے رہتے اس لیے بہت سارے کام ختم کیے اور پھر وہ بارہ بجے تک چلی گئی تھی۔

”اور سناؤ تمہارے سر صاحب سے کیسی بنی تمہاری۔“

”وہ بہت اچھے ہیں بہت خیال بھی کرتے ہیں۔“ حباب نے عتیق احمد کی تعریف میں بتایا۔

”نوٹیشن کوئی گڑبڑ تو نہیں کرتی۔“ اس نے پھر پوچھا۔

شہریار اندر آ رہا تھا۔ حسنی کی بات پر باہر ہی رک گیا تجسس بھی ہوا کیوں کہ اسے اتنا اندازہ تھا اور وہ

جانتا تھا کہ حباب ابھی تک بھی اپنی سسرال میں ایڈجسٹ نہیں ہوئی ہے۔

”حسنی آنٹی مجھے ایسا لگتا ہے میں نے نوٹیشن کے ساتھ زیادتی کی ہے۔“

”بے وقوفی کی بات نہیں کرو، نوٹیشن میں جب ضمیر ان بھائی اور ان کے گھر والے انٹرسٹ ہی نہیں

رکتے تھے تو تم نے کہاں سے زیادتی کر دی۔“ وہ اس کی بے وقوفی پر گویا ہوئی۔

”ضمیر ان تمہارا شوہر ہے اس کے ساتھ ظلم نہیں کرو اگر تم اسی طرح انہیں اگنور کرتی رہو گی اور طنز کرو گی

ضمیر ان بھائی تم سے دور ہو جائیں گے اور نوٹیشن کو موقع مل جائے گا۔ تم ان کی بیوی ہو پورا پورا حق رکھتی ہو،

اتنا تم سے پیار کرتے ہیں اور تم ابھی تک ایسی ہی زندگی گزار رہی ہو۔“ شہریار کو حسنی کی ایسی مدبرانہ باتوں

کی توقع نہیں تھی وہ کتنی سمجھ داری سے حباب کو سمجھا رہی تھی۔

”شوہر کو اگنور کیے جانا سخت برا لگتا ہے، جب کہ تمہارا شوہر تو اتنا نرم مزاج ہے تمہاری کسی بات پر غصہ

نہیں کرتا۔ شکر ادا کرو۔“ حسنی کے لہجے میں حسرت بھی کیوں کہ شہریار تو سوائے اسے طنز کرنے کے اور

ڈانٹنے کے کچھ کرتا ہی نہیں تھا۔

”مجھے احساس ہے میں ضمیر ان کے ساتھ غلط کر رہی ہوں۔“ حباب نے یہ بات قبول بھی کی۔

”تمہارے دماغ میں جو بھی فضولیات ہیں انہیں دفع کرو اور ضمیر ان بھائی کے ساتھ ہنسی خوشی رہو۔“

حباب نے اسے بڑی گہری نگاہوں دیکھا جیسے حسنی کو جانچا ہو۔

”اور آپ نے شہریار ماموں کے ساتھ ایڈجسٹ کر لیا۔“ اس نے معنی خیزی سے پوچھا۔

”جب نکاح پر حوالا لیا تو ایڈجسٹ بھی کر لیا یہ الگ بات ہے تمہارے ماموں میرے ساتھ ایڈجسٹ

نہیں ہو رہے ہیں۔“ اس نے حسرت بھرے لہجے میں کہا۔



”آپ بھی تو انہیں شادی سے پہلے کیا کیا نہیں کہتی تھیں۔“  
 ”وہ سب میں شادی نہ کرنے کی وجہ سے کہتی تھی۔“ اس نے وضاحت دی۔  
 ”اب کیا کہتی ہیں۔“ مسکراتے اور شرارتی لہجے میں پوچھا۔  
 ”اب وہ ہی سب کچھ کہتے رہتے ہیں مجھے موقع ہی نہیں ملتا تمہارے ماموں غصہ بہت کرتے ہیں۔  
 کبھی جو اس انسان نے پیار بھری بات کی ہو۔“ وہ شکایت ہی کرنے لگی۔  
 شہریار نے اسی وقت اندر قدم رکھا۔ دونوں ہی سنبھل گئیں۔  
 ”کہیں انہوں نے میری بات تو نہیں سن لی۔“ حسنی گھبرا کے نگاہ چرانے لگی۔  
 ”کیا بات ہے کب سے باتوں میں لگی ہو کچھ کھانا وغیرہ بھی ملے گا یا نہیں۔“ اس نے حسنی کو مخاطب کیا۔  
 ”دیکھا ہر وقت کھانا پینا ہی مانگتے رہتے ہیں۔“ اس نے حباب کے کان میں سرگوشی کی۔ اس کی تو  
 ہنسی نکل گئی۔

”کیا کہا ہے میری بھانجی کے کان میں۔“ شہریار سمجھ گیا تھا اس کے متعلق ہی کچھ کہا ہوگا۔  
 ”شہریار ماموں! آپ حسنی آئی سے کبھی پیار و محبت سے بھی بات کر لیا کریں۔“  
 حسنی اسے آنکھیں دکھانے لگی۔ اسے شہریار کے سامنے ایسی بات پر حیا بھی آئی۔  
 ”اچھا تو میری شکایتیں لگانی ہیں تم نے۔“  
 ”جی نہیں میں کیوں لگاؤں گی شکایتیں۔“ وہ گڑبڑا کے رہ گئی۔

”حباب! میں کچن میں جا رہی ہوں تم وہیں آ جانا۔“ اس نے اپنی جان بچانے میں ہی عافیت جانی  
 اور تیزی سے باہر نکل گئی۔ شہریار کے لب مسکرانے لگے تھے۔ اسے حسنی آج بہت مختلف لگی تھی۔

☆.....☆

”نزہت تو جیسے ہر کسی سے بائیکاٹ کیے ہوئے تھیں۔ وہ ابھی تک بھی فاران کی دہن کو دیکھنے نہیں گئی  
 تھیں۔ مرتضیٰ علی نے شاہدہ اور خوشنما کو بھیج دیا۔  
 فاران نے بھی زبردستی ہی نکاح کیا تھا کیوں کہ اسے معلوم تھا اس کی ماں کبھی بھی نہیں چاہے گی  
 مریم فاران کی کلاس فیلو تھی۔ وہ شروع سے اسے پسند کرنا آ رہا تھا۔ اس لیے پڑھائی ختم ہونے کے بعد  
 بھی اس نے مریم سے رابطہ نہیں توڑا تھا۔ مریم متوسط گھرانے کی لڑکی تھی۔ وہ اکلوتی تھی اس کے ماں  
 باپ کچھ عرصہ پہلے ہی چل بے تھے۔ وہ اپنی خالہ کے گھر رہتی تھی۔ فاران نے خالہ کو مجبور کیا کہ وہ  
 نکاح کر دیں، وہ اپنی ماں کو ساتھ لائے گا تو رخصتی بھی کروالے گا مگر اسے نہیں خبر تھی کہ اس کی ماں اتنی  
 سخت دل عورت ہوں گی۔ وہ اپنی ضد پر ہی اڑی رہیں گی آج وہ پھر ہمت کر کے ان کے کمرے میں چلا  
 آیا تھا۔

”امی آپ میری ذرا سی بات نہیں سنیں گی۔“  
 ”مجھے تم سے کوئی بات نہیں کرنی چلے جاؤ۔“ وہ پشت پھیرے ہوئے تھیں۔  
 ”امی! سوچ لیجئے گا آپ، میں اس گھر سے ہی ہمیشہ کے لیے چلا جاؤں گا۔ میری صورت تک کو ترس  
 جائیں گی۔“  
 ”مجھے ایسی دھمکی دے کے ڈرا نہیں سکتے۔“



”امی میں سچ کہہ رہا ہوں۔“ وہ خاصا سنجیدہ تھا۔  
 ”اولاد کو پال پوس کے بڑا کرو اور وہ ماں و باپ کو یہ انعام دیتے ہیں۔“ وہ تو کلس رہی تھیں۔  
 ”تم نے میرے اعتماد کو توڑا اور میرے ارمانوں کو بھی کتنی خواہش تھی میں اپنے بیٹے کی اپنی پسند سے  
 شادی کروں گی۔“

”آپ ایک دفعہ مریم سے مل تو لیں۔ بہت اچھی لڑکی ہے۔“  
 ”مجھے نہیں ملنا۔“ وہ اتنی سخت دل ہو گئی تھیں فاران بہت مایوس اور افسردہ ہو گیا تھا۔  
 ”ٹھیک ہے آپ مجھے معاف کریں گی اور مریم کو اپنی بہو تسلیم نہیں کریں گی تو میں اسے چھوڑ دیتا ہوں  
 مگر یاد رکھیے گا ساری زندگی شادی نہیں کروں گا دوبارہ۔“ وہ یہ کہہ کر رکنا نہیں چلا گیا۔  
 نزہت تو ہکا بکارہ گئی تھیں۔ وہ یہ کیا کہہ کر چلا گیا تھا۔ ان کا دل بے چین ہوا۔  
 فاران سیدھا مرتضیٰ علی کے پاس گیا تھا۔ ان سے بھی یہی بات کی وہ تو ایک دم غصے میں آ گئے۔  
 ”تمہارا دماغ خراب ہے ایک لڑکی کو خود سے باندھا اور اسے چھوڑنے کی بات کر رہے ہو پہلے تو بے  
 وقوفی کی ہی تھی دوبارہ سے یہ غلطی کرنے جا رہے ہو۔“  
 ”تو کیا کروں، امی کسی طرح بھی مریم کو قبول نہیں کر رہی ہیں۔ میں نے ایک بے سہارا لڑکی کو تحفظ دیا  
 ہے تو کیا غلط کیا ہے۔ میں جانتا ہوں، میں نے یوں چوری چھپے نکاح کر کے آپ سب کے اعتماد کو توڑا ہے مگر  
 میرا قدم اس لیے تھا کہ امی کبھی بھی مریم سے میری شادی نہیں کریں گی۔ اس لیے میں نے نکاح کیا، سوچا  
 تھا بعد میں آپ سب کو بتا دوں گا مگر مجھے یہ امی کو بتانا پڑا خوشنما بھابی کی بے عزتی کرتی رہتی تھیں۔ کیونکہ وہ  
 غریب گھرانے سے ہیں میں نے امی کی سوچ کو بدلنے کے لیے یہ سب کیا تھا۔“  
 ”دادا جان! مجھے بتائیے کیا کروں میں۔“ وہ ان کے گھٹنوں پر سر رکھتے ہوئے بہت رنجور اور دلگرفتہ  
 ہو رہا تھا۔

”تم اس لڑکی کو چھوڑنے کی بات نہیں کرو۔ ہم تمہارا اولیہ کر رہے ہیں اسی لیے کہتا کہ اس لڑکی کو عزت  
 سے رخصت کروا کے لائیں اور بڑی دلہن بھی مان جائیں گی تم مزید الٹا سیدھا نہیں سوچو۔“ انہوں نے اس  
 کے سر پر ہاتھ رکھ کے تسلی دی۔

”دادا جان مجھے معاف کر دیں۔“

”ہشت مرد روتے اچھے نہیں لگتے۔ اٹھو اور اپنا کام کرو جا کے اس طرح تم اپنی جاب کو چھوڑ کے بیٹھے  
 رہو گے تو کچھ نہیں کر سکو گے۔“ اس نے سر ہلایا۔

”ارتضیٰ آفس گیا ہے تم بھی جایا کرو ایسے کام نہیں چلے گا۔“

”دادا جان آپ بہت اچھے ہیں۔“ اس نے ان کے ہاتھ چوم لیے۔

”اچھا، اچھا بس کر آئندہ کوئی بھی قدم اٹھاتے وقت اتنا ضرور سوچنا تمہارے بڑوں کی بھی اہمیت  
 ہے۔“ فاران نے شرمندگی سے سر ہلایا تھا۔

☆.....☆

بشم جاوید احمد اور ثمنینہ سے رشتے کی بات کر چکا تھا خوشنما سے اس نے کچھ نہیں کہا تھا۔  
 ”انکل میرے دوست کی امی جب ہی آئیں گی جب آپ کی رضامندی ہوگی۔“



”بیٹا اتنے بڑے لوگوں میں ہمارا جوڑ نہیں بنتا۔“ وہ ہلکا چارہ ہے تھے۔  
”آپ ایسی بات سوچ بھی کیوں رہے ہیں۔“ پشم ان کی بات سمجھ گیا تھا کیوں کہ خوشنما کے ساتھ جو  
کچھ ہوا کون سا اچھا ہوا تھا۔ اس لیے انہوں نے سوچ لیا تھا اپنی باقی دونوں بیٹیوں کی شادی اونچے لوگوں  
میں نہیں کریں گے کیوں کہ رشتے برابر کے لوگوں میں ہی کرنے چاہئیں۔

”بیٹا حالات ایسی بات سوچنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ آپ ان لوگوں سے معذرت کر لیں۔“  
”انکل آپ ایسی بات تو نہیں کریں اشعر کی فیملی بہت اچھی ہے انہوں نے خوشنما کو دیکھا ہے جب ہی  
تو اشعر کی امی نے خواہش ظاہر کی کہ خوشنما کی بہن سے رشتہ کرنا چاہتی ہیں۔“ اس نے اشعر کا نام لینا  
مناسب نہیں سمجھا تھا۔

”آپ نے خوشنما سے ذکر کیا۔“ شمینہ نے پوچھا۔  
”خوشنما کو پتا ہے میں نے سوچا میں خود جا کر بات کروں تو بہتر ہے۔“ وہ کچھ بڑبڑایا بھی مگر فوراً ہی  
بات کو سنبھال بھی لیا۔

”خوشنما اشعر کی امی کے ساتھ آئے گی۔“ وہ جھٹ بولا۔  
”انکل پلیز انکار نہیں کریں۔ پہلے آپ ان لوگوں سے مل لیں۔ پھر ہی کوئی فیصلہ کیجیے گا۔ کیوں  
کہ میری یہ خواہش ہے کہ رونا اور ایمین کی اچھی جگہ شادی ہو، وہ میری بہنوں کی طرح ہیں۔“ جاوید  
احمد نے شمینہ کی طرف دیکھا کیوں کہ وہ چاہ رہی تھیں پہلے ان لوگوں سے مل لیں پھر ہی کوئی فیصلہ بھی  
کریں۔

”ٹھیک ہے بیٹا آپ ان لوگوں کو آنے کا کہہ دیں۔“  
”شکر یہ انکل بہت بہت شکر یہ۔“ وہ مسکرا کے ان کا شکر یہ ادا کر رہا تھا۔  
”میں رونا کو دیکھوں ابھی تک چائے نہیں لائی۔“  
”آئی چائے وغیرہ بعد میں پیوؤں گا اب میں چلوں گا۔“ اس نے ٹائم دیکھا، خاصا ہو گیا تھا۔ آفس  
سے نکلے ہوئے اسے دو گھنٹے ہو گئے تھے۔

”بیٹا تھوڑی دیر اور۔“  
”نہیں انکل مجھے کچھ ضروری کام بھی ہیں۔ میں کل ہی ان لوگوں کو لے کے آؤں گا۔“  
وہ ان سے سلام و دعا کر کے رخصت ہو گیا۔ ادھر رونا کی دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں دو تین بار ہی  
اشعر کو دیکھا تھا اس نے اندازہ نہیں کیا تھا اشعر اس کے لیے کیا جذبات رکھتا ہے۔  
جھٹ خوشنما کو بھی کال کر لی تھی۔

”کیا پشم آئے تھے۔“ خوشنما کو حیرانگی بھی ہوئی۔  
”کیوں آپ کو نہیں بتایا۔“ رونا کو حیرت ہوئی۔  
”نہیں بتایا تو تھا۔“ اس نے خود ہی بات بھی بتائی۔  
”آئی اتنے امیر لوگوں میں میرا رشتہ میں ایسا بالکل نہیں چاہتی، کیا پتہ آپ کے سرال والوں کی  
طرح مجھے بھی کتر سمجھیں وہ لوگ۔“ رونا بھی رضا مند نہیں تھی۔



# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✦ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

**We Are Anti Waiting WebSite**

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

# WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on  
Facebook

[fb.com/paksociety](https://fb.com/paksociety)



[twitter.com/paksociety](https://twitter.com/paksociety)



” ضروری نہیں ہے ہر کوئی ایسا ہو۔“

” آپ کے ساتھ کون سا اچھا ہوا ہے جو آپ یہ بات کہہ رہی ہیں۔“ اس نے افسردگی سے کہا۔  
” اچھا اچھا بس زیادہ فضول سوچنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں آؤں گی تو پھر بات ہوگی آج کل یہاں  
گھر میں بھی ٹینشن چل رہی ہے۔“  
” کیسی ٹینشن؟“ رمنانے پوچھا۔  
” گھر آ کے بتاؤں گی۔“

” آپی پھر بھی کچھ تو بتائیے۔“ رمنانے خاصی ضدی واقع ہوئی تھی۔

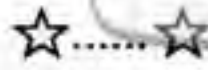
خوشنما نے فاران کے نکاح کی بات بتائی مگر اس نے ہیشم کی کوئی بات نہیں بتائی کیوں کہ اس کے گھر  
والے ان سب باتوں سے لاعلم تھے اور وہ چاہتی بھی نہیں تھی انہیں کچھ بتا چلے۔ مگر کب تک ایک نہ ایک دن  
تو پتہ چل ہی جاتا تھا۔

” دیکھا کیسے آپ کو کتر سمجھتی تھیں ان کے بیٹے نے بھی ایسے ہی شادی کر لی۔“

” بری بات رمنانے نہیں بولتے۔“ اس نے اسے سرزنش کی۔

” آپی اتنا غرور بھی اچھا نہیں ہوتا ہے انہیں بھی سبق مل گیا۔“

” اچھا چھوڑو ان باتوں کو تم کل ذرا اچھا سا تیار ہو جانا، اشعر کے گھر سے ان کی امی آئیں گی۔“ خوشنما  
نے ان پر یہ بالکل ظاہر نہیں کیا اسے ہیشم نے کچھ نہیں بتایا۔ وہ جانتی تھی وہ اپنے معاملے کی وجہ سے بھی  
الجھا ہوا تھا اس سے وہ ابھی تک بات بھی نہیں کر رہا تھا اور اسے ہی ایسا کوئی قدم تو اٹھانا ہی تھا ہیشم کی  
الجھن ختم ہو کیونکہ وہ اتنی بے حس بھی نہیں تھی۔



حسنی نے کافی حد تک کچھ کو ایڈجسٹ کر لیا تھا۔ شہریار کے جانے کے دن قریب آرہے تھے۔ حسنی کو  
اس نے بلا وجہ ڈانٹنا چھوڑ دیا تھا وہ بھی حیران تھی شہریار ایسے کسے رہ سکتا تھا۔  
” کتنے عرصے بعد بلاؤ گے حسنی کو پتہ؟“ نسرین ملنے آئی ہوئی تھیں۔

” پھپھو یہ تو میں وہاں جا کر دیکھوں گا کیوں کہ میں نے فلیٹ بھی کرائے پر لینا ہے وہ سب سیٹ ہو  
جائے تو پھر بلاؤں گا۔“ اس نے ذرا آہستگی سے سمجھا کے انہیں بتایا۔  
حسنی ان سب کے درمیان بیٹھی تھی مگر وہ بہت خاموش سی ہو گئی تھی یا پھر شہریار کے جانے سے وہ اداس  
ہو رہی تھی۔

” جب تک بیٹا تم سے بلاؤ گے میں ایسا کرتی ہوں حسنی کو گھر لے جاتی ہوں۔“ نسرین نے کہا۔

” اے نسرین ایسی بھی تمہیں کیا مار پڑی ہے۔ تمہاری بیٹی یہاں آرام سے ہے اور شہریار بھی بلا ہی لے  
گا۔“ حسین بیگم روایتی ساس بن کے گویا ہوئیں۔

” بھابی بہت دن ہو گئے حسنی رہنے نہیں آئی ہے رفعت کہہ رہی تھی میں اسے ساتھ لے آؤں۔“

” بس رفعت کی تو رہنے ہی دو۔“ وہ ویسے بھی ان سے خاصی جلی ہوئی تھیں کیوں کہ رفعت نے جو کچھ



”ٹھیک ہے پھپھو آپ لے جائے مگر ابھی نہیں۔“ اس نے حسنی کے خاموش چہرے پر نظر ڈالی ریڈ پرنٹ ڈکاشن کے سوت میں اس کی سرخ و سپید رنگت اور نمایاں ہو رہی تھی۔

”امی! مجھے جب آنا ہوگا میں آ جاؤں گی۔“ وہ یکدم ہی بولی تھی۔

نسرین حیرانگی سے اس کے بگڑتے تیور دیکھنے لگیں۔ شہریار نے اسے جانچ لیا تھا اُسے حسین بیگم کی بات ناگوار گزری ہے اس لیے اس نے غصے میں اسے کہا تھا۔

شہریار اس کے پیچھے ہی چلا آیا وہ کونے میں کھڑی اپنے آنسو آنچل کے کونے سے صاف کر رہی تھی۔ اسے دیکھ کر وہ گھبرا گئی اور اس سے بچ کے کچن میں چلی گئی۔

”کیا بات ہے تم نے پھپھو کو ایسے کیوں جواب دیا۔“ وہ استفسار کر رہا تھا۔

”آپ لوگ جو چاہتے ہیں اسی طرح جواب دے تو دیا ہے۔ نہیں جا رہی میں کہیں کبھی آپ بے فکر ہو جائیں۔“ حسنی بہت افسردہ اور مایوس ہو گئی تھی اسے اپنی زندگی بے مصرف سی لگنے لگی تھی کوئی بھی چارم نہیں تھا اس نے اندازہ کر لیا تھا۔ شہریار نے اسے نچا دکھانے کے لیے اس سے زبردستی شادی کی تھی۔

”کیا مطلب ہے تمہارا۔“ وہ اس کی سرخ ہوتی ناک کو دیکھ رہا تھا۔ وہ سنک میں پڑے گندے برتن دھو رہی تھی۔

”آپ لوگوں کو نوکرانی چاہیے تھی۔ آ تو گئی ہوں ہاں اور آپ بھی جیت گئے کیوں کہ میں نے آپ کو پتا نہیں کیا کیا کہا تھا۔ وہ سب مجھے آپ لوٹا تو رہے ہیں۔“ لہجے میں بہت افسردہ تھی وہ شہریار کے سرد رویے سے تنگ آ گئی تھی جسے اس کے جذبات اور احساسات کی ذرا پروا نہیں تھی۔

”شہریار صاحب! آپ جیت گئے مجھے آپ نے ختم کر لیا جیسا دل چاہے آپ سلوک کریں میرے ساتھ کیوں کہ میں اسی قابل ہوں کیوں کہ میں نے آپ کو پہلے بہت کچھ الٹا سیدھا بولا ہے۔“

”کیا بکو اس کر رہی ہو۔“ وہ ایک لمحے کو گڑبڑا بھی گیا کیوں کہ حسنی بہت ٹوٹی ہوئی بکھری ہوئی لگ رہی تھی۔

”مجھے تو پہلے بھی کوئی خوشی نہیں ملی اور ابھی بھی کوئی خوشی نہیں ملی میرے مرحوم باپ نے مجھے پیدا ہوتے ہی پھپھو کی گود میں ڈال دیا۔ میری تو شخصیت ہی بٹ گئی۔ کس کی سنتی پھپھو کی یا اپنی ماں کی۔ دونوں نے مجھے اپنی ملکیت سمجھ کے اپنی مرضی مجھ پر چلائی اور اب آپ اپنی چلا رہے ہیں۔ میں تو کہیں بھی نہیں ہوں۔“ وہ پھوٹ پھوٹ کے رو دی اور پھر اس نے اپنے کمرے کا رخ کیا۔ شہریار کو شرمندگی اور دکھ ہو رہا تھا واقعی حسنی کے ساتھ تو شروع سے ہی زیادتی ہوتی آرہی تھی اور اب وہ اس کے ساتھ کون سا اچھا کر رہا تھا اگر اسے حسنی سے محبت ہے تو وہ پھر اسے کیوں اسے دکھ دے رہا تھا جب کہ حسنی نے تو یہاں آ کر خود کو کافی حد تک ایڈجسٹ کر لیا تھا۔ شہریار کو اپنی غلطی کا احساس شدت سے ہونے لگا تھا۔ وہ بھی دلگرفتہ سا ہونے لگا۔

(جاری ہے)



آخری حصہ

# میرے دل پر سار

سائرہ کا جہاز رن وے پر اتر چکا تھا۔ کراچی انٹرنیشنل ایئر پورٹ پر اس نے اپنا پہلا قدم رکھ دیا تھا۔ اس شہر سے اس کی ماں کا تعلق بہت گہرا تھا۔ یہاں اس کی ماں کا گھر تھا۔ وہ گھر جس کے قصے سن سن کر سائرہ جوان ہوئی تھی۔ سائرہ اپنے بچپن سے ہی اپنی ماں کی زبانی پاکستان کے بارے میں باتیں سنتی آئی تھی اور اس وقت اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ جا کر اس ساحل سمندر کو چھو کر آئے جس کے مقابلے میں اس کی

سوسائٹی

پاک

ڈا

www.PAKSOCIETY.COM

READING  
Section



ماں کو سڈنی کے سارے ساحلی علاقے معمولی لگتے تھے۔ ان شاموں میں کچھ وقت گزار کر آئے جس کے بارے میں اس کی ماں کا دعویٰ تھا کہ سڈنی کی خوب صورت شامیں اور موسم ان شاموں کے آگے کچھ نہیں ہیں۔ بچپن کی وہ دبی دبی سی خواہش ایسے پوری ہو گئی یہ تو اس نے کبھی نہیں سوچا تھا۔ اس کی ماں نے اپنے ایک جاننے والے کے ذریعے اس کی ٹکنس کروادی تھیں۔ وہ اپنی ماں کو چھوڑ کر نہیں جانا چاہتی تھی مگر اس دوزخ سے نکلنے کا کوئی اور راستہ نہیں تھا۔ وہ اپنی ماں کے کہنے پر سڈنی چھوڑ تو آئی تھی مگر اس کا ارادہ تھا کہ کچھ دنوں بعد ہی واپس لوٹ جائے گی۔ ویسے بھی اپنی تعلیم تو اسے اپنے شہر میں ہی مکمل کرنا تھی۔ اس لیے یہاں مستقل طور پر رہنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔

کراچی کا ایئر پورٹ سڈنی کے ایئر پورٹ کے مقابلے میں بہت چھوٹا تھا مگر اسے پھر بھی یہ اچھا لگا تھا۔ ایئر پورٹ پر اس کے جواد ماموں اسے لینے کے لیے آئے ہوئے تھے۔ ویسے تو اپنے اکثر ننھیالی رشتے داروں سے اس کا غائبانہ تعارف تھا مگر اپنے جواد ماموں سے اس کی ایک دو بار اسکا پ پر بات ہو چکی تھی اور وہ انہیں اچھی طرح پہچانتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس کی ماں نے اپنے خاندان کے خلاف جا کر اپنی پسند کی شادی کی تھی۔ اس لیے اس کے ننھیال والے ان لوگوں سے نہیں ملتے تھے۔ مگر اب صورت

Downloaded from paksociety.com



READING  
Section



حال کافی بدیل چکی تھی۔ اس کی ماں کا فون پر اپنے گھر والوں سے رابطہ رہتا تھا۔ یہ بات اس کے باپ کے علم میں نہیں تھی ورنہ ہو سکتا تھا وہ پیسوں کا مطالبہ کرتا۔ سائرہ کے نانا اور نانی کا انتقال ہو چکا تھا۔ کراچی میں اس کے صرف ایک ماموں تھے۔ جب کہ ایک ماموں اور خالہ انگلینڈ میں رہتے تھے۔ اس کے جواد ماموں اسے لینے کے لیے آئے ہوئے تھے۔ وہ ان کے خاندان کے ساتھ بہت جلد گھل مل گئی تھی۔ اسے کراچی شہر آئے ہوئے ابھی کچھ دن ہی ہوئے تھے مگر اسے لگتا تھا کہ جیسے وہ صدیوں سے یہاں رہ رہی ہو۔ یہاں کی سب سے خوب صورت جگہ بلاشبہ ساحل سمندر ہی تھا جو اسے دیگر ساحلی علاقوں کی طرح بہت خاموش پر اسرار اور گہرا لگا تھا۔ اس شہر میں اس کے لیے بس یہی ایک خاص کشش تھی کہ اس کی ماں کی یہاں سے بہت سی یادیں وابستہ تھیں۔ اس کی اپنی یادیں تو جس جگہ سے جڑی ہوئی تھیں اسے تو وہ بہت دور چھوڑ آئی تھی۔ شاید سارے شہر ایک جیسے ہوتے ہیں۔ بس ان سے وابستہ یادیں ہی ہماری نظر میں ان کو خاص بناتی ہیں۔ اپنے ماموں کے گھر اسے جو اپنائیت ملی تھی اس نے اسے پر اعتماد بنا دیا تھا۔ وہ چند ہی دنوں میں سب کی بہت اچھی دوست بن گئی تھی۔ اسے یہاں پر زبان کا کوئی مسئلہ نہیں ہوا تھا کیوں کہ اس کی ماں نے اپنی مادری زبان سے اس کا تعارف کروا رکھا تھا۔ وہ نہ صرف اردو سمجھ لیتی تھی بلکہ مناسب حد تک بول بھی لیتی تھی۔ اپنے ماموں کی دونوں بیٹیوں سیرینہ اور شہرین سے اس کی بہت بے تکلفی ہو گئی تھی۔ وہ ابھی پڑھنا نہیں چاہتی تھی۔ زیادہ تر وقت وہ کراچی کے ساحل ہی کے پاس ہی گزارتی تھی۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ اس کا بھی ایک خوب صورت گھر ساحل سمندر کے کنارے ہو، جہاں پر وہ روزانہ شام کو چہل قدمی کے لیے جایا کرنے اور سمندر سے بہت سی باتیں کرے۔ اسے یقین تھا کہ ایک نہ ایک روز اس کی خواہش ضرور پوری ہوگی۔ چشم تصور میں وہ خود کو علی کے ساتھ اکثر ساحل پر گھومتے ہوئے دیکھتی تھی۔ باوجود کوشش کے وہ علی کو بھول نہیں پائی تھی۔ اپنی سوچوں پر اس کا کوئی اختیار نہیں تھا۔ اس کا دل علی کو بے وفائ نہیں سمجھتا تھا۔ وہ سوچتی تھی کہ اسے ایک بار علی سے ضرور اپنے دل کی بات کہہ دینی چاہیے تھی۔ وہ علی سے بدگمان ضرور ہوئی تھی مگر اپنے آپ کو اس سے محبت کرنے سے روک نہیں پائی تھی کہتے ہیں محبت کا درخت جتنا بھی مضبوط ہو جائے، دل کی سر زمین پر اگر شک کا بیج اپنی جگہ بنالے تو مضبوط سے مضبوط درخت بھی اپنی جگہ چھوڑ دیتا ہے۔ اس کے ساتھ بھی شاید ایسا ہی ہوا تھا۔ اسے اپنی یاں کی بھی بہت فکر تھی۔ جواب اس سے بہت دور تھی۔ اس کی فون پر ایک دو بار اپنی ماں سے بات ہوئی تھی مگر اسے ان کی طبیعت ٹھیک نہیں لگی تھی۔ ماں کی زبانی اسے پیٹر کا حال بھی معلوم ہو چکا تھا۔ وہ جیسا بھی تھا اس کا باپ تھا۔ وہ ہر لمحے اپنے باپ کی سلامتی کے لیے دعا گو رہتی تھی۔ اس کے دل میں آنے والے وقت کے بارے میں سوچ کر دبے دبے سے کچھ خدشات تھے جو آہستہ آہستہ سراٹھا رہے تھے۔ وہ اپنے ماموں کے گھر اپنی زندگی کے بہترین لمحات گزار رہی تھی مگر ان دیکھے و سوسے اور اندیشے اسے رات کو سکون سے سونے نہیں دیتے تھے۔ یہاں آ کر اس نے مذہب کو بھی ٹھیک طرح سمجھا تھا ورنہ سڈنی میں تو وہ صرف نام کی ہی مسلمان تھی۔ اپنی مذہبی رسومات کی ادائیگی کے بعد اس کے دل کو کچھ سکون ملا تھا۔ اس کو یہ اطمینان تھا کہ اس کی ماں کے ساتھ ان کی ایک سہیلی ہے جو ان کا بہت خیال رکھتی ہے مگر پھر بھی وہ اپنے دل کی بے چینی کا سبب جان نہیں پائی تھی اور ایک روز اسے اپنے دل کی بے چینی کا سبب مل ہی گیا۔ جب اسے پتا چلا کہ اس کی ماں اچانک سے اسے چھوڑ کر چلی گئی ہے۔ اس کے ماموں نے جب یہ خبر اسے سنائی تو اسے لگا کہ اس کے اندر سے جیسے کسی نے سارا خون



نچوڑ لیا ہو۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔ اتنی تنہائی اور اکیلا پن اس نے پہلے کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔ وہ اپنے ماموں کے ساتھ ایک بار پھر سڈنی میں تھی۔ اس بار اسے اپنا یہ شہر بالکل بھی اچھا نہیں لگا تھا۔ اس نے اپنی ماں کو ہمیشہ کے لیے رخصت کر دیا تھا۔ دنیا کے دکھوں سے نجات پا کر اس کی ماں ابدی نیند سو گئی تھی۔ سائرہ کے لیے زندگی میں اب کوئی کشش نہیں تھی۔ اسے بے رنگ اور بے کیف زندگی اب اکیلے ہی گزارنی تھی کیوں کہ اس کو حوصلہ دینے والی ماں اب اس کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر جا چکی تھی۔

☆.....☆

”ایرک پلیز! حوصلہ کرو۔ تمہیں ایک سے ایک اچھی لڑکی مل جائے گی۔ تم سمجھ لو کہ سائرہ تمہارے قابل نہیں تھی۔“

علی نے یہ سب کہتے ہوئے ایرک کو گلے لگا لیا تھا۔ وہ جو حسب معمول شام کو سینٹرل پارک میں کچھ وقت گزارنے آیا تھا۔ ایرک کو اس طرح بیچ پر اکیلے بیٹھے بچوں کی طرح روتے دیکھ کر علی اس کے پاس جا کر بیٹھ گیا تھا۔ ورنہ اسے ایرک سے کوئی ہمدردی نہیں تھی مگر جب ایرک نے پوری بات بتائی تو علی کو اس سارے معاملے میں ایرک کا کردار بہت معصوم لگا تھا۔ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ سائرہ اتنی دھوکے باز لڑکی ثابت ہوگی۔ اسے ایرک سے بہت ہمدردی محسوس ہو رہی تھی۔

”وہ تو مجھ سے محبت کے بہت دعوے کیا کرتی تھی۔ ہر وقت مجھ سے ملنے کے لیے بے قرار رہتی تھی۔ اس نے مجھے دھوکا دیا علی۔ اس نے مجھے برباد کر دیا۔“ ایرک، علی کے کندھے پر سر رکھے اب اور زیادہ زور سے رورہا تھا اور اپنی محبت کی بربادی کی داستان سنا رہا تھا۔

علی کو اس کی ذہنی حالت ٹھیک نہیں لگ رہی تھی۔ اسے سائرہ پر بہت غصہ تھا۔ جس نے ایرک جیسے معصوم انسان کو دھوکا دیا تھا۔ ایرک نے اسے بتایا تھا کہ سائرہ اپنے کسی دولت مند کزن کے ساتھ بھاگ گئی تھی اور اس نے یہ صرف ایرک بلکہ اپنے باپ کو بھی دھوکا دیا تھا۔ ایرک کی باتیں سن کر اسے سائرہ سے نفرت محسوس ہو رہی تھی۔ اسے حیرت تھی کہ اتنی اچھی تصویریں بنانے والی لڑکی اتنی چالاک اور مکار بھی ہو سکتی ہے۔ اس کا دل ایک ہی لمحے میں سائرہ سے نفرت محسوس کرتا تھا تو دوسرے ہی لمحے دل کے اندر اس کی محبت بھی زور زور سے اپنے ہونے کا اعلان بھی کرتی تھی۔ کچھ معاملات میں ہم مکمل طور پر بے بس ہوتے ہیں۔ یہ محبت کا معاملہ بھی ایسا ہی تھا۔ جس میں وہ خود کو مکمل طور پر بے بس محسوس کرتا تھا۔ وہ اس روز بہت دیر تک ایرک کے پاس بیٹھا اسے زمانے کی اونچ نیچ سمجھاتا رہا تھا۔ جب وہ ایرک کے پاس سے اٹھ کر گیا تو اسے لگا کہ ایرک اب پہلے سے کافی بہتر ہے مگر اب علی کو اپنی ذہنی حالت ٹھیک نہیں لگ رہی تھی۔ وہ خود کو بہت ٹوٹا اور بکھرا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ ایسے میں وہ کیتھی کے ساتھ کچھ وقت گزارنا چاہتا تھا مگر وہ اپنی ماں کے پاس چھٹیاں گزارنے مبلورن گئی ہوئی تھی۔ اس لیے کچھ وقت سڑکوں پر آوارہ گردی کرنے کے بعد اب وہ گھر لوٹ آیا تھا گھر آتے ہی جو خبر اس نے سنی وہ اس کے رہے سبے اعصاب ختم کرنے کے لیے کافی تھی۔ اس کے والد نواز شاہ کا بہت سیریس قسم کا ایکسڈنٹ ہوا تھا۔ وہ اسپتال کی ایمرجنسی میں تھے۔ علی کو یاد آیا کہ اسے راستے میں بھی فون آتا رہا تھا مگر وہ اتنا افسردہ تھا کہ ہر آنے والا فون کاٹ رہا تھا۔ گھر آتے ہی جب ملازم نے اسے بتایا تو وہ بھاگ کر اسپتال پہنچا جہاں اس کا باپ زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا تھا اور مرتے وقت جو کچھ اس نے علی کو بتایا اس نے گویا علی کی زندگی کا





عروہ ایک بار پھر بہت بری طرح قسمت کی ستم ظریفی کا شکار ہوئی تھی۔ موسیٰ کی بے وفائی نے جو زخم اسے لگایا تھا اس کا جلد مندمل ہونا بہت مشکل تھا۔ وہ گھر آ تو گئی تھی مگر ذہنی اور جسمانی طور پر بہت کمزور اور خوفزدہ ہو گئی تھی۔ اس کی ایسی حالت دیکھ کر اس کی ماں بہت روئی تھی۔ وہ خود کو عروہ کی اس حالت کا ذمہ دار سمجھتی تھی۔ مگر اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ اب تو عروہ کا گھر اجڑ چکا تھا۔ اپنی ماں کے ہی کہنے پر عروہ کے چھوٹے بھائی نبیب نے موسیٰ کو ڈھونڈنے کی بہت کوشش کی مگر موسیٰ کا اسے کوئی سراغ نہیں مل سکا۔ ایک لا حاصل سی تلاش کے بعد وہ بھی خاموش ہو کر بیٹھ گیا تھا۔ عروہ کو اس حقیقت کو تسلیم کرنے میں بہت دن لگ گئے کہ اب موسیٰ نام کا کوئی فرشتہ اس کی زندگی میں نہیں ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ وہ نارمل بھی ہو گئی مگر اپنی ذات پر لگے ان زخموں کو بھول نہیں پائی تھی جو اسے بہت تکلیف دیتے تھے۔ اسے اپنے سے زیادہ اپنی کوکھ میں پلتی اس کی جان کی فکر تھی جو ہر لمحہ اسے اپنے ہونے کا احساس دلاتی رہتی تھی۔ گھر کے حالات اس کے سامنے تھے۔ اب جو بھی کرنا تھا اسی نے کرنا تھا۔ اس نے گھر کے قریب ہی ایک اسکول میں نوکری کر لی تھی۔ تنخواہ اگر بہت زیادہ نہیں تو اتنی کم بھی نہیں تھی جو اس کی ضروریات کو پورا نہ کر سکے۔ کہتے ہیں کہ رب اگر ایک در بند کرتا ہے تو سو در کھول دیتا ہے۔ سو عروہ اور اس کے گھر والوں کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا تھا۔ اسے ملازمت کیا ملی کچھ ہی دنوں بعد اس کی چھوٹی بہن کو بھی ایک سرکاری ادارے میں بہت اچھی ملازمت مل گئی تھی۔ اب ان لوگوں کے گھر کے حالات بھی بہتر ہو گئے تھے۔ عروہ کے چھوٹے بھائی کی تعلیم بھی اب مکمل ہونے ہی والی تھی۔ جیسے جیسے عروہ کی ڈیوری کے دن قریب آ رہے تھے ویسے ویسے ایک انجانا سا خوف اس کے وجود پر دستک دینے لگا تھا کہ نہ جانے کب کیا ہو جائے۔

وہ ڈاکٹر سے باقاعدگی سے اپنا چیک اپ کروا رہی تھی۔ اس کی رپورٹس سب نارمل تھیں مگر وہ اس خوف سے پیچھا نہیں چھڑا سکی تھی۔ اسے موسیٰ کے رویے نے بہت دکھ پہنچایا تھا۔ جس نے محض شک کی بنیاد پر عروہ سے پوچھے بغیر اسے عمر قید کی سزا سنائی تھی اور خود نہ جانے دنیا کے کون سے کونے میں جا کر چھپ گیا تھا۔ اس کے باپ نے بھی اس پر شک کیا تھا اور موسیٰ نے بھی وہی عمل دوبارہ دہرایا تھا۔ اسے ان دونوں میں رتی برابر بھی فرق محسوس نہیں ہوا تھا۔ اپنی زندگی کے بھیانک خواب کو بھلانے کے لیے عروہ نے خود کو حد درجہ مصروف کر لیا تھا۔ وہ صبح اسکول ہوتی تو شام کو بچوں کو ٹیوشن پڑھانے میں مصروف ہو جاتی تھی مگر وہ اس ذہنی دباؤ سے نجات حاصل نہیں کر سکی تھی جو اس کی ذات کا ایک حصہ بن گیا تھا۔ دن گزرتے جا رہے تھے مگر عروہ کوشش کے باوجود اپنی ذہنی و جسمانی حالت میں بہتری نہیں لاسکی تھی۔ بالآخر وہ دن آ ہی گیا تھا جس روز عروہ کے وجود میں پلتی اس کی جان نے دنیا میں آنکھ کھولنی تھی۔ اس روز صبح سے ہی اسے شدید قسم کا درد محسوس ہو رہا تھا۔ درد کی شدت جب حد سے بڑھی تو اس کے گھر والوں کو اس کے کمزور اور لاغر وجود کو لے کر اسپتال منتقل کرنا پڑا۔ اس کی بگڑتی ہوئی حالت کے پیش نظر ڈاکٹرز نے اس کے فوری آپریشن کا فیصلہ کیا۔ عروہ پچھلے چند ماہ سے جس درد اور اذیت کو جھیل رہی تھی اس سے نجات کا وقت آن پہنچا تھا۔ اس کی حالت بہتر نہیں ہو رہی تھی۔ ڈاکٹرز کے لیے واحد راستہ یہی رہ گیا تھا کہ وہ ماں اور بچے میں سے ایک کی جان بچائیں۔ ایسے موقعوں پر عموماً ماں کی جان بچانے کی ہی کوشش کی جاتی ہے اور یہی عروہ کے گھر والوں



کافیصلہ تھا مگر اوپر کا تب تقدیر کا فیصلہ کچھ اور تھا جیسے ہی وہ بچہ اس دنیا میں آیا اسی لمحے اس کی ماں نے ہمیشہ کے لیے آنکھیں بند کر لیں۔ اپنے بچے کو اس دنیا کے حوالے کر کے عروہ نے ہمیشہ کے لیے اس دنیا سے نانا توڑ لیا۔

☆.....☆

کہتے ہیں کہ جب انسان پر برا وقت آتا ہے تو اس کا سایہ بھی اس کا ساتھ چھوڑ دیتا ہے۔ یہی کچھ پیٹر کے ساتھ ہوا تھا۔ میتھیو نے اس کی سوچ سے بھی زیادہ برا سلوک اس کے ساتھ کیا تھا۔ اس کا بس چلتا تو وہ پیٹر کو جان سے ہی مار دیتا مگر یہ پیٹر کی خوش قسمتی تھی کہ وہ میتھیو کی قید سے بھاگ نکلا تھا۔ میتھیو نے پیٹر کو سڈنی کی شہری آبادی سے دور نسبتاً ایک ویران علاقے میں قید کر رکھا تھا جہاں روزانہ چند غنڈے پیٹر پر بہت بری طرح تشدد کرتے تھے اور اس کام میں کبھی کبھی میتھیو اور ایرک بھی اپنا حصہ ڈال لیا کرتے تھے۔ تشدد کے علاوہ وہاں پیٹر سے جسمانی مشقت کا کام بھی لیا جاتا تھا۔ میتھیو کا کہنا تھا کہ جب تک تمام قرض سود سمیت پیٹر واپس نہیں کرتا تب تک وہ اپنی رہائی کے بارے میں سوچ تک نہیں سکتا۔ وہ غنڈے جس طرح پیٹر پر تشدد کرتے تھے اس سے پیٹر کو تو بھی لگتا تھا کہ اب اس کی موت یقینی ہے مگر وہ بہت سخت جان تھا۔ اسی لیے اتنی مار کھا کر بھی نہ صرف زندہ تھا بلکہ اس کے حواس بھی بحال تھے۔

ایک روز انہی غنڈوں کی غفلت کا فائدہ اٹھا کر پیٹر اس قید خانے سے بھاگ نکلا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ کس سمت جا رہا ہے۔ بس وہ میتھیو کی پہنچ سے بہت دور چلے جانا چاہتا تھا۔ وہ جسمانی طور پر بہت کمزور ہو چکا تھا۔ اس لیے اس کی ٹانگیں اس کا زیادہ ساتھ نہیں دے سکیں تھیں اور کچھ میل کے فاصلے پر جا کر وہ بے ہوش ہو کر گر پڑا تھا۔ اسے بے ہوشی کی حالت میں ایک شخص اٹھا کر اپنے گھر لے آیا تھا۔ وہ شخص کون تھا۔ پیٹر نہیں جانتا تھا۔ مگر اس کی چند روز کی بیمار داری سے پیٹر کے کمزور وجود میں جان پڑ گئی تھی۔ اس کے زخم بھی مندیل ہو رہے تھے۔ پیٹر اس شخص کا دل سے شکر گزار تھا جو کسی فرشتے کی طرح پیٹر کی زندگی میں آیا تھا۔ وہ شخص ایک باریش اور راسخ العقیدہ مسلمان تھا۔ وہ پیٹر کے سامنے روزانہ پانچ وقت نماز پڑھ کر اس کے چہرے پر کچھ پڑھ کر پھونکا کرتا تھا۔ پیٹر کی حالت اب کافی بہتر ہو گئی تھی۔ وہ اب روزانہ کچھ دیر چہل قدمی کرتا تھا۔ اسے اب اس شخص سے ایک خاص قسم کا لگاؤ پیدا ہو گیا تھا۔ ایک روز جب اس شخص نے پیٹر کے پوچھنے پر اپنا نام بتایا تو پیٹر کو ایک خوشگوار قسم کی حیرت ہوئی تھی۔ اس شخص کا نام عبداللہ تھا۔

☆.....☆

اشرف مسیح کو شہر کے اس درمیانے درجے کے گاؤں وارڈ میں کام کرتے ہوئے چند برس ہونے کو آئے تھے۔ روزانہ طرح طرح کے لوگوں سے اس کا واسطہ پڑتا تھا مگر وہ شخص اس کے لیے ایک نہایت عجیب کیس ثابت ہوا تھا۔ وہ ایک پڑھا لکھا اور مہذب شخص نظر آتا تھا مگر اس کی حرکتیں اسے اشرف مسیح کی نظروں میں بہت مشکوک بنا رہی تھیں۔ تقریباً ایک ہفتے سے وہ روزانہ ہی کچھ مخصوص وقت کے لیے گاؤں وارڈ کی انتظار گاہ میں آ کر بیٹھ جایا کرتا تھا اور جیسے ہی کوئی نرس کسی نو مولود کو اس کے باپ یا پھر کسی دوسرے رشتے دار کے حوالے کرتی اس لمحے اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک پیدا ہو جاتی تھی۔ اس شخص کی آنکھوں میں چھپی حسرت اور تمنا کو اشرف مسیح بہت اچھی طرح سمجھ گیا تھا۔ کچھ ہی دنوں میں اشرف مسیح اور اس شخص کے درمیان باقاعدہ طور پر بات چیت شروع ہو گئی تھی۔ اس شخص نے اپنا مدعا

READING  
Section

رواڈ انجسٹ [35] ستمبر 2015ء



اشرف مسیح سے بیان کر دیا تھا۔ پہلے پہل تو اس نے انکار کر دیا تھا۔ مگر اس شخص نے اسے بہت بھاری رقم کی پیشکش کی تھی۔ کچھ دن سوچنے کے بعد بالآخر اشرف مسیح اس شخص کی خاطر وہ کام کرنے پر تیار ہو گیا۔ کیونکہ بہر حال ایک اچھا مستقبل اس کا بھی حق تھا۔ اس شخص نے اشرف مسیح کو ایک خالی چیک دیا تھا۔ جس پر اپنی مرضی کی رقم لکھ کر اشرف مسیح نے اپنے پاس چیک رکھ لیا تھا۔ اس نے تو کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ اس پر قسمت اس قدر جلد اتنی مہربان ہو جائے گی۔ اب اس نے ایک نو مولود کو اغوا کر کے اس شخص کے حوالے کرنا تھا۔ یہ کوئی اتنا آسان کام نہیں تھا مگر اب اسے آسان ہی لگ رہا تھا۔ وہ دو برس سے اس وارڈ میں صفائی کر رہا تھا اور اپنے اچھے رویے کے باعث اس کے دیگر ملازمین اور اب اسپتال کی انتظامیہ سے بہت اچھے تعلقات تھے۔ سچی اس پر بھروسہ اور بھرپور اعتماد کرتے تھے۔ اس لیے اس پر کوئی شک نہیں کر سکتا تھا۔ اسے صرف مناسب موقع کا انتظار تھا اور ایک روز اسے وہ موقع مل گیا تھا۔

ایک رات گائنی وارڈ میں ایک لڑکی بچہ پیدا کر کے مر گئی تھی اور اشرف مسیح کو لگا کہ اس سے زیادہ سنہری موقع اسے دوبارہ نہیں مل سکتا تھا۔ بچہ انتہائی نگہداشت وارڈ میں رکھا گیا تھا۔ اشرف مسیح نے اس وارڈ کی دو نرسز کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا تھا اور خود وارڈ میں صفائی کے بہانے زیادہ سے زیادہ وقت گزار رہا تھا۔ اس نے اس شخص کو فون کر کے اسپتال کے بیرونی احاطے میں انتظار کرنے کا کہا تھا۔ جیسے ہی ڈاکٹر ادھر ادھر ہوئے اس نے بچے کو اٹھایا اور چند لمحوں میں اسے اس شخص کے حوالے کر دیا جو اس کی بتائی ہوئی مخصوص جگہ پر پہلے سے کھڑا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ رات کی تاریکی میں وہ شخص بچے لے کر اشرف مسیح کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اشرف مسیح اب اسپتال کے اندر جا رہا تھا۔ اسے وہاں جا کر اب صورت حال کو سنبھالنا تھا۔ ویسے تو اس شخص نے اسے یقین دلا رکھا تھا کہ اس کے تعلقات بہت اوپر تک ہیں اگر اشرف مسیح کو کچھ ہوا تو وہ اسے بچالے گا۔ اب اسے صفائی کا کام بھی چھوڑ دینا تھا۔ اس کے بینک اکاؤنٹ میں اتنی رقم تھی کہ وہ کوئی اچھا سا کاروبار شروع کر سکتا تھا۔ اس کا ارادہ یہ شہر چھوڑ دینے کا تھا اور وہ اب ایسا کر سکتا تھا۔ ایک نہایت سنہرا اور شاندار مستقبل اب اس کا اور اس کے بیوی بچوں کا منتظر تھا مگر یہ مستقبل اس نے کسی کی کوکھ اجاڑ کر حاصل کیا تھا۔ اس لیے یہ سب اسے اس نہیں آسکا اور بہت جلد وہ دوبارہ اسی جگہ پر واپس آ گیا تھا جہاں سے وہ چلا تھا۔

☆.....☆

موسیٰ نے اپنا ایک آرٹ اسکول کھولا تھا۔ جہاں پر آرٹ کی مختلف اصناف میں کچھ کورسز کروائے جاتے تھے۔ یہ اپنی طرز کا ایک منفرد آرٹ اسکول تھا۔ جہاں پر جدید آرٹ کی تعلیم دی جاتی تھی اور دیکھتے ہی دیکھتے اس آرٹ اسکول کی شہرت پورے شہر میں پھیل گئی تھی۔ صبح وہ آرٹ اسکول میں ہوتا تھا تو شام کو کچھ وقت کے لیے کینوس کے سامنے کھڑے ہو کر رنگوں کے ساتھ کھیلنا اس کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ کاروبار سے اس کی لا تعلقی ہنوز برقرار تھی۔ اس لیے اس کے باپ نے بھی اسے کچھ کہنا چھوڑ دیا تھا۔ وہ اپنی پچھلی زندگی کے بارے میں سوچتا تو وہ اسے ایک بھیانک خواب کے علاوہ کچھ محسوس نہ ہوتی مگر وہ بھیانک خواب اس کے اندر بستا تھا۔ ماضی کی یادیں اب بھی تنہائی میں اسے بے چین کر دیا کرتی تھیں۔ آرٹ اسکول میں اس کا بہت اچھا وقت گزرتا تھا۔ نو آموز طالب علموں کے اندر کام سیکھنے کی جستجو اسے بہت حوصلہ دلاتی تھی۔ اسے یقین تھا کہ اس کے ملک میں ٹیلنٹ کی کمی نہیں ہے بس ذرا سا تلاش کرنے کی ضرورت ہے۔ اس نے



اپنے اسکول کی فیس بہت کم رکھی تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ محض پیسوں کی وجہ سے کوئی اس کے ادارے میں داخلہ لینے سے محروم رہ جائے۔ ایک روز جب وہ اپنے ادارے میں طالب علموں کو لیکچر دے کر ابھی اپنی سیٹ پر بیٹھا ہی تھا کہ اس سے اس کے یونیورسٹی کے دنوں کا ایک پرانا شناسا حادثے کے لیے آگیا۔ حادثے سے اس کی یونیورسٹی کے زمانے میں اچھی سلام دعا تھی۔ حادثے ہی وہ پہلا شخص تھا جس نے اسے سب سے پہلے شادی کی مبارک باد دی تھی اور حادثے اور اس کے چند دوستوں سے تو اس کی یونیورسٹی کے بعد بھی کچھ عرصہ بہت دوستی بھی رہی تھی۔ حادثے کو اس طرح اپنے سامنے دیکھ کر موسیٰ کو بہت خوشی ہوئی تھی۔ ابتدائی بات چیت کے بعد وہ دونوں اب یونیورسٹی کے زمانے کے قصے دہرا رہے تھے۔ موسیٰ کو حادثے کا رویہ کچھ عجیب سا لگ رہا تھا مگر باوجود کوشش کے وہ اسے سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ ایک عجیب سا احساس ندامت اس کے چہرے پر نمایاں تھا۔

”موسیٰ! میں تم سے اب جو بات کہنے والا ہوں۔ وہ سن کر تم مجھ سے نفرت کرنے لگو گے مگر اس سے کہیں زیادہ نفرت تمہیں اپنے باپ سے محسوس ہوگی۔ میرے دل پر بہت دنوں سے ایک بوجھ ہے۔ میں نے تمہیں بہت ڈھونڈا ہے۔ شکر ہے آج تم مجھے مل گئے۔“ اس کی باتیں موسیٰ کو بہت پریشان کر رہی تھیں۔ ”تم کہنا کیا چاہتے ہو۔ کھل کر کہو۔“ موسیٰ نے گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”موسیٰ! ان دنوں میری مالی حالت بہت پتلی تھی۔ ابو کی بیماری کی وجہ سے ان کی پوری تنخواہ ان کے علاج پر ہی خرچ ہو جاتی تھی۔ میرے پاس یونیورسٹی کی فیس ادا کرنے کے پیسے نہیں تھے۔ امتحانات نزدیک تھے اور اگر فیس ادا نہ ہوتی تو میرا امتحان دینا مشکل ہی نہیں ناممکن ہو جاتا۔ ایسے میں میرا پورا سال ضائع ہو جاتا۔ میں بہت پریشان رہنے لگا تھا کہ ایک روز میرا دوست خضر میرے پاس آیا۔ میری پریشانی کا سن کر اس نے مجھے یقین دلایا کہ میرا مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔ پھر وہ مجھے تمہارے والد کے پاس لے گیا۔ وہ چاہتے تھے کہ ہم سب مل کر تمہارے دل میں موجود عروہ کی محبت کو نفرت میں بدل دیں۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے میرے اور خضر سمیت چار اور لڑکوں کا انتخاب کیا۔ ہم سب کو اتنی اچھی رقم کی پیشکش کی گئی تھی کہ ہم انکار ہی نہیں کر سکے۔ اب ہم تمام وقت کسی نہ کسی بہانے سے تمہارے پاس رہنے لگے۔ ہم مختلف طریقوں سے تمہیں عروہ اور محسن سے بدظن کرنے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ امتحانات میں کامیابی کے بعد جب تم نے یونیورسٹی میں پڑھانا شروع کر دیا تو تمہارا لیکچر ختم ہونے کے بعد ہم میں سے کوئی ایک تم سے ملنے کے لیے آ جاتا اور جھوٹی سچی کہانیاں سنا کر تمہاری ہمدردیاں حاصل کرنے کی کوشش کرتا یا پھر ہم تمہارے پاس بیٹھ کر اس قسم کی گفتگو کرتے جس کو سن کر تمہارے دل میں عروہ اور محسن کو لے کر فضول قسم کے خیالات آ جا کر ہوتے۔ ہماری گھٹیا گفتگو کا مقصد یہی ہوتا تھا کہ اگر تم ان دونوں کے درمیان تعلق کے حوالے سے اگر کچھ نہیں سوچتے تو سوچنا شروع کر دو۔ شروع شروع میں تم ہماری باتوں میں کچھ خاص دلچسپی نہیں لیتے تھے مگر آہستہ آہستہ تم نے ہماری گفتگو میں دلچسپی کینی شروع کر دی۔ تم ہمارے جال میں پھنسنے لگے اور تم نے تصویر کو اسی رخ سے دیکھنا شروع کر دیا جس رخ سے ہم تمہیں دکھانا چاہ رہے تھے۔ تم آرٹ گیلری جاتے تو ہم میں سے کوئی نہ کوئی پہلے سے وہاں موجود ہوتا اور تم سے تمہاری تصویروں کی نمائش کے سلسلے میں بات کرتا اور ہم تمہیں دیر تک رکنے پر مجبور کرتے۔ ہم نے اپنے ساتھ باہر کے کچھ لوگ بھی شامل کر لیے تھے تاکہ تمہیں کسی پر شک نہ ہو۔ تمہارے والد صاحب کا یہی



حکم تھا کہ ہم تمہیں دیر تک گھر سے باہر رکھنے پر مجبور کریں اور پھر ایک روز تم نے شک کی آگ میں جل کر اپنا سب کچھ ختم کر ڈالا۔“

حادثہ یہ سب کہنے کے بعد خاموش ہو گیا تھا۔ اس کی گردن جھکی ہوئی تھی۔ وہ انتظار کرتا رہا کہ موسیٰ اس پر اپنا غصہ نکالے۔ اسے برا بھلا کہے مگر کچھ دیر تک آواز نہ آئی۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا تو موسیٰ وہاں پر نہیں تھا۔ حادثہ سمجھ گیا تھا کہ اب وہ اپنے باپ سے جواب طلبی کرے گا۔ مگر اسے کوئی پچھتاوا نہیں تھا۔ اس کے ضمیر پر چند برسوں سے جو بوجھ تھا اس نے اس روز وہ بوجھ اتار دیا تھا۔ اب وہ مطمئن انداز میں اپنے گھر کی طرف جا رہا تھا۔

موسیٰ نہایت تیزی سے گاڑی چلا جا رہا تھا۔ اس کا رخ اپنے گھر کی جانب تھا۔ اس کے دماغ میں آندھیاں چلنے لگیں تھیں۔ اپنے باپ کے بارے میں سوچ کر اس کا دماغ بھٹنے لگا تھا۔ وہ اس لمحے بہت ٹوٹا اور بکھرا ہوا تھا۔ اس نے اپنی گاڑی ایک نسبتاً کم رش والی جگہ پر کھڑی کر لی تھی۔ اسٹیئرنگ پر دونوں ہاتھ مضبوطی سے جمائے وہ سامنے کا منظر دیکھ رہا تھا۔ اسے سب کچھ دھندلا دھندلا سا لگ رہا تھا مگر شاید منظر تو ابھی واضح ہوا تھا۔ اسے اپنے باپ سے بھلائی کی کوئی امید تو پہلے بھی نہیں تھی مگر پھر بھی وہ سمجھتا تھا کہ اس کے باپ کو جب موسیٰ کی اولاد کی خوش خبری ملے گی تو وہ موسیٰ کو معاف کر دے گا مگر یہ خوش خبری بھی اس کے باپ کے پتھر دل کو موم نہیں کر سکی۔ حادثہ کے ان انکشافات کے بعد وہ اپنے باپ کے لیے اپنے دل میں نفرت کے علاوہ کوئی دوسرا جذبہ محسوس نہیں کر رہا تھا۔ وہ ان سے ملنا تو درکنار وہ ان کی شکل تک نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ ملک حیات ان دنوں اپنے ایک بزنس ٹور کے سلسلے میں ملک سے باہر تھے اور موسیٰ کے لیے یہی بہتر تھا کہ اس وقت اس کا اپنے باپ سے سامنا نہ ہو۔ اسے رہ رہ کر عروہ اور اپنے ہونے والے بچے کا خیال آ رہا تھا۔ اس لمحے موسیٰ کو اپنے آپ سے بے انتہا نفرت محسوس ہو رہی تھی۔ شک کی آگ میں جل کر اس نے محسن جیسے دوست کو بھی کھو دیا تھا۔ اب اس کی گاڑی کا رخ عروہ کے گھر کی طرف تھا۔ اتنے برسوں بعد وہ دوبارہ سے انہی راستوں پر جا رہا تھا۔ وہ بہت خوف زدہ تھا کہ نہ جانے وہ لوگ اس کے ساتھ کیا سلوک کریں۔ مگر وہ ہر قسم کے رد عمل کے لیے تیار تھا۔ وہاں پہنچ کر جو کچھ اس نے عروہ اور اپنے بچے کے متعلق سنا تو اس کا دل چاہا کہ وہ وہیں کہیں ڈوب کر مر جائے۔ اسے لگا کہ اس کے اندر سے جان نکلتی جا رہی ہے۔

☆.....☆

”تم مسلمان ہو؟“ یہ وہ پہلا سوال تھا جو عبداللہ نے پیٹر سے براہ راست پوچھا تھا۔ ورنہ ان دونوں کے درمیان برائے نام ہی گفتگو ہوتی تھی۔

عبداللہ کا زیادہ تر وقت عبادت میں گزرتا تھا۔ وہ ایک نہایت کم گو قسم کا آدمی تھا۔

”نہیں..... ہاں۔“ پیٹر نے ادھور سا جواب دیا۔

”نام کیا ہے تمہارا؟“ ایک اور سوال کیا گیا۔

”پیٹر..... نہیں..... عبداللہ۔“ پیٹر نے ایک اور نام مکمل جواب دیا۔

”اس کا مطلب ہے مسلمان تو ہو مگر مسلمان ہونے سے ڈرتے ہو۔ اللہ کا بندہ بننے سے خوف زدہ ہو۔“ عبداللہ نے نہایت محبت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ پیٹر عبداللہ کی طرف مکمل طور پر دیکھنے سے اکثر پرہیز ہی کرتا تھا۔ کیونکہ اسے لگتا تھا کہ عبداللہ کی آنکھوں سے کچھ عجیب سی روشنیاں نکلتی ہیں جو

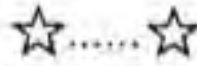


اسے جلا کر رکھ کا ڈھیر بنا دیں گی اور رکھ کا ڈھیر تو وہ شاید بن ہی چکا تھا۔ وہ پچھلے کئی دن سے عبداللہ کے اپارٹمنٹ میں تھا۔ مسجد سے ملحقہ یہ ایک چھوٹا اپارٹمنٹ تھا جہاں عبداللہ اکیلا ہی رہتا تھا۔ وہ جب مسجد جاتا تھا تو پیٹر کو ہدایت کر کے جاتا تھا کہ وہ اندر سے دروازہ لاک کر لے۔ عبداللہ کا کچھ قیمتی سامان بھی اپارٹمنٹ کے اندر ہی تھا۔ پیٹر چاہتا تو وہاں سے کوئی بھی چیز چوری کر کے آرام سے بھاگ سکتا تھا۔ مگر اس نے ایسا کچھ نہیں کیا تھا۔ کچھ تھا جو ایسا کرنے سے روک رہا تھا۔ اتنے دنوں سے اس نے شراب کی شکل تک نہیں دیکھی تھی۔ عبداللہ کے ساتھ پیٹر میں جو مثبت تبدیلیاں آرہی تھیں وہ اسے بہت حیران کر رہی تھیں۔

نہ جانے اس کے لہجے میں ایسا کیا جادو تھا کہ پیٹر کو اس کے سامنے اپنا پورا وجود تحلیل ہوتا ہوا محسوس ہوا۔ اس کے وجود کے اندر جو برا انسان موجود تھا وہ اب باہر نکل چکا تھا۔ اب وہ پیٹر نہیں رہا تھا بلکہ محمد عبداللہ بن چکا تھا اور صرف اس کا نام نہیں بلکہ اس کی پوری شخصیت کا رخ ہی بدل چکا تھا۔ وہ شخص عبداللہ ایک استاد تھا اور محمد عبداللہ اس کا ایک نالائق شاگرد تھا جسے لفظ اسلام کا حقیقی مطلب بھی نہیں معلوم تھا بس اسے اپنے رب کا حقیقی بندہ بننا تھا اور عبداللہ نے اسے وہی راستہ دکھانا تھا جس پر چل کر وہ نہ صرف ایک اچھا مسلمان بلکہ ایک اچھا انسان بھی بن سکتا تھا۔ عبداللہ نے اسے وضو کرنا سکھایا تھا اور زندگی کے اس پہلے وضو نے نہ صرف اس کے جسمانی اعضاء بلکہ اس کے گناہوں تک کو دھو ڈالا تھا۔ محمد عبداللہ نے پہلی بار قرآن پڑھا تھا جیسے جیسے وہ قرآنی آیات کو پڑھ اور سمجھ رہا تھا ویسے ویسے اس کے ذہن میں پڑی بند گریں کھلتی جا رہی تھیں۔ روشنیوں کے غول کے غول اس کے دل و دماغ میں داخل ہو رہے تھے اور برسوں سے تاریکیوں میں پڑا اس کا ذہن اسلام کی روشنیوں سے منور ہو چکا تھا۔ عبداللہ نے صرف اسے اسلامی عبادات سے ہی متعارف نہیں کروایا تھا بلکہ اسے لوگوں کی مدد کرنے کا بھی درس دیا تھا۔ اسے سمجھایا تھا کہ اگر رب کو راضی رکھنا ہے تو اس کے بندوں کی خدمت کرو۔ ضرورت مندوں کی مدد کرو۔ رب خود بخود راضی ہو جائے گا۔ عبداللہ نے اسے صبر و رضا کا درس بھی دیا تھا اور وہ ایک اچھے شاگرد کی طرح اپنے استاد کے بڑھائے ہوئے تمام اسباق کو ذہن نشین کرتا جا رہا تھا۔ اب وہ عبداللہ کے ساتھ مسجد میں بھی کچھ وقت ضرور گزارتا تھا۔ اس نے داڑھی رکھ لی تھی اور اس کے سرخ و سفید چہرے پر داڑھی لگتی بھی بہت خوب صورت تھی۔ عبداللہ نے اسے اذان بھی یاد کروادی تھی اور تھوڑے ہی عرصے میں وہ بہت اچھی اذان دینا سیکھ گیا تھا۔ وہ اب ظاہری اور باطنی طور پر اتنا بدل گیا تھا کہ اس کے ملنے والوں میں سے کوئی بھی اسے پہلی نظر میں نہیں پہچان سکتا تھا۔ وہ اس علاقے میں محمد عبداللہ کے نام سے ہی جانا جاتا تھا۔ اس کی تربیت مکمل ہو چکی تھی۔ اب اسے واپس جانا تھا۔ وہ واپس نہیں جانا چاہتا تھا مگر اس کے استاد کا حکم تھا کہ اب اسے اپنے گھر والوں کے پاس واپس جانا چاہیے۔ کیوں کہ انہیں اب اس کی بہت ضرورت ہے۔ بالآخر وہ دن آ ہی گیا جب اسے وہاں سے کوچ کرنا تھا۔ اپنے استاد محترم سے اجازت لینے کے بعد محمد عبداللہ اب ایک بار پھر سے اپنے پرانے ملنے والوں کے درمیان جا رہا تھا۔ اسے اب میتھیو سے کوئی خوف نہیں تھا کیوں کہ اب اس کا دل ہر قسم کے خوف سے آزاد ہو چکا تھا۔ اب اس کے دل میں اپنے رب کے علاوہ کسی کا کوئی خوف نہیں تھا۔ سڈنی پہنچتے ہی اسے ماندہ کے مرنے کی خبر ملی جو اس کے لیے ایک بہت بڑا صدمہ تھا۔ اسے پتا چلا کہ اس کی بیٹی سائرہ اپنے ماموں کے ساتھ واپس پاکستان جا رہی ہے اور



اس سلسلے میں وہ ایئر پورٹ پہنچا۔ اسے سائزہ کو واپس اپنے گھر لانا تھا اور یہ حقیقت تھی کہ وہ اپنی اس بیٹی کے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ ایئر پورٹ پر اسے سائزہ اپنے ماموں کے ساتھ لاؤنج میں نظر آگئی تھی۔ محمد عبداللہ کا بدلا ہوا روپ دیکھ کر سائزہ نے کوئی مزاحمت نہیں کی اور وہ اپنے باپ کے صرف ایک دفعہ کہنے پر اس کے ساتھ واپس آگئی۔ اب کی بار محمد عبداللہ کے گھر میں ایک سنانے کا راج تھا مگر سائزہ کو اپنے باپ کی شخصیت کا یہ بدلاؤ بہت اچھا لگا تھا۔ وہ اب پیٹر نہیں بلکہ محمد عبداللہ تھا۔ یہ بات بھی اس کے لیے بہت اطمینان کا باعث تھی۔ اس کے باپ کا صرف ظاہر ہی نہیں بلکہ باطن بھی بدلا تھا۔ جس کا اندازہ اسے چند ہی دنوں میں ہو گیا تھا۔ زندگی ایک بار پھر اپنے معمول پر آگئی تھی۔



دولت کمانا ہی جب انسان کی زندگی کا مقصد بن جائے تو پھر اسے اس بات کی کوئی پروا نہیں رہتی کہ یہ دولت کس طرح سے اسے حاصل کرنی ہے۔ وہ حلال اور حرام میں تمیز کرنا بھول جاتا ہے۔ کسی بھی ناجائز کام کو کرنے میں اسے کسی قسم کی کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں ہوتی۔ ایسا ہی کچھ اشرف مسیح نے کیا تھا۔ ایک نو مولود کو اس کے اپنوں سے جدا کر کے اس نے پیسہ تو خوب کما لیا تھا مگر اخلاقی لحاظ سے وہ پست ترین درجے پر چلا گیا تھا۔ اب اسے اس نوکری کی ضرورت بھی نہیں رہی تھی۔ مگر اتنی جلدی نوکری چھوڑنا بھی اسپتال میں اپنی ساکھ خراب کرنے والی بات تھی۔ کیوں کہ اسپتال انتظامیہ بچہ اغوا ہونے کے بعد ہر ملازم کو شک کی نظر سے دیکھ رہی تھی اور گائنی وارڈ کے ملازمین سے تو روزانہ ہی پوچھ گچھ کی جاتی تھی جس خاندان کے بچے کو اغوا کیا گیا تھا وہ لوگ درمیانے طبقے سے تعلق رکھتے تھے اور معاشرتی طور پر کچھ خاص اثر و رسوخ کے مالک نہیں تھے۔ اس لیے کہیں بھی ان کی شنوائی نہیں ہو رہی تھی۔ اس صورت حال کا اسپتال انتظامیہ نے فائدہ اٹھایا اور بچہ اغوا ہونے کا سارا ملبہ اس کے گھر والوں پر ڈال دیا۔ یہ اسپتال کی ساکھ کا بھی معاملہ تھا کیوں کہ اگر یہ بات ثابت ہو جاتی تو اسپتال کی شہرت کو ناقابل تلافی نقصان پہنچتا اس لیے اسپتال کی انتظامیہ نے بہتر یہی سمجھا کہ ساری ذمہ داری بچے کے گھر والوں پر ڈال دی جائے وہ لوگ تھوڑا سا داویلا مچا کر آخر کار خاموش ہو کر بیٹھ گئے۔ کچھ ماہ بعد جب اس سارے واقعے کی گرد بیٹھ گئی تو اشرف مسیح نے سکھ کا سانس لیا کیوں کہ اس تمام عرصے کے دوران اسے اپنی جان سولی پر لٹکی محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے سب کو مطمئن تو کر دیا تھا مگر ایک عجیب سا خوف ہر وقت اس کے اندر موجود رہتا تھا۔ اب صورت حال معمول پر آگئی تھی تو اس نے بھی بہتر یہی سمجھا کہ وہ استعفیٰ دے دے۔ اس نے نہ صرف استعفیٰ دیا بلکہ وہ شہر بھی چھوڑ دیا۔ وہ ایک دوسرے شہر جا کر رہنے لگا تھا۔ وہاں پر اس نے کپڑے کی ایک بہت بڑی دکان کھول لی تھی۔ یہ اس کی پسند کا کام تھا اور اس کام میں اس کی بیوی بھی اس کی مدد کر دیا کرتی تھی۔ اپنے دونوں بچوں کو اس نے شہر کے ایک بہترین اسکول میں داخل کر دیا۔ ایک اچھا گھر اور گاڑی اس کا خواب تھا اور وہ خواب بھی پورا ہو گیا۔ اس کی دکان بھی چل نکلی تھی تھوڑے ہی عرصے میں اس نے کچھ ملازمین بھی رکھ لیے تھے۔ وہ ایک مطمئن اور خوش حال زندگی گزار رہا تھا۔ اب تو اس کے دل سے یہ احساس بھی مٹ چکا تھا کہ اس نے یہ سب کچھ ایک گناہ کے عوض حاصل کیا تھا اور گناہ بھی ایسا جس نے ایک معصوم کو ہمیشہ کے لیے اس کے اپنوں سے دور کر دیا تھا اور یوں لگتا تھا کہ خدا نے اس کی رسی بھی دراز کر دی تھی اور اس کی دولت میں کمی ہونے کے بجائے اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے جانے کتنے برس گزر گئے۔ اب وہ



اس معاشرے کا ایک معزز فرد تھا۔ اس کے دونوں بچوں اسکول سے نکل کر کالج کی آزاد فضاؤں میں پہنچ چکے تھے مگر دولت کی فراوانی نے اس کے بچے کو کچھ ضرورت سے زیادہ ہی عیاش پسند بنا دیا تھا۔ اپنے باپ کی دولت کو دونوں ہاتھوں سے اڑانا وہ اپنا فرض سمجھتے تھے۔ کالج میں ان دونوں کی شہرت بھی اچھی نہیں تھی۔ آئے روز ان کے اساتذہ کی طرف سے شکایات اشرف مسیح کو ملتی رہتی تھیں۔ وہ بچوں کی وجہ سے بہت پریشان رہنے لگا تھا کہ ایک روز اس کی دکان میں اچانک سے آگ بھڑک اٹھی اور اس کا کروڑوں کا مال جل کر خاکستر ہو گیا۔ اپنے اس بنے بنائے کاروبار کی تباہی دیکھ کر اس کا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ وہ اور اس کی بیوی دونوں اس صدمے سے سنبھل نہیں پائے تھے کہ اس کے بیٹوں نے اس کے دل کو ایک اور صدمہ پہنچایا۔ اس کے دونوں بیٹے چوری کی ایک واردات کرتے ہوئے پکڑے گئے تھے۔ پولیس کے ذریعے اسے پتا چلا کہ اس کے بیٹے پولیس کو پہلے بھی کچھ وارداتوں میں مطلوب تھے۔ اس نے ایک وکیل کیا مگر کچھ فائدہ نہیں ہوا۔ اس کے دونوں بیٹوں کو عمر قید کی سزا سنائی گئی۔ اشرف مسیح کا شاندار خواب بہت بری طرح ٹوٹ چکا تھا۔ زندگی میں اس نے سب کچھ حاصل کر لیا تھا مگر اب اس کے ہاتھ خالی تھے۔ وہ اور اس کی بیوی اب دوبارہ سے اپنے پرانے شہر آ گئے تھے۔ جہاں اس کے سارے پرانے جاننے والے تھے جن سے اس نے تقریباً تعلق ختم کر لیا تھا مگر اب وہی لوگ اس کے کام آرہے تھے۔ بے درے اتنے صدمات جھیلنے کے بعد اب اس کو زندگی میں کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ اس کی بیوی کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں رہتی تھی۔ خاکروب کا کام چھوڑے اسے عرصہ ہوا تھا۔ وہ نہیں سمجھتا تھا کہ اب وہ کام دوبارہ سے کر سکے گا، اس کے ایک جاننے والے نے اسے اپنی دکان پر اپنے ساتھ بٹھانا شروع کر دیا تھا۔ وہ بہت بوڑھا ہو چکا تھا اور اس کی یادداشت بھی اب آہستہ آہستہ اس کا ساتھ چھوڑتی جا رہی تھی مگر برسوں پہلے کا وہ واقعہ اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ اسے ازبر تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ جو کچھ اس کے ساتھ ہوا ہے یہ مکافات عمل ہے۔ یہ اس کے اعمالوں کی وہ سزا ہے جو اسے دنیا میں ہی مل گئی ہے۔ وہ اپنے خدا سے اپنے گناہوں کی معافی مانگ مانگ کر تھک گیا تھا مگر اس کے دل کو کسی صورت قرار نہیں آتا تھا۔ ایک روز اسے اپنے دل کی بے چینی کا سبب سمجھ میں آ ہی گیا۔ جب وہ اپنے گھر میں اپنی بیوی کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ اچانک سے دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے دروازہ کھولا تو ایک خوش شکل نوجوان اس کے سامنے کھڑا تھا۔ اس لڑکے کی حالت ٹھیک نہیں لگ رہی تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ جیسے وہ کئی راتوں سے سو نہیں پایا ہو۔ اس نے اشرف مسیح سے جو کچھ پوچھا تھا اس نے اشرف مسیح کو واقعی میں بہت حیران کر دیا تھا۔

☆.....☆

یہ ایک معمولی رقبے پر پھیلا ہوا ایک درمیانے درجے کے علاقے کا قبرستان تھا جو کہ اپنی خستہ حالی پر نوحہ کناں تھا۔ قبرستان کے ارد گرد نا جائز تجاوزات کی بھرمار تھی۔ ان لوگوں کا بس چلتا تو شاید قبرستان کے اندر بھی اپنے چائے، پان کے کھونکھے سجالیتے مگر جس تیزی سے تجاوزات کی تعداد میں اضافہ ہو رہا تھا اسے دیکھ کر لگتا تھا کہ مستقبل قریب میں شاید تجاوزات کا دائرہ قبرستان کے اندر تک وسیع ہو جائے۔ اس قبرستان میں موجود قبروں کی حالت بھی اتنی اچھی نہیں تھی۔ قبرستان کے ایک کونے کو چند عادی نشی افراد نے اپنا مسکن بنایا ہوا تھا۔ وہاں کتوں اور بلیوں کی بہتات تھی اور صفائی کا انتظام انتہائی ناقص تھا۔ موسیٰ کا تعلق جس طبقے سے تھا ان لوگوں کے قبرستان بھی بہت شاندار تھے۔ خود موسیٰ کی ماں کی قبر بھی ایسے ہی



ایک قبرستان میں تھی۔ موسیٰ اس قبرستان میں جس سے ملنے کے لیے آیا تھا۔ وہ کبھی اس کے دل کے بہت قریب تھی مگر پھر شک کی آگ میں جل کر موسیٰ نے سب کچھ برباد کر ڈالا تھا اور جب وہ اس لڑکی سے معافی مانگنے آیا تو پتا چلا کہ وہ تو دنیا چھوڑ کر چلی گئی اس نے موسیٰ کا انتظار بھی نہیں کیا اور چپ چاپ بغیر کچھ کہنے سے ایک نئے سفر پر روانہ ہو گئی۔ موسیٰ کو تھوڑی سی تلاش کے بعد عروہ کی قبر مل ہی گئی۔ موسیٰ کے ساتھ عروہ کا چھوٹا بھائی تھا۔ جس نے موسیٰ کو عروہ کے بارے میں سب کچھ بہت تفصیل سے بتا دیا تھا۔ جسے سن کر موسیٰ کو خود سے نفرت محسوس ہونے لگی تھی۔ وہ عروہ کو تو واپس نہیں لاسکتا تھا مگر اس کی قبر کے پاس بیٹھ کر اس کے سامنے آنسوؤں کا نذرانہ تو پیش کر سکتا تھا اور اس روز وہ بہت دیر تک بیٹھ کر یہی کرتا رہا۔ وہ جب قبرستان سے واپس آ رہا تھا تو اس کے ذہن میں صرف اور صرف اپنے بچے کا خیال تھا۔ جو نہ جانے کن ہاتھوں میں پرورش پا رہا ہوگا۔ عروہ کے چھوٹے بھائی نے اسے بتایا تھا کہ عروہ کا بیٹا پیدائش کے چند گھنٹے بعد ہی اغوا ہو گیا تھا۔ ان سب لوگوں نے بہت شور مچا پھر اسپتال کی انتظامیہ نے اسے ایک حادثہ قرار دے دیا اور اسپتال کے ملازمین سے بھی زیادہ پوچھ گچھ نہیں کی۔ ہم لوگوں نے تھا۔ نے میں ایف آئی آر کٹوائی مگر ہماری کوئی شنوائی نہیں ہوئی۔ نتیجے کے طور پر ایک روز ہم بھی تھک ہار کر بیٹھ گئے۔ موسیٰ کو اس سارے معاملے میں صرف اور صرف اپنا قصور نظر آیا۔ وہ اس کیس کو حل کرنا چاہتا تھا۔ اس کے پاس پیسہ بھی تھا اور اثر و رسوخ بھی بے تحاشا تھا جس کے ساتھ اسے امید تھی کہ وہ اپنے بیٹے کو ڈھونڈ لے گا۔

☆.....☆

ویسٹ میڈ اسپتال سڈنی کی ایمر جنسی میں موجود نواز شاہ کی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ ان کو بہت زیادہ چوٹیں آئی تھیں۔ ایک مختصر سے آپریشن کے بعد ان کو ہوش آ تو گیا تھا مگر ڈاکٹرز نے ان کی حالت کو سلی بخش قرار نہیں دیا تھا۔ انہوں نے کچھ دیر کے لیے اپنے بیٹے علی کو اپنے پاس بلا دیا تھا۔ علی ان کے پاس آ کر بیٹھ گیا تھا۔ اپنے باپ کو اس طرح دیکھ کر اسے بھی اپنے جذبات پر قابو نہ رہا تھا۔ وہ انہیں بولنے سے منع کر رہا تھا مگر نواز شاہ تو اس لمحے اپنے دل پر پڑے نہ جانے کون کون سے بوجھ ہلکے کر رہے تھے۔

”علی! برسوں پہلے میں اور میری بیوی صاعقہ اولاد کے نہ ہونے کی وجہ سے پریشان تھے۔ ڈاکٹرز نے بھی صاعقہ کو صاف جواب دے دیا تھا کہ وہ کبھی بھی ماں نہیں بن سکے گی۔ میں نے اپنی اس محرومی پر کسی نہ کسی طرح صبر کر لیا تھا مگر صاعقہ ہر وقت روتی رہتی تھی۔ میں بچہ گود لینے کے حق میں نہیں تھا۔ میرا خیال تھا کہ ایسے بچے بڑے ہو کر اپنے والدین کے لیے بہت مشکلات کھڑی کر سکتے ہیں۔ صاعقہ کے روز روز کے رونے سن کر میں بھی بہت پریشان ہو جاتا تھا۔ ایک روز میں اپنے آفس سے تھکا ہارا گھر آیا تو صاعقہ کو اسی طرح روتے ہوئے دیکھا، میں غصے میں گھر سے باہر نکل آیا اور اپنی گاڑی کو بغیر سوچے سمجھے ادھر ادھر گھماتا رہا۔ میرا دل بہت ادا اس تھا۔ میں کسی ایسی جگہ چلے جانا چاہتا تھا۔ جہاں پر مجھے سکون ملے۔ اچانک میری نظر ایک اسپتال پر پڑی اور میں نے اپنی گاڑی اسی اسپتال کے سامنے پارک کر دی۔ ایک عجیب سے جذبے کے تحت میں اس اسپتال کے گائنی وارڈ میں چلا آیا اور انتظار گاہ میں ایسے آ کر بیٹھ گیا جیسے اندر ڈیلیوری روم میں میری بیوی موجود ہو اور تھوڑی ہی دیر میں نرس آ کر مجھے ایک بچہ پکڑا دے گی۔ اس انتظار گاہ میں، میں نے لوگوں کے چہروں پر خوشی کے بہت سے رنگ دیکھے تھے۔ نرس باہر آ کر جب کوئی نرم سا وجود کسی مرد کی گود میں تھماتی تھی تو اس لمحے اس مرد کے چہرے پر جو رونق آ جاتی تھی اس خوشی کو کوئی نام نہیں

READING  
Section



دیا جاسکتا تھا۔ میں کچھ دیر وہاں بیٹھ کر پھر وہاں سے چلا آیا۔ راستے میں، میں نے صاعقہ کے لیے بہت سے تحفے خریدے۔ اس دن اس اسپتال میں کچھ وقت گزار کر جیسے میری ساری پریشانی دور ہو گئی تھی اور میرے چہرے کی رونق لوٹ آئی تھی۔ میں نے صاعقہ کو یقین دلایا تھا کہ میں اس کو کبھی بھی اداس نہیں ہونے دوں گا۔ اب میں روزانہ آفس سے گھر آنے کے بجائے اسپتال کی انتظار گاہ میں جا کر بیٹھ جاتا تھا۔ میرا شیطانی ذہن ان دنوں ایک نئے منصوبے کی پیوند کاری میں مصروف تھا۔ میرے پاس روپے پیسے کی کوی کمی نہیں تھی اور صاعقہ سے بڑھ کر مجھے کچھ بھی عزیز نہیں تھا۔ اپنے گھناؤنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے میں نے اس وارڈ میں ایک صفائی کرنے والے ملازم کو اپنے ساتھ ملا لیا تھا۔ میں اس ملازم کو اس کام کے عوض ایک اچھی رقم آفر کر رہا تھا۔ اس لیے کچھ دیر انکار کرنے کے بعد وہ رضامند ہو گیا تھا اور پھر ایک رات میرا مقصد پورا ہو گیا اور میں نے علی تمہیں حاصل کر لیا۔ میں تمہارا ننھا مناسا وجود لے کر خوشی خوشی صاعقہ کے پاس گیا۔ جب میں نے تمہیں اس کی گود میں پکڑا یا تو اس کو تو گویا زندگی مل گئی۔ تمہیں پا کر اس کا پورا وجود جیسے ہواؤں میں اڑتا پھرتا تھا۔ اس کو اس طرح خوش دیکھ کر میں بہت پرسکون ہو گیا تھا مگر اندر ہی اندر ایک گناہ کا احساس مجھے بری طرح کاٹ رہا تھا۔ میں نے اسے یہی بتایا تھا کہ میں نے تمہیں یتیم خانے سے حاصل کیا ہے۔ سچ بولنے کی ہمت مجھ میں نہیں تھی۔ تمہارے ہماری زندگی میں آنے سے ہمارا خاندان مکمل ہو گیا تھا مگر صاعقہ کی زندگی نے وفا نہیں کی اور تمہاری پہلی سالگرہ کے کچھ دن بعد ہی وہ ہمیں ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر چلی گئی۔ صاعقہ کے جانے کے بعد میں بہت اکیلا رہ گیا تھا۔ مجھے ہر وقت یہ دھڑکا لگا رہتا تھا کہ کہیں کوئی تمہیں مجھ سے چھین نہ لے۔ میں نے اپنا سارا کاروبار آہستہ آہستہ آسٹریلیا منتقل کرنا شروع کر دیا اور ایک روز میں تمہیں لے کر ہمیشہ کے لیے سڈنی منتقل ہو گیا۔ یہاں آ کر اب میرے دل کو یہ اطمینان تھا کہ کوئی تمہیں مجھ سے چھین نہیں سکے گا۔ میرے والدین حیات نہیں تھے اور اکلوتی اولاد ہونے کی وجہ سے میں تھوڑا مغرور ہو گیا تھا۔ آسٹریلیا آنے کے بعد میں ویسے بھی اپنے یا صاعقہ کے کسی رشتے دار سے کوئی تعلق قائم نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ اب میری زندگی کا مقصد تمہاری اچھی اور بہتر پرورش کرنا تھا اور علی تم میری توقع سے بڑھ کر فرمانبردار اور ذہین ثابت ہوئے ہو۔ تم سن رہے ہو نا علی میں جو کچھ کہہ رہا ہوں۔

نواز جن کی حالت کچھ دیر کو سنبھلی تھی اور انہوں نے اس تھوڑی سی مہلت کو جو انہیں قدرت کی طرف سے ملی تھی، غنیمت جانتے ہوئے علی کو وہ سب کچھ بتا دیا جو وہ عام دنوں میں بتانے کا کبھی تصور بھی نہیں کر سکتے تھے مگر اب جب موت سے ان کی آنکھیں چار ہوئی تھیں تو انہوں نے علی کو حقیقت بتا دینے کا فیصلہ کیا تھا۔ اتنا سب کچھ کہہ دینے کے بعد اب ان کی سانسیں بہت بری طرح اکھڑنے لگی تھیں۔

”علی..... علی..... میرے پاس آؤ میرے بیٹے۔“

وہ علی کو بلارہے تھے مگر علی ان سے چند قدموں کے فاصلے پر کھڑا نہیں نفرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ ایمر جیسی سے باہر چلا گیا تھا۔ ڈاکٹرز نے ایک بار پھر مختلف طریقوں سے ان کی جان بچانے کی کوشش کی مگر اس بار ان کی کوئی کوشش بار آور ثابت نہ ہوئی اور نواز شاہ نے اپنی جان، جان آفرین کے سپرد کر دی۔ اسپتال انتظامیہ نے مختصر سی کارروائی کے بعد ان کا جسد خاکی علی کے حوالے کر دیا۔ وہ کوئی معمولی آدمی نہیں تھے، ان کا شمار سڈنی کے اچھے کاروباری افراد میں کیا جاتا تھا۔ اس لیے ان کی تدفین



www.Paksociety.com

کے موقع پر ان کے کاروباری دوستوں کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔ ان سب کا یہی خیال تھا کہ اب وہ کاروبار علی ہی سنبھالے گا مگر اس کا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ وہ ابھی صدے سے زیادہ حیرانگی کی کیفیت میں تھا۔ اسے نواز شاہ کی بے حسی اور خود غرضی پر بہت غصہ تھا۔ وہ جو کچھ ان کے لیے محسوس کر رہا تھا وہ نفرت سے بہت آگے کی چیز تھی۔ اب اسے اپنا سراغ لگانا تھا، وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ ایسا کر پائے گا یا نہیں مگر ایک کوشش تو اسے کرنی تھی۔

☆.....☆

موسیٰ حیات کے لیے اپنے بیٹے کی تلاش کوئی آسان کام نہیں تھا۔ یہ اندازہ اسے چند ہی دنوں میں ہو گیا تھا کہ اپنے بیٹے کو ڈھونڈنے کے لیے اسے بہت زیادہ محنت کرنی پڑے گی مگر وہ بہت پر عزم تھا اس کی زندگی کا بس اب ایک ہی مقصد رہ گیا تھا کہ وہ اپنے جسم کے اس حصے کو تلاش کر کے اپنی ذات کا ادھورا پن مکمل کرے۔ اس سلسلے میں وہ سب سے پہلے اس اسپتال گیا جہاں اس کے بچے کی پیدائش ہوئی تھی مگر اسپتال انتظامیہ نے اس کے ساتھ کچھ خاص تعاون نہیں کیا۔ اس بات کو پانچ سال کا عرصہ گزر چکا تھا اور پانچ سال پہلے اسپتال میں کام لینے والے ملازمین کی اکثریت کام چھوڑ چکی تھی اور جو چند ایک تھے انہوں نے اس واقعے سے لاعلمی کا اظہار کیا تھا۔ موسیٰ نے پولیس کی مدد بھی حاصل کی تھی جس کا اسے فائدہ ہو رہا تھا مگر پھر بھی کوئی واضح سراغ ابھی تک اسے مل نہیں سکا تھا۔ اسپتال کے پرانے ملازمین سے بھی اس نے تفتیش کی تھی چند اسی شہر میں تھے جب کہ کچھ شہر چھوڑ کر جا چکے تھے۔ موسیٰ نے پیسہ پانی کی طرح بہا دیا تھا۔ وہ جب اپنے ماضی کی طرف نظر دوڑاتا تھا تو سوائے شرمندگی کے اس کے ہاتھ کچھ نہیں آتا تھا۔ اس کے باپ نے اس سے رابطے کی بہت کوشش کی مگر موسیٰ اب اپنے باپ کی شکل تک دیکھنے کا روادار نہیں تھا۔ وہ فی الحال صرف اپنے بیٹے کو تلاش کرنا چاہتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ کچھ اور سوچنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ وہ اپنے بیٹے کو ڈھونڈنے ہر جگہ گیا مگر ہر جگہ ناکامی ہی اس کا مقدر بنی ایک بار ایک ملازم کے ذریعے اسے پتا چلا کہ اسپتال کا ایک پرانا ملازم اس کے بیٹے کے اغوا میں ملوث ہے مگر اب وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ وہ ملازم ان دنوں کہا ہے۔ موسیٰ نے پولیس کی مدد سے اس پرانے ملازم کو ڈھونڈنے کی کوشش کی مگر لگتا تھا قدرت ابھی اس کا مزید صبر آزمانے کے موڈ میں تھی اس شخص کا کوئی واضح سراغ نہیں مل سکا۔ اس لا حاصل سی جدوجہد کے بعد موسیٰ جیسے تھک سا گیا تھا۔ ایک روز اسے پتا چلا کہ جس باپ سے وہ نفرت کرتا ہے وہ ہمیشہ کے لیے اسے چھوڑ کر چلا گیا ہے۔ ماں کو تو وہ پہلے ہی کھو چکا تھا اب باپ بھی اس سے بہت دور چلا گیا تھا۔ اس کا گھر اجڑ چکا تھا۔ اس کی محبت عروہ بھی اب اس کے ساتھ نہیں تھی۔ بیٹا ملنے سے پہلے ہی پھٹ گیا تھا۔ اپنی قسمت پر سوائے افسوس کرنے کے وہ اور کچھ بھی کیا سکتا تھا۔ باپ کے مرنے کے بعد ساری دولت اب موسیٰ کے نام تھی مگر اسے اس دولت سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اپنی دولت کا ایک بڑا حصہ مختلف فلاحی اداروں کے نام کر کے وہ بیرون ملک منتقل ہو گیا تھا۔ وطن چھوڑنے سے پہلے وہ ماندہ کے گھر والوں سے معافی مانگنا چاہتا تھا مگر وہ لوگ موسیٰ کی شکل تک دیکھنے کے روادار نہیں تھے۔ اسے اتنا تو پتا چل گیا تھا کہ وہ جہاں ہمیشہ کے لیے جا رہا ہے۔ ماندہ بھی وہیں پر ہے وہ اسے وہاں پر ملنا نہیں چاہتا تھا۔ ایک اداس ماندہ کا سامنا کرنے کی اس میں ہمت نہیں تھی۔ وہ سیڈنی میں مستقل طور پر رہائش پذیر ہو گیا تھا۔ اس کی بنائی ہوئی تصویروں کی شہرت پاکستان میں تو پہلے سے تھی اسے یہاں پر بھی اپنے فن سے محبت کرنے والے بہت سے لوگ مل گئے



تھے۔ یہاں کے پاکستانی حلقوں میں اس کی پہچان موجود تھی اس کے بہت سے شناسا پہلے سے سڈنی میں موجود تھے۔ اس لیے موسیٰ کو وہاں رہائش پذیر ہونے میں زیادہ مشکل پیش نہیں آئی اور اس نے وہاں اپنی نئی زندگی کا آغاز کر دیا۔

☆.....☆

نواز شاہ کا یوں اچانک چلے جانا علی کے لیے تکلیف دہ تھا۔ مگر جو انکشافات انہوں نے مرتے وقت علی کے سامنے کیے تھے ان کو سننے کے بعد علی کے لیے زندگی میں کوئی کشش نہیں رہی تھی۔ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس کا باپ اتنا سفاک اور بے رحم ہو سکتا ہے جو محض اپنی خوشیوں کے لیے علی کو اس کے اپنوں سے دور کر دے، علی تو برسوں سے اسی شخص کو اپنا باپ مانتا آیا تھا اور محض چند لمحوں میں وہ اس کے لیے ایک اجنبی بن گیا تھا۔ علی سمجھتا تھا کہ اس کا باپ ایک محبت بھرا دل رکھنے والا انسان ہے مگر اب اسے احساس ہوا تھا کہ جو شخص اسے اپنا باپ کہتا تھا، وہ ایک انتہائی خود غرض انسان تھا، جو بیک وقت کئی انسانوں کا مجرم تھا۔ اس نے نہ صرف علی کو اس کے گھر والوں سے چھینا تھا بلکہ علی کے اصل ماں باپ کو بھی اس کی جدائی کا زخم لگا دیا تھا۔ ایک ایسا زخم جس کا درد انہیں کسی بل چین نہیں لینے دیتا ہوگا۔ علی سمجھتا تھا کہ وہ شخص اگر اسے بے خبر رکھتا، تو زیادہ بہتر ہوتا، اب یہ آدھی ادھوری داستان اسے ضرور بے چین کر رہی تھی۔ اگر وہ شخص زندہ ہوتا تو علی کو اس کے ذہن میں اٹھتے تمام سوالات کے جوابات مل چکے ہوتے مگر اب وہ شخص اس دنیا میں نہیں رہا تھا۔ اب اس کہانی کے دیگر کرداروں کو اسی نے ڈھونڈنا تھا اسے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ وہ اپنی تلاش کا سلسلہ کہاں سے شروع کرے۔ ایک روز وہ اسی طرح پریشان حالت میں اپنے کمرے میں بیٹھا تھا کہ گھر کا ایک پرانا ملازم اس کے پاس آکر گھڑا ہو گیا۔ اس ملازم کے ہاتھ میں ایک فائل تھی جو اس نے علی کے بیڈ کے پاس پڑے ہوئے میز پر رکھ دی۔

”یہ کیا ہے؟“ علی نے فائل کو عجیب نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”یہ نواز شاہ صاحب نے مجھے کئی سال پہلے دی تھی۔ انہوں نے وصیت کی تھی کہ ان کے مرنے کے بعد یہ فائل آپ کو دی جائے؟ ان کی زندگی میں ہم لوگ یہ فائل آپ کو دینے کے پابند نہیں تھے۔“ اس ملازم نے نہایت اطمینان کے ساتھ جواب دیا۔

”کیا ہے اس فائل میں جو اسے اس قدر خفیہ رکھا گیا۔“ علی نے تجسس بھرے لہجے میں پوچھا۔

”یہ آپ خود دیکھ لیں۔ مجھے تو جتنا کہا گیا تھا میں نے اتنا ہی کیا ہے۔“

ملازم نے نہایت فرما بردار لہجے میں جواب دیا۔ اب وہ کمرے سے باہر جا چکا تھا۔ علی نے تجسس بھرے انداز میں فائل کو کھول کر دیکھا۔ یہ ایک نہایت بوسیدہ سی فائل تھی۔ جسے ایک خاکی لفافے میں لپیٹ کر رکھا ہوا تھا۔ فائل کے سرورق سے ہی اندازہ ہو رہا تھا کہ فائل کئی سال پرانی ہے۔ فائل کے اندر چند خطوط پڑے ہوئے تھے جن میں تقریباً وہی باتیں لکھی ہوئی تھیں جو نواز شاہ علی کو بتا چکے تھے۔ علی کے لیے زیادہ اہمیت کی حامل وہ رسیدیں تھیں جن پر اسپتال کا نام پتہ درج تھا اور ساتھ میں کچھ لوگوں کے نام بھی تھے۔ علی سمجھ گیا تھا کہ یہ سب وہ نشانات ہیں جن پر چل کر وہ اپنے گھر والوں تک پہنچ سکتا تھا۔ علی نے نہایت احتیاط سے فائل کو دوبارہ سے اس خاکی لفافے میں منتقل کیا اور اسے اپنی الماری میں رکھ لیا۔ اپنے متعلقہ اتنے انکشافات سن کر جہاں اسے دکھ ہوا تھا وہاں اسے اب اپنے اصل ماں باپ سے ملنے کی بے



چینی بھی تھی۔ وہ جلد از جلد پاکستان کے شہر کراچی جا کر اپنے پیاروں سے ملنا چاہتا تھا اسے یقین تھا کہ وہ انہیں ڈھونڈ نکالے گا۔ وہ اکیلے رہ رہ کر اکتا سا گیا تھا۔ اس لیے اس نے کالج جانا بھی شروع کر دیا تھا مگر اپنے اندر کی تنہائی کو وہ کم نہیں کر سکا تھا۔ اسے سائرہ بھی نظر آتی تھی۔ ایرک کے معاملے میں وہ اب تک سائرہ کو ہی قصور وار سمجھتا تھا۔ سائرہ کے لیے اپنے دل میں وہ محبت اور نفرت کے ملے جلے جذبات محسوس کرتا تھا۔ اس بار اسے وہ بہت خاموش اور کھوئی کھوئی سی لگی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ وہ اپنی ماں کو کھو چکی ہے اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس کا باپ مسلمان ہو چکا ہے۔ سائرہ کی زندگی میں آنے والی ہر تبدیلی سے وہ خود ہی واقف ہو جاتا تھا۔ وہ اس سے بات کرنا چاہتا تھا مگر ایک جھجک سی تھی جو ان دونوں کے درمیان حائل ہو گئی تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے مگر اپنے اپنے دکھوں کو سینوں سے لگائے ان کے خول میں بند ایک دوسرے سے بات کرنے سے گریزاں تھے۔ سائرہ نے تو علی کا عم نہیں بانٹا مگر کیتھی نے اس مشکل گھڑی میں علی کا عم جس طرح بانٹا تھا اس نے علی کی نظروں میں اس کی اہمیت اور مقام کو بہت بڑھا دیا تھا۔ علی وہ وقت کیسے بھول سکتا تھا جب اس کے ٹوٹے اور بکھرتے ہوئے وجود کو کیتھی نے ہی سہارا دیا تھا۔ وہ اب زیادہ تر وقت علی کے ساتھ ہی گزارتی تھی۔ اس کی سلی اور دلا سے بھرے جملوں نے اس کا حوصلہ بہت بڑھایا تھا۔ علی وہ وقت کیسے بھول سکتا تھا جب اس کے ٹوٹے اور بکھرتے ہوئے وجود کو کیتھی نے ہی سہارا دیا تھا۔ خود پر گزرنے والی تمام کیفیات وہ کیتھی کے گوش گزار کر چکا تھا۔ اس نے کیتھی کے علاوہ کسی سے اپنے دل کا حال بیان نہیں کیا تھا مگر یہ بھی حقیقت تھی کہ وہ اپنے دل میں اس لڑکی کے لیے دوستی کے علاوہ کوئی اور جذبہ محسوس نہیں کرتا تھا۔ بہت بار کیتھی کھلے لفظوں میں اس سے اظہار محبت کر چکی تھی۔ وہ اس کی باتوں کو ہر بار نہیں کرنا ل دیا کرتا تھا مگر علی کو اب وہ اپنے معاملے میں ضرورت سے کچھ زیادہ ہی سنجیدہ نظر آنے لگی تھی۔ علی اب اپنے والدین کی تلاش میں کراچی جانے لگا تھا اور کیتھی بھی اس سلسلے میں اس کی ہم خیال تھی۔ علی کو اپنے گھر والوں کو ڈھونڈنے کی بہت بے چینی تھی۔ بالآخر وہ دن آ ہی گیا جب اس نے کراچی شہر میں اپنا پہلا قدم رکھا۔ یہ وہی شہر تھا جہاں کی فضاؤں میں اس نے اپنی پہلی سانس لی تھی۔

☆.....☆

سائرہ اپنے گھر واپس آ گئی تھی۔ اب کی بار گھر میں ماں کے بغیر اسے ایک عجیب سے سناٹے کا احساس ہوا تھا۔ اپنے باپ کے بدلے ہوئے روپ کو دیکھ کر اسے خوشی کے ساتھ ساتھ بہت حیرت بھی ہوئی تھی۔ اس کا باپ اب پیٹر نہیں محمد عبداللہ کہلاتا تھا۔ اس کی شخصیت کا وہ روپ صرف ظاہری ہی نہیں تھا بلکہ وہ باطنی طور پر بھی بہت بدل گیا تھا۔ جس کا اندازہ سائرہ کو چند ہی دنوں میں ہو گیا تھا۔ زندگی رفتہ رفتہ اپنے معمول پر آ گئی تھی۔ سائرہ نے کالج جانا شروع کر دیا تھا۔ اب وہ اپنی پڑھائی پر مکمل توجہ دینا چاہتی تھی۔ صحیح معنوں میں پڑھائی میں یکسوئی اسے اب ہی نصیب ہوئی تھی۔ اسے ابھی بھی میتھیو اور ایرک سے خطرہ محسوس ہوتا تھا مگر ان کی طرف سے ابھی راوی چین ہی چین لکھ رہا تھا۔ علی اسے بہت بار کلاس میں خاموش اور کم صدم سا بیٹھا نظر آتا تھا۔ اسے معلوم ہوا تھا کہ علی کے والد اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ وہ اسے نسلی دینا چاہتی تھی اسے بتانا چاہتی تھی کہ وہ بھی اپنی ماں کے چلے جانے پر ایسے ہی افسردہ ہے مگر جن نظروں سے وہ سائرہ کو دیکھتا تھا۔ ان میں نفرت اور بیگانگی کے کتنے ہی رنگ چھپے ہوئے تھے وہ اس کی ان نظروں سے ڈر جایا کرتی تھی کیتھی کے ساتھ علی کی دوستی ہنوز برقرار تھی بلکہ اب تو اس میں اضافہ ہو گیا تھا۔ ان دونوں کی



بڑھتی ہوئی قربت اسے کچھ اور ہی کہانی سنا رہی تھی۔ سائزہ کے لیے ان دونوں کو ایک ساتھ دیکھنا بہت تکلیف دہ ہوتا تھا۔ انہی دنوں اسے پتا چلا کہ علی کچھ عرصے کے لیے پاکستان گیا ہوا ہے۔ اسے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ علی کا بھی کچھ نہ کچھ تعلق پاکستان سے ہے۔ وہ اپنے امتحانات کی تیاری میں مصروف تھی کہ ایک روز اس کا سامنا ایرک سے ہو گیا۔

سڈنی کے لوگ آرٹ، موسیقی اور رنگوں سے محبت کرنے والے لوگ ہیں۔ یہاں کے مشہور شاپنگ مالز، ہوٹلز اور ریسٹورانٹس میں جا بجا مختلف فن پارے اپنے رنگ بکھیرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہاں کے مختلف آرٹ میوزیم اور آرٹ گیلریوں کی رونق بھی دیکھنے والی ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ یہاں پر جو تہوار منائے جاتے ہیں ان میں بھی نوجوان مصوروں کو موقع دیا جاتا ہے کہ اس موقع پر وہ اپنے فن کا مظاہرہ کریں اور یہاں کی دیواروں، گلیوں اور شاہراؤں کو رنگوں سے بھر دیں۔ موسیٰ جیسے آرٹ سے محبت کرنے والے شخص کے لیے اس شہر میں بہت سے مواقع موجود تھے۔ اسے پڑھانے کا تجربہ تھا سو اسے اس شہر میں بھی نوجوان مصوروں کو پڑھانے اور سکھانے کا موقع مل گیا۔ اس نے ایک آرٹ اسکول میں پڑھانا شروع کر دیا تھا جو کہ ایک پاکستانی نے ہی کھولا تھا۔ وہاں سے واپس آ کر وہ اپنے کیونس پر اپنے شاہکار تخلیق کرنے میں مصروف ہو جاتا تھا۔ وہ سڈنی کے ایک ہوٹل کے لیے بھی تصویریں بنانے کا کام کرتا رہتا تھا۔ اس کی بنائی گئی تصویروں میں اب جا بجا اداسی کے رنگ نظر آتے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ اس نے اپنا سارا درد اپنی تصویروں میں منتقل کر دیا ہو۔ اپنے بیٹے کی تلاش کے سلسلے میں ابھی وہ مکمل طور پر مایوس نہیں ہوا تھا۔ اس نے اپنے پاکستانی دوست کو جو کہ پولیس میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھا اور اس کے بیٹے کی تلاش میں اس کی مدد کر رہا تھا کو ہدایت کی تھی کہ جیسے ہی اس کے بیٹے کا کوئی سراغ ملے اسے فوراً اطلاع کی جائے۔ وہ عروہ کے گھر والوں سے بھی رابطے میں تھا۔ اس نے عروہ کے بھائی کو ایک بہت اچھے ادارے میں ملازمت دلوا دی تھی اور ہر ماہ اس کے گھر والوں کو ایک مخصوص رقم بھیجا کرتا تھا۔ وہ عروہ کو واپس تو نہیں لاسکتا تھا مگر اس کے گھر والوں کی مدد کر کے وہ اپنے دل کو سکون پہنچانے کی کوشش تو کر سکتا تھا۔ سو وہ یہی کر رہا تھا۔ خود کو بہت زیادہ مصروف رکھ کر وہ اپنے غم بھلانے کی کوشش کر رہا تھا مگر مصروف رہنے سے دکھ کم تھوڑی ہوتا ہے۔ وہ تو اپنی جگہ موجود رہتا ہے۔ بس مصروفیت کی گرد اس پر کچھ دیر کے لیے جم جاتی ہے اور جیسے ہی وہ گرد اڑتی ہے غم پھر دوبارہ اسی شدت سے اپنے ہونے کا احساس دلاتے ہیں۔ وقت اچھا ہو یا برا کسی نہ کسی طرح کٹ ہی جاتا ہے سو موسیٰ حیات کا بھی کٹ رہا تھا۔ روز و شب کے آنے اور جانے سے اسے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ اس کے لیے سب دن ایک جیسے تھے۔ اس کی تصویریں دیکھ کر لگتا تھا کہ جیسے وہ خود سے جنگ لڑ رہا ہو۔ خود سے یہ جنگ لڑتے لڑتے اسے کئی سال گزر گئے مگر جو گوہر نایاب وہ حاصل کرنا چاہتا تھا۔ وہ اسے نہیں ملا۔ اب تو اسے لگتا تھا کہ اس کی حیات کا سفر بھی ایسے ہی تمام ہو جائے گا اور اس کا بیٹا اسے نہیں ملے گا۔ سڈنی میں موجود پاکستانی مصوروں میں اب اس کا ایک مقام تھا۔ اس کی بنائی گئی تصویروں پر وہاں کے مختلف آرٹ میگزینز میں مقالے شائع کیے جاتے تھے۔ اس کی بنائی گئی تصویروں کا انعقاد صرف آسٹریلیا میں ہی نہیں بلکہ دوسرے ممالک میں بھی کیا جاتا تھا۔ نوجوان مصوروں کے لیے اس کے کام میں سیکھنے کے بہت سے مواقع تھے۔ وہ جتنا اچھا مصور تھا اتنا ہی فلاحی کاموں میں اس کی شہرت تھی۔ اس نے کئی رفاہی اداروں کا بیڑہ اٹھایا ہوا تھا۔ اپنی آمدنی کا ایک بڑا حصہ



وہ مختلف فلاحی اداروں کو دیتا تھا اور اپنے طور پر بھی ضرورت مندوں کی مدد کرتا رہتا تھا۔ اپنے بیٹے کی جدائی ایک ایسا غم تھا جس نے اسے اندر سے توڑ کر رکھ دیا تھا۔ وہ ہر نو جوان چہرے میں اپنے بیٹے کو ڈھونڈتا پھرتا تھا۔ وہ سوچتا تھا کہ اس کے بیٹے کے خدو خال میں نہ جانے کس کی شبیہ ہوگی۔ اس نے اپنے بیٹے کی کئی تصویریں بنا رکھیں تھیں۔ اسے لگتا تھا کہ اس کا بیٹا ان تصویروں جیسا ہی ہوگا۔ اسے اکثر مائدہ بھی بہت یاد آتی تھی مگر اس نے مائدہ کو ڈھونڈنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ مائدہ کا سامنا کرے۔ وہ خود کو اس کا مجرم سمجھتا تھا۔ مائدہ کی شکوؤں سے بھری نظروں سے اسے خوف آتا تھا۔ وہ بزدل نہیں تھا مگر وقت نے اسے بزدل بنا دیا تھا۔ اس لیے اگر کہیں اسے لگا کہ مائدہ اس کے پاس موجود ہے تو وہ فوراً وہاں سے چلا آیا، اس کی دلی تمنا تھی کہ مائدہ جہاں ہے وہاں پر خوش رہے اور موسیٰ حیات کا سایہ بھی اس پر نہ پڑے۔ وہ مائدہ کے حالات سے ناواقف تھا اگر واقف ہوتا تو کبھی بھی اس سے لاتعلقی نہ برتا۔ وہ ان دنوں سڈنی کے ایک ٹی وی چینل کے لیے ایک آرٹ ڈاکومنٹری پر کام کر رہا تھا جس میں مختلف ادوار میں کیے جانے والے آرٹسٹوں کے کام کا احاطہ کرنا تھا۔ اس سلسلے میں مختلف معروف مصوروں کے کام کو ایک فلم کی شکل میں پیش کرنا تھا۔ موسیٰ کے ساتھ چند اور مصور بھی اس پروجیکٹ پر کام کر رہے تھے اور اسے لگتا تھا کہ آرٹ کے قدردانوں کے لیے یہ ڈاکومنٹری فلم کسی تحفے سے کم نہیں ہوگی۔ وہ اپنے پروجیکٹ میں مصروف تھا کہ ایک روز اس کی محسن سے ملاقات ہو گئی۔ محسن کو دیکھ کر برسوں پہلے کا وہ سچا منظر اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم گیا۔ جس منظر نے موسیٰ کی زندگی کو اندھیروں میں لاکھڑا کیا تھا۔ یہی کچھ کیفیت محسن کی بھی تھی۔ موسیٰ کو دیکھتے ہی وہ اذیت، وہ دکھ دوبارہ سے جاگ اٹھا جس کو وہ کب سے بھلانے کی کوشش میں مصروف تھا۔ موسیٰ اسے دیکھتے ہی اس کے گلے لگ گیا۔ وہ اس سے معافی مانگ رہا تھا اور محسن نے بھی اسے معاف کر دیا۔ اسے لگتا تھا کہ موسیٰ نے بہت طویل سزا کاٹ لی ہے۔ اب وقت آ گیا تھا کہ وہ اپنے اس دوست کو معاف کر دے۔ اس نے اپنے دل کی پکار پر نہ صرف موسیٰ کو معاف کر دیا تھا بلکہ اس کی دوستی کو بھی دل سے قبول کر لیا تھا۔ موسیٰ کی زبانی اس کی زندگی کی کہانی سن کر محسن کو بہت دکھ پہنچا تھا۔ وہ اپنے سارے شکوے اور شکایات بھول گیا تھا اور چند لمحوں کے بعد وہ دونوں دوبارہ سے پہلے جیسے دوست بن گئے تھے۔ محسن جیسے دوست کو دوبارہ اپنی زندگی میں شامل کر کے موسیٰ بہت خوش تھا۔ محسن نے ایک روز اسے مائدہ کے انتقال کی خبر سنائی جسے سن کر موسیٰ کو لگا کہ اس کی ذات ایک اور دکھ کے بوجھ تلے دب گئی ہے۔ عروہ کے بعد مائدہ کو بھی اس نے کھو دیا تھا۔

☆.....☆

علی بہت چھوٹا سا تھا جب اس نے کراچی جیسے شہر بے مثال کو الوداع کہہ دیا تھا مگر اس کے ذہن کے ایک گوشے میں ابھی بھی اس شہر سے وابستہ کچھ یادیں موجود تھیں۔ سب سے پہلے یاد تو اس عورت کی تھی جسے اس کی ماں کا نام دیا گیا تھا۔ وہ اکثر اپنے البم میں موجود اس عورت کی تصویریں دیکھا کرتا تھا جسے وہ اپنی ماں سمجھتا تھا مگر اب اس کے دل میں اس عورت کے لیے محبت بھرے تمام جذبات اپنی موت آپ مر چکے تھے۔ وہ صرف اور صرف اپنے اصل ماں باپ کی تلاش میں تھا، جو اس دنیا کی بھیڑ میں نہ جانے کہاں گم ہو گئے تھے۔ اب ان کی تلاش ہی علی کی زندگی کا اصل مقصد تھا۔ کراچی کے ایک سٹے سے ہوٹل میں اس نے ایک کمرہ کرائے پر لے لیا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اس کام میں اسے کئی دن لگ سکتے ہیں۔ وہ جلد مایوس ہو



جانے والے لوگوں میں سے نہیں تھا وہ سب سے پہلے اس اسپتال گیا جہاں سے اسے اپنا کچھ سراغ مل سکتا تھا اسے اشرف مسج کے بارے میں معلومات حاصل کرنی تھیں۔ کیوں کہ اس فائل میں سب سے اوپر اسی شخص کا نام لکھا تھا اور علی کو یقین تھا کہ وہ شخص اس کے گھر والوں کے متعلق کچھ نہ کچھ ضرور جانتا ہوگا۔ اسپتال جا کر اسے مایوسی ہوئی کیوں کہ وہاں پر کوئی بھی اس شخص کے متعلق کچھ نہیں جانتا تھا۔ اسپتال کو ایک نجی ادارے نے اپنی تحویل میں لے لیا تھا اور اس کی ساری انتظامیہ تبدیل ہو چکی تھی۔ علی روزانہ ہی اسپتال کے چکر لگاتا تھا کہ شاید اسے ان لوگوں کے متعلق معلومات مل جائیں جن کا ذکر اس فائل میں موجود تھا۔ اسپتال کا پرانا ریکارڈ بھی کسی حادثے میں ضائع ہو چکا تھا اس لیے وہاں سے بھی علی کو اپنے متعلق معلومات نہیں ملیں۔ وہ اپنی تلاش کے متعلق تقریباً مایوس ہو چکا تھا کہ ایک روز قدرت کو اس پر رحم آ ہی گیا اور اسے اس شخص کا پتال گیا جسے وہ ڈھونڈتا پھر رہا تھا۔ ہوا کچھ یوں تھا کہ وہ حسب معمول اسپتال میں اشرف مسج کے بارے میں لوگوں سے پوچھتا پھر رہا تھا کہ ایمر جنسی روم کے باہر بیٹھے ایک شخص نے اس کی بات سن کر اسے امید دلا دی تھی کہ وہ اسے اشرف مسج سے ملوادے گا۔ علی جو اب ہمت ہار بیٹھا تھا۔ اس شخص کی اس امید نے جیسے اس کے دم توڑتے وجود کے اندر ایک نئی زندگی کی روح پھونک دی تھی۔

معاشرتی تفریق کے حساب سے یہ ایک غریبوں کی بستی تھی۔ علی حیران کن نظروں سے وہ علاقہ اور وہاں پر موجود مکانات کو دیکھ رہا تھا۔ یہ جگہ واقعی میں اس کے لیے بہت مختلف تھی۔ اس کے ساتھ آئے ہوئے شخص نے ایک مکان کی طرف اشارہ کیا اور علی وہاں رک گیا۔ اب وہ شخص اس مکان کے لکڑی سے بنے ہوئے دروازے پر کچھ دیر دستک دیتا رہا۔ دستک دینے کے بعد اب وہ دونوں منتظر تھے کہ جس شخص سے وہ ملنے کے لیے آئے ہیں وہ باہر آئے کچھ دیر بعد ایک شخص گھر کے اندر سے باہر نکلا قدرے سیاہی مائل رنگت، مناسب قد، چھوٹی چھوٹی آنکھوں اور اپنے کمزور سے وجود کے ساتھ گھرا وہ شخص پہلی ہی نظر میں علی کو بہت عجیب لگا تھا۔ علی کے ساتھ کھڑے شخص کے ساتھ اس کی بہت بے تکلفی لگ رہی تھی۔ وہ ان دونوں کو ساتھ لے گھر کے اندر داخل ہو گیا تھا۔ دو کمروں پر مشتمل یہ چھوٹا سا گھر بہت صاف ستھرا لگ رہا تھا۔ علی اب اس شخص کے ساتھ اس گھر میں موجود ایک کمرے میں تھا۔ اتنا تو علی کو معلوم ہو چکا تھا کہ اس شخص کا نام اشرف مسج ہے اور یہ وہی اشرف مسج ہے جس کی علی کو تلاش تھی۔ اشرف مسج ان دونوں کے لیے جائے لے کر آ گیا تھا۔ علی اس سے بات کرنے کے لیے بہت بے چین تھا مگر اس کے ساتھ آتے شخص نے علی کو پہلے ہی منع کر رکھا تھا کہ وہ بات نہ کرے۔ وہ شخص خود بات شروع کرے گا۔

”بھاجی اشرف! یہ لڑکا جو میرے ساتھ بیٹھا ہے، اسے آپ سے بہت ضروری کام ہے۔“ علی کے ساتھ بیٹھے شخص نے جائے کی چسکیاں لیتے ہوئے بات کا آغاز کیا۔

”جی بیٹا! تو آپ کو مجھ سے کیا ضروری کام ہے؟“

اشرف مسج نے اپنے سامنے بیٹھے اس لڑکے کو مخاطب کیا جو دیکھنے میں کسی اچھے گھر کا معلوم ہو رہا تھا مگر اس کے چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ جیسے وہ بہت زیادہ پریشان ہو، اس کے پورے وجود سے ایک عجیب سی قسم کی ویرانی، اداسی، خاموشی، تنہائی اور وحشت ٹپک رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں چھپا درد اشرف سے دیکھا نہیں جا رہا تھا۔

”آپ نے کبھی اسپتال میں کام کیا ہے؟“ علی نے اس سے پوچھا۔



”ہاں! میں نے کچھ عرصہ وہاں پر کام کیا ہے مگر تم یہ کیوں پوچھ رہے ہو؟“ اشرف نے بہت دھیمی آواز میں کہا۔ اسے باقاعدہ اب اس لڑکے سے خوف محسوس ہونے لگا تھا۔ جونہ جانے کون سے حساب مانگتے اشرف مسج کے پاس چلا آیا تھا۔

”برسوں پہلے اس اسپتال سے ایک بچہ اغوا ہوا تھا۔ آپ بھی اس گھناؤنے کام میں شریک تھے۔ میں آپ کو کسی قسم کی سزا دینے نہیں آیا ہوں۔ بس آپ مجھے اس بچے کے اصل والدین سے ملوادیں۔“ علی نے ٹھہر ٹھہر کر اپنی بات مکمل کی۔

Downloaded from paksociety.com

اشرف مسج کو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس کی بات کے جواب میں کیا کہے۔ برسوں پہلے جو گناہ اس سے سرزد ہو گیا تھا اب اس کے حساب کا وقت آن پہنچا تھا۔ سوال کرنے والا اس کی نظروں کے سامنے کھڑا اس سے جواب مانگ رہا تھا۔ اپنا ماضی اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم گیا تھا۔

”تم کون ہو؟“ اشرف مسج نے پوچھا۔

”میں وہی بد نصیب ہوں۔ جسے کئی سال پہلے اس کے اپنوں سے جدا کر دیا گیا تھا۔“ یہ کہتے ہوئے علی کی آنکھیں نم ہو گئیں تھیں۔

”میں تمہارے اصل والدین کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں جانتا۔ تمہاری ماں تو تمہاری پیدائش کے ساتھ ہی اس دنیا سے چلی گئی تھی۔ تمہارے خاندان کے باقی افراد اب نہ جانے کہاں پر ہوں گے۔ لیکن میں تمہاری مدد ضرور کروں گا۔ اس طرح میرے ضمیر کا بوجھ بھی کچھ ہلکا ہوگا۔“

اتنا کہہ کر اشرف مسج اب اس نوجوان کے ساتھ آ کر بیٹھ گیا جس کی حالت اسے ٹھیک نہیں لگ رہی تھی۔ اگلے کئی دن تک وہ اسے شہر کی ایک جگہ سے دوسری جگہ لے کر پھرتا رہا مگر جتنے لوگوں کو وہ جانتا تھا ان میں سے اکثر شہر چھوڑ کر کہیں اور چلے گئے تھے۔ اشرف مسج کو یاد تھا کہ جن دنوں اس بچے کی تلاش کا کام جاری تھا۔ ان دنوں اس نے ایک نوجوان کو اسپتال انتظامیہ سے اجھتے ہوئے دیکھا تھا۔ اسے اسپتال انتظامیہ سے معلوم ہوا تھا کہ وہ لڑکا اس بچے کا ماموں ہے۔ اشرف مسج نے ان دنوں اس نوجوان کے بارے میں زیادہ معلومات حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی تھی کیوں کہ ان دنوں تو وہ خود سے بھی چھپتا پھرتا تھا اور پھر کچھ عرصے بعد وہ شہر چھوڑ کر چلا گیا تھا مگر اب علی کی خاطر اس نے ہر اس جگہ جا کر اس کے گھر والوں کو ڈھونڈا تھا جہاں اسے تھوڑی سی بھی امید ہوتی تھی کہ ان کا کچھ سراغ مل جائے گا مگر اس کی ہر کوشش ناکام ثابت ہوئی تھی۔ علی کے ساتھ مل کر اس نے اخبار میں ایک اشتہار بھی دیا تھا جس میں دیگر تفصیلات کے ساتھ ساتھ علی کی تصویر بھی تھی مگر کسی نے کوئی رابطہ نہیں کیا۔ چند لوگوں نے اگر رابطہ کیا بھی تھا تو ان کے پاس کوئی خاص ثبوت نہیں تھا۔ جس کی بنیاد پر وہ ثابت کر سکیں کہ وہی علی کے خاندان کے افراد ہیں۔ اشرف مسج کو علی کے گھر والوں کی شکلیں اچھی طرح یاد تھیں۔ اس لیے وہ سب لوگ ناکام ہی ثابت ہوئے تھے۔ علی کے ویزے کی میعاد بھی ختم ہونے والی تھی۔ اس لیے اب وہ واپس جا رہا تھا مگر اب اس کے دل میں کوئی حسرت نہیں رہی تھی۔ اس نے سمجھ لیا تھا کہ اس کی قسمت میں اپنے گھر والوں سے ملنا لکھا ہی نہیں ہے۔ وہ سب سے لڑ سکتا ہے مگر اپنی قسمت سے نہیں لڑ سکتا۔ وہ اس سارے معاملے میں اشرف مسج کو بھی قصور وار نہیں سمجھتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ سب ایسے ہی ہونا تھا کیوں کہ اس کی قسمت میں ایسے ہی لکھا تھا۔ وہ سڈنی واپس آ گیا تھا جہاں باقی عمر اس نے اسی کرب میں گزارنی تھی کہ وہ لاوارث ہے۔ اس کی



کوئی شناخت نہیں ہے۔ زندگی نے جہاں اسے تنہائی اور اکیلا پن دیا تھا اس سے اس کے اپنے چھین لیے تھے وہاں کیتھی جیسے مہربان لوگ بھی اس کے پاس موجود تھے۔ جن کے ہوتے ہوئے اسے کسی دوسرے سہارے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی۔ وہ جب کراچی گیا تھا تو ایک ہنستی مسکراتی کیتھی نے اسے رخصت کیا تھا مگر جب واپس آیا تو اسے لگا کہ کیتھی کی آنکھوں میں سوائے آنسوؤں اور ویرانیوں کے کچھ بھی نہیں ہے۔ اپنی سوتیلی ماں کے سلوک سے تنگ آ کر اس نے اپنا گھر چھوڑ دیا تھا۔ وہ ایک ہاسٹل میں رہنے لگی تھی۔ اس کے دکھ اور پریشانیوں کی داستان سن کر علی کو اپنا دکھ بہت معمولی لگنے لگا تھا۔ علی نے اپنی باتوں سے اس کا حوصلہ بڑھایا اور اسے مایوسی کے اندھیروں سے نکالنے کی کوشش کی۔ علی کی ہمدردی پاتے ہی ایسے ہی ایک بے اختیاری کے لمحے میں کیتھی نے ایک بار پھر بہت بھرپور انداز میں اس سے اظہار محبت کر دیا اور علی کو لگا کہ کیتھی کی محبت کو قبول نہ کرنا اس پر ظلم ہو گا وہ جو اپنے والدین کی دی ہوئی تنہائی اور اکیلے پن کو کب سے برداشت کر رہی تھی ایسے میں اگر وہ بھی اس کی محبت کو نظر انداز کرتا تو نہ جانے وہ اپنے ساتھ کیا کر بیٹھتی۔ علی کو اس لمحے سائرہ بہت شدت کے ساتھ یاد آئی تھی مگر اب کیتھی کے التفات اور لگاؤ کے آگے سائرہ کی محبت کہیں دور چلی گئی تھی۔ ان دونوں نے سڈنی کے سینٹرل پارک میں پھولوں کی ایک خوب صورت ہاڑ کے سامنے عمر بھر کے لیے ایک دوسرے کا ساتھ نبھانے کا عہد کر لیا تھا۔ علی نے کیتھی کو منگنی کی انگوٹھی پہنا دی تھی۔ وہ شادی کرنے پر اصرار کر رہی تھی مگر علی چاہتا تھا کہ پہلے اس کی تعلیم مکمل ہو جائے۔ منگنی کے بعد ان دونوں نے اپنی ساری توجہ تعلیم پر مرکوز کر دی تھی۔ کالج میں ان کے دوستوں نے انہیں مبارکباد دی تھی۔ اس لمحے علی کو سائرہ کی آنکھوں میں اپنے لیے ڈھیروں شکوے نظر آئے تھے مگر اب وہ کیتھی کے علاوہ کسی کے بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ وہ اپنی پڑھائی میں مصروف رہتا تھا۔ سائرہ سے اس کا سامنا کم ہی ہوتا تھا مگر ایک روز وہ اسے آکسفورڈ اسٹریٹ پر ڈری سہی سی نظر آئی اور علی سوچتا تھا کہ اگر وہ اس دن نہ ہوتا تو نہ جانے سائرہ کے ساتھ کیا ہو جاتا۔

☆.....☆

محمد عبداللہ کی زندگی کیا بدلی اسے لگا کہ لوگوں کے رویے بھی بدل گئے ہیں۔ اس کی داڑھی کی وجہ سے اب ہر کوئی اسے شک بھری نظروں سے دیکھنے لگا تھا مگر محمد عبداللہ کے استاد نے اس کی اتنی سخت تربیت کی تھی کہ اب لوگوں کے رویے اسے سیدھی راہ سے نہیں بھٹکا سکتے تھے۔ شروع شروع میں اسے سمجھ نہیں آتا تھا کہ وہ کیا کام کرے۔ اس کی داڑھی کی وجہ سے کوئی بھی اسے اچھی ملازمت دینے کو تیار نہیں تھا مگر پھر اسے سڈنی کے ہی ایک اسلامک سینٹر میں کام مل گیا۔ اسے وہاں انتظامی معاملات کا نگران بنا دیا گیا تھا۔ یہ اس کی پسند کا کام بھی تھا اور تنخواہ بھی اچھی تھی، جس میں اس کا اور سائرہ کا بہت اچھی طرح گزارا ہو جاتا تھا۔ اسے سائرہ کی بہت فکر رہتی تھی۔ ماندہ کے جانے کے بعد اسے لگتا تھا کہ اس کی بیٹی بہت خاموش رہنے لگی ہے۔ وہ اسلامک سینٹر سے واپس آنے کے بعد سائرہ کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزارتا تھا اور اکثر شام کے وقت وہ اسے لے کر ساحل پر گھومنے چلا جاتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ سائرہ اپنے شعبے میں بہت نام کمائے اور پھر وہ کسی اچھی جگہ اس کی شادی کر دے۔ وہ سائرہ کی پسند معلوم کرنا چاہتا تھا مگر جب بھی وہ اپنی بیٹی سے اس سلسلے میں کوئی بات کرنا چاہتا تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے جنہیں وہ سمجھ نہیں پاتا تھا۔ وہ تو اسے ہر وقت خوش دیکھنا چاہتا تھا مگر نجانے کیوں وہ خوش نہیں رہتی تھی۔ اس کی تصویروں میں



اداسی اور مایوسی کے رنگ زیادہ نظر آنے لگے تھے۔ امتحانات میں کامیابی کے بعد اس نے آرٹ میگزین میں ملازمت اختیار کر لی تھی۔ محمد عبداللہ نے اسے کسی کام سے نہیں روکا۔ وہ تو بس یہ چاہتا تھا کہ سائرہ کی شادی ہو جائے مگر یہ ایک ایسی بات تھی جس پر وہ رضامند نہیں ہوتی تھی۔ محمد عبداللہ کو لگتا تھا کہ اسلامک سینٹر کی یہ ملازمت اب اس کی زندگی کا حصہ بن گئی ہے۔ اب تو سائرہ نے بھی اسلامک سینٹر جانا شروع کر دیا تھا اور اپنی بیٹی کی زندگی کی یہ خوش گوار تبدیلی اسے اچھی لگی تھی مگر باوجود کوشش کے کہ وہ اپنی بیٹی کی زندگی میں موجود تہائی کو دور نہیں کر پایا تھا۔

سڈنی کا موسم اس روز ضرورت سے کچھ زیادہ ہی خوشگوار تھا اور سائرہ کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ لمبی سی واک کرے۔ اسے ایسے موسموں میں واک کرنا بہت اچھا لگتا تھا۔ ابھی اپنی پسندیدہ شاہراہ پر پیدل چلتے ہوئے کچھ ہی دیر گزری تھی کہ اچانک اسے ایرک اپنے کچھ دوستوں کے ساتھ اپنی طرف آتا ہوا نظر آیا۔ ایرک کو اپنے ساتھ ساتھ چلتے دیکھ کر سائرہ کے جسم پر کپکپی طاری ہو گئی تھی۔ اچانک سے ایرک نے چاقو نکال لیا۔ اس سے پہلے کہ وہ سائرہ پر حملہ کرنا نہ جانے کہاں سے علی نے آکر اس کا بازو پکڑ لیا اور اسے گھسیٹتا ہوا سائرہ کی نظروں سے دور لے گیا۔ یہ سب اتنا اچانک ہوا کہ سائرہ کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس کے ساتھ ہوا کیا ہے۔ ایرک اور علی اب اس سے کافی دور چلے گئے تھے۔ اس وقت وہاں پر رش زیادہ تھا۔ اس لیے وہاں پر موجود لوگوں نے اس چیز کو محسوس نہیں کیا تھا۔ سائرہ کی رفتار میں اب تیزی آگئی تھی۔ وہ بہت خوف زدہ تھی اور جلد از جلد گھر چلی جانا چاہتی تھی کہ ایک بار پھر کوئی اس کے قدم سے قدم ملا کر چلنے لگا اور اس خوشبو کو وہ لاکھوں میں پہچان سکتی تھی۔ علی کی خوشبو تھی جس کے قریب سے سائرہ کو اپنی دھڑکنیں منجمد ہوتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔

”سائرہ! تم نے کبھی ایرک کا بہت دل دکھایا تھا۔ وہ اسی لمحے کا بدلہ تم سے لینا چاہ رہا تھا مگر اب علی کا وعدہ ہے کہ ایرک کبھی بھی تمہارے راستے میں نہیں آئے گا۔ میں نے اسے بہت اچھی طرح سمجھا دیا ہے۔“

علی چند جملے بول کر اس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا اور سائرہ نم آنکھوں سے اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی وہ اسے روکنا چاہتی تھی مگر اس کے پاس ایسا کوئی اختیار نہیں تھا۔ اس روز کے بعد ایرک کبھی بھی اس کے راستے میں نہیں آیا۔ علی نے اور اس نے امتحانات میں ایک ساتھ کامیابی حاصل کی تھی۔ وہ علی کو کبھی بھول نہیں سکتی تھی۔ اس لیے اس نے یہ کوشش ہی ترک کر دی تھی۔ وہ اپنے من پر توجہ دے رہی تھی۔ اسے ایک بہت مشہور آرٹسٹ بننا تھا اور اب یہی اس کی زندگی کا مقصد تھا۔

کیتھی سے منگنی کے باوجود علی اکثر تہائی میں صرف اور صرف سائرہ کے پارے میں ہی سوچتا تھا اور اس واقعے کے بعد تو علی کو وہ کسی ڈری سہمی ہوئی کسی خوف زدہ بچی کی طرح لگی تھی اور اس لمحے اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ اسے اپنے بازوؤں کے حلقے میں لے کر سب سے دور لے جائے مگر محض چند لفظ بول کر وہ اس سے بہت دور چلا گیا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی آنکھوں میں چھپی ہوئی محبت کو سائرہ دیکھ لے۔ امتحانات میں کامیابی کے بعد علی کا ارادہ مزید تعلیم حاصل کرنے کا تھا۔ اس مقصد کے لیے اس نے یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا تھا۔ اپنے والد کی فرمائش نے نہایت اچھے داموں پر فروخت کر دی تھی۔ اس طریقے سے حاصل ہونے والی تمام رقم اس نے ایک خیراتی ادارے کو وقف کر دی تھی۔ اس بات پر کیتھی سے اس کا جھگڑا بھی ہوا تھا مگر اس معاملے میں اس نے کیتھی کی کوئی بات نہیں سنی تھی۔ وہ ان پیسوں پر اپنا کوئی حق نہیں



بجھتا تھا۔ اس نے ایک آرٹ فرم میں ملازمت اختیار کر لی تھی اور تعلیم مکمل ہوتے ہی اس کا ارادہ کیتھی کو ہمیشہ کے لیے اپنی زندگی میں شامل کرنے کا تھا مگر اب کیتھی کا رویہ اسے مایوس کر رہا تھا۔ وہ اب کئی کئی دن اس سے بات نہیں کرتی تھی۔ علی ایک دو بار اسے اپنے ایک کلاس فیلو کے ساتھ انتہائی بے تکلف انداز میں گھومتے ہوئے دیکھ چکا تھا۔ اس نے جب کیتھی سے باز پرس کی تو کیتھی نے نکل سے اس کی بات سننے کے بجائے اس سے جھگڑا شروع کر دیا۔ اب وہ بات بے بات علی سے الجھنے لگی تھی۔ ان کے درمیان اب روزانہ ہی کسی نہ کسی بات پر جھگڑا ہونے لگا تھا۔ علی کو اب بہت شدت سے محسوس ہونے لگا تھا کہ کیتھی نے اور دلچسپیاں ڈھونڈ لی ہیں اور اب علی کی ذات میں اسے کوئی دلچسپی نہیں رہی اور پھر ایک روز اچانک اس نے علی سے وہ برائے نام تعلق بھی ختم کر لیا اور اس کی دی ہوئی انگوٹھی اسے واپس کر دی۔ علی کو زندگی میں پہلی بار عورت کے نام سے ہی نفرت محسوس ہونے لگی تھی۔ پہلا دکھ اس کے شناسا ایرک کو سائرہ نے دیا تھا اور علی کو لگتا تھا کہ سائرہ نے صرف ایرک کو ہی نہیں بلکہ اسے بھی دھوکہ دیا تھا اور اب جو کچھ کیتھی نے اس کے ساتھ کیا تھا۔ اس کے بعد تو اسے یقین ہو چلا تھا کہ عورت کا دوسرا نام دھوکا ہے۔ کیتھی کو صرف اس کی دولت سے محبت تھی اور جب دولت کو اس نے خود سے دور کر لیا تو کیتھی بھی اس سے دور چلی گئی۔ علی کو لگتا تھا کہ کیتھی نے جو چوٹ اسے پہنچائی ہے اس کے بعد وہ زندہ نہیں رہ پائے گا مگر وہ زندہ تھا اور اسے زندہ رہنا تھا ابھی تو اس کی زندگی کے گلشن میں موسم بہار نے دستک دینی تھی۔ وہ دن بھر اپنے کام میں مصروف رہتا تھا۔ اس کی یونیورسٹی کی تعلیم بھی مکمل ہو گئی تھی۔ اس کے فن میں بھی نکھار آتا جا رہا تھا۔ ایک روز اس کے گھر پر اس سے کچھ لوگ ملنے کے لیے آئے اور وہ کوئی معمولی لوگ نہیں تھے۔ وہ بہت خاص لوگ تھے جن سے ملنے کے بعد علی کو لگا تھا کہ وہ اندھیروں سے نکل کر روشنیوں میں آ گیا ہو اور ان روشنیوں نے صرف اس کی ذات کو نہیں بلکہ اس کے ارد گرد کی سب جگہوں کو روشن کر دیا ہو۔

☆.....☆

موسیٰ حیات کو وہ نوجوان پہلی ہی نظر میں دوسروں سے بہت مختلف اور متاثر کن شخصیت کا حامل لگا تھا۔ حیرت انگیز طور پر اسے اس نوجوان میں اپنی بیوی عروہ کی بہت شباهت نظر آئی تھی اور اسے دیکھ کر بے اختیار موسیٰ کے دل سے دعا نکلی تھی کہ کاش اس کا اپنا بیٹا بھی ایسا ہی ذہین ہو، موسیٰ کی علی سے پہلی ملاقات ایک آرٹ کانفرنس کے دوران ہوئی تھی جہاں اس کے کچھ فن پارے بھی رکھے تھے۔ موسیٰ کو نہ صرف علی کی شخصیت بلکہ اس کے کام نے بھی بہت متاثر کیا تھا، موسیٰ کو اس کی ذاتی زندگی کے بارے میں جاننے میں بہت دلچسپی محسوس ہونے لگی تھی، موسیٰ صرف اتنا ہی جان سکا تھا کہ اس نوجوان کا نام علی ہے اور اس کے والد آسٹریلیا کی ایک مشہور کمپنی کے مالک ہیں جو اب اس دنیا میں نہیں رہے، اس کے کوائف جان کر موسیٰ کو مایوسی ہوئی تھی۔ علی آسٹریلیا کی شہریت کا حامل تھا اور اس کا بچپن اور لڑکپن سب سڈنی میں ہی گزرے تھے۔ اس لیے موسیٰ نے اپنے ذہن میں آنے والے ان تمام خیالات کو رد کر دیا جو علی کے سامنے آتے ہی موسیٰ کے دل و دماغ میں آ کر شور مچانے لگتے تھے۔ موسیٰ کو یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ علی کے والدین کا تعلق پاکستان سے تھا مگر یہ کوئی ایسی وجہ نہیں تھی جس کی بنیاد پر وہ یہ کہہ سکتا کہ علی ہی اس کا بیٹا ہے کیونکہ سڈنی میں اور بھی بہت سے پاکستانی خاندان رہتے تھے مگر موسیٰ اس نوجوان کو کبھی بھول نہیں سکتا تھا۔ وہ جب بھی اس کی بنائی ہوئی تصاویر دیکھتا تو اس کے دل میں خوشی کے بہت سے جذبات ابھرنے لگتے تھے



اور اسے لگتا تھا کہ یہ تصویر علی نے نہیں بلکہ اس نے خود بنائی ہے۔ موسیٰ نے اپنی اس کیفیت کا ذکر اپنے دوست محسن سے کیا تو اسے بھی بہت حیرت ہوئی۔ محسن کا خیال تھا کہ موسیٰ کو تو ہر نو جوان میں اپنا بیٹا نظر آتا ہے، ورنہ سڈنی میں رہائش پذیر اس نو جوان کا موسیٰ سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ موسیٰ کے پاس محسن کے علاوہ کچھ خاص دوست نہیں تھے جن سے وہ اپنی اس کیفیت کا ذکر کرتا جو علی کو دیکھ کر موسیٰ پر طاری ہو جاتی تھی۔ وہ اس معاملے میں خود کو بہت بے بس محسوس کرتا تھا۔ اس کا اپنا خون دنیا کی بھیڑ میں کہیں گم ہو چکا تھا، یہ ایک ایسا زخم تھا جس نے موسیٰ کے پورے جسم کو مفلوج کر رکھا تھا جب وہ علی کو دیکھتا تھا یہ زخم پھر سے تازہ ہو جاتا تھا۔ ایک روز محسن نے اسے ماندہ کی بیٹی سائرہ سے ملوایا، وہ لڑکی اپنی ماں کی طرح ہی بہت خوب صورت اور ذہین تھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ ایک بہت اچھی مصورہ تھی۔ اس کی تصویروں کے آگے تو موسیٰ کو علی کی تصویروں کے رنگ بھی پھیکے نظر آتے تھے۔ ماندہ کے شوہر سے مل کر بھی اسے شدید قسم کی حیرت ہوئی تھی۔ محمد عبداللہ نامی یہ نو مسلم سڈنی کے ایک اسلامک سینٹر میں کام کرتا تھا اور دینی معاملات میں اس کی معلومات نہایت قابل رشک تھیں۔ سائرہ کو دیکھ کر موسیٰ کے دل میں یہ خیال آتا تھا تھا کہ کاش ان کا بیٹا بھی ان کے پاس ہوتا تو وہ سائرہ کو اپنی بہو بناتے اور ہمیشہ کے لیے اسے اپنے بیٹے کی زندگی میں شامل کر لیتے۔ تھوڑے ہی عرصے میں سائرہ کی موسیٰ کے ساتھ بہت بے تکلفی ہو گئی تھی۔ وہ دونوں گھنٹوں بیٹھ کر ماندہ کی ہی باتیں کرتے رہتے تھے۔ سائرہ اکثر موسیٰ کو ملنے اس کے گھر آ جاتی تھی۔ موسیٰ کو لگتا تھا کہ سائرہ سے ملنے کے بعد ان کی زندگی بہت خوشگوار ہو گئی ہے مگر جب اپنے گمشدہ بیٹے کا خیال آتا تو ان کے دل میں دبے زخم ایک بار پھر سے تازہ ہو جاتے مگر یہ بھی حقیقت تھی کہ سائرہ سے ملنے کے بعد ان کے جسم کے ساتھ چپکے ہوئے یہ اداسی کے خول آہستہ آہستہ اترنے لگے تھے۔ انہیں لگتا تھا کہ اب وہ ایک نارمل انسان بننے لگا ہے۔ محمد عبداللہ سے بھی ان کی بہت اچھی دوستی ہو گئی تھی۔ اب وہ اس کے ساتھ اکثر اسلامک سینٹر جانے لگے تھے۔ سائرہ کو دیکھ کر انہیں لگتا تھا کہ وہ بھی کسی ناکام محبت کے دکھ میں مبتلا ہے۔ وہ اکثر جب موسیٰ کے ساتھ باتیں کرتے کرتے بے انتہا ہنستی تو اس کی آنکھوں میں چھپے اداسیوں کے منظر موسیٰ کی نظروں کی گرفت میں آ جاتے تھے۔ موسیٰ نے تو خود اپنی زندگی میں کسی سے بے انتہا محبت کی تھی۔ تو وہ کیسے اس کی آنکھوں میں چھپی کسی کی محبت کو نہ کھوج پاتے موسیٰ کو اس دن کا انتظار تھا جب وہ خود ان سے یہ سب کہہ دیتی مگر اس دن کے آنے سے پہلے ہی موسیٰ کی زندگی میں ایک بہت بڑا دن آ گیا۔ ایک روز انہیں پاکستان سے بہت سالوں بعد ان کے ایک دوست کا فون آیا جو کہ پولیس میں تھا۔ برسوں پہلے موسیٰ نے اسی کے ساتھ مل کر اپنے بیٹے کو ڈھونڈنے کی کوشش کی تھی مگر وہ ناکام رہے تھے۔ اتنے برسوں بعد اس نے فون پر موسیٰ کو جو خبر سنائی تھی۔ اسے سن کر ان کے مردہ وجود میں جیسے جان پڑ گئی تھی۔ انہیں لگا کہ ان کی زندگی کے جس زوہ موسم میں اچانک سے نہایت ہی خوشگوار ہوا چلنے لگی ہو۔ ان کے دوست نے بتایا تھا کہ ان کے بیٹے کا سراغ مل گیا ہے۔ اب وہ عروہ کے بھائی اور ایک اور شخص اشرف مسیح کو لے کر سڈنی آرہے ہیں اور یہ بھی کہ ان کا بیٹا ان ہی کے شہر میں ہے۔ موسیٰ کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اڑ کر اپنے بیٹے کے پاس پہنچ جائیں۔ وہ بہت خوش تھے اور انہیں ایسے لگ رہا تھا کہ ان کی خزاں رسیدہ ویران زندگی میں بہار مکمل طور پر اب اپنا رنگ جمانے لگی ہو۔

☆.....☆



موسیٰ نے مسکراتے ہوئے اس نوجوان سے پوچھا۔ جسے دیکھ کر پہلی ہی نظر میں ان کے دل نے گواہی دی تھی کہ یہی ان کے وجود کا وہ حصہ ہے جسے وہ برسوں سے تلاش کر رہا ہے اور اب پاکستان سے آئے ہوئے اس کے دوست نے موسیٰ کے گمان پر یقین کی مہر ثبت کر دی تھی۔ وہ تینوں اب علی کے ساتھ اس کے اپارٹمنٹ کے اندرونی حصے میں داخل ہو گئے تھے جہاں پر قدم قدم پر بکھری ہوئی بے ترتیبی دیکھ کر موسیٰ زیر لب مسکرانے لگا تھا کیوں کہ ایک زمانے میں وہ بھی ایسی ہی لا پرواہی سے چیزوں کو اٹھا اٹھا کر پھینکا کرتا تھا۔ تب عروہ سے اس کی ہلکی پھلکی جھڑپ بھی ہو جایا کرتی تھی۔ عروہ کا سوچ کر موسیٰ کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

"علی بیٹا! آپ کیسے ہو؟" اشرف مسیح یہ کہتے ہوئے پھر اس نوجوان کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔ پھر اس نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے موسیٰ کے پاس لے آیا۔

"علی! ان سے ملو۔ یہ موسیٰ حیات ہیں۔ یہ..... تمہارے والد ہیں علی۔" اشرف مسیح نے بغیر کسی لمبی چوڑی تمہید کے علی کو وہ بات بتادی جس کو بتانے کے لیے وہ خاص طور پر سڈنی آیا تھا۔

علی کے لیے یہ تمام انکشافات کسی دھماکے سے کم نہیں تھے۔ وہ کسی مجسمے کی طرح اشرف مسیح کو بولتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ اسے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ وہ اس بات پر کیسے اپنے رد عمل کا اظہار کرے۔

"علی بیٹا! جب آپ سڈنی واپس چلے گئے تھے اس کے چند دن بعد ہی آپ کے ماموں میرے پاس آئے۔ ان کے ہاتھ میں اخبار کا وہ اشتہار تھا جس میں آپ کی موجودہ تصویر بھی تھی اور ساتھ میں آپ کی گمشدگی کے حوالے سے تمام تفصیلات موجود تھیں۔ میں انہیں دیکھ کر پہچان گیا تھا کیوں کہ میں نے آپ کی گمشدگی کے بعد اکثر انہیں اسپتال کی انتظامیہ سے الجھتے ہوئے دیکھا تھا۔ میں نے انہیں یقین دلایا کہ میں انہیں آپ سے ملوادوں گا۔ ان کا رابطہ پولیس کے ساتھ تھا۔ وہیں پر آپ کے والد کے ساتھ رابطہ ہوا اور اب میں آپ کے سامنے ہوں۔"

اشرف مسیح نے اپنی بات مکمل کر کے علی کی طرف دیکھا جو یقین اور بے یقینی کی کیفیت میں تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنے کسی رد عمل کا اظہار کرتا۔ موسیٰ آگے بڑھا اور اس نے علی کو گلے لگا لیا۔ کہتے ہیں اس کائنات کا سب سے حسین منظر وہ ہوتا ہے جب کوئی ماں پہلی بار اپنے بچے کو گود میں اٹھاتی ہے۔ علی کی ماں نہیں تھی مگر جب باپ نے اسے آگے بڑھ کر گلے سے لگایا تو وہ بھی اپنے جذبات پر قابو نہیں رکھ پایا اور بچوں کی طرح زار و قطار رونے لگا۔ برسوں کے آنسو اس نے اپنی آنکھوں میں جمع کر رکھے تھے جو موسیٰ کے ملتے ہی اس کی آنکھوں سے ابل پڑے تھے۔ اشرف مسیح اور عروہ کے بھائی کی آنکھوں میں بھی آنسو آگئے تھے۔ موسیٰ حیات کی برسوں کی تلاش مکمل ہوئی تھی اور علی کو سائبان مل گیا تھا۔ اس کی ذات کا ادھورا پن مکمل ہوا تھا۔ اب وہ اکیلا نہیں رہا تھا۔ اس کو اس کے اپنے مل گئے تھے۔ اسے لوگ نواز شاہ کے بیٹے کی حیثیت سے جانتے تھے مگر اب اسے ایک نئی پہچان ملی تھی۔ وہ معروف مصور موسیٰ حیات کا بیٹا تھا جن کو ایک دنیا جانتی تھی۔ علی کو خود پر بہت فخر محسوس ہوتا تھا کہ وہ ایک معروف شخصیت کا بیٹا ہے۔ جن کی پہچان صرف ان کی مصوری نہیں تھی بلکہ فلاحی کاموں میں بھی ان کی ایک شہرت تھی۔ علی کے لیے یہ احساس ہی بہت خوب صورت تھا کہ اس کی بھی کوئی شناخت ہے۔ اسے اس کے اپنے مل گئے تھے۔ اس سے بڑھ کر اسے کسی چیز کی حاجت اب نہیں رہی تھی۔ وہ اتنا خوش تھا کہ کیتھی کے دیئے ہوئے زخم کچھ دیر کے لیے



www.Paksociety.com  
 بھول گیا تھا۔ وہ موسیٰ کے ساتھ ایک بار پھر کراچی گیا تھا۔ وہاں پر اپنے باقی رشتے داروں سے مل کر وہ تو جیسے ہواؤں میں اڑتا پھرتا تھا۔ وہ اپنی ماں کی قبر پر بھی گیا تھا جہاں جا کر وہ نمکین تو ضرور ہوا تھا مگر موسیٰ کی محبت نے اس کے سارے غموں کو جیسے پھلادیا تھا۔

سائرہ کو یہ جان کر بہت خوشی ہوئی تھی کہ علی موسیٰ حیات کا بیٹا ہے۔ وہی موسیٰ حیات جن سے مل کر اسے ایک انجانی سی خوشی حاصل ہوتی تھی۔ بحیثیت مصور اور سماجی کارکن کے تو وہ انہیں جانتی ہی تھی مگر اپنی والدہ کے ایک پرانے دوست کی حیثیت سے جان کر اس نے ان کے اندر کا ایک خوب صورت انسان دریافت کیا تھا۔ اپنے والد کے بعد موسیٰ حیات وہ دوسرے شخص تھے جن کے ساتھ وقت گزارنا اسے بہت اچھا لگتا تھا۔ لوگ موسیٰ حیات کو ایک خشک اور جذبات سے عاری انسان قرار دیتے تھے مگر سائرہ کو ایسا کچھ نہیں لگا تھا وہ تو جب بھی ان سے ملی تھی انہوں نے بہت اچھے طریقے سے اس سے بات کی تھی۔ ان کی تنہائی اور اکیلے پن کی داستان سن کر وہ بہت ادا اس ہو گئی تھی۔ وہ اپنی گفتگو سے ان کی اندر کی تنہائی کے احساس کو کم کرنے کی کوشش میں لگی رہتی تھی اور اس سلسلے میں اسے اپنے والد محمد عبداللہ کا تعاون بھی حاصل تھا۔ اسے جو بھی وقت ملتا تھا وہ موسیٰ کے ساتھ کچھ وقت گزارتی تھی۔ وہ اس کے بہت اچھے دوست بن چکے تھے اور اب اگر وہ کسی وجہ سے ان کے گھر نہ جا پاتی تو وہ خود اس کے گھر آجاتے اور پھر اسے لے کر کہیں نہ کہیں گھومنے نکل پڑتے۔ وہ اپنی ذات کے خول سے اب باہر نکلنے لگے تھے اور اپنی اس بدلتی ہوئی کیفیت کی وجہ وہ صرف اور صرف سائرہ کو قرار دیتے تھے اس نے ان کا ایک خوبصورت پورٹریٹ بنا کر جب انہیں پیش کیا تو وہ بچوں کی طرح خوش ہو کر ہر ایک کو وہ پورٹریٹ دکھاتے پھر رہے تھے اور اپنی ایک تصویری نمائش میں انہوں نے وہ پورٹریٹ خاص طور پر رکھا تھا اور سائرہ کو لگتا تھا کہ اس قدر خوب صورت تصویر اس نے آج تک نہیں بنائی۔ موسیٰ حیات کی تعریفیں سن کر اسے لگتا تھا کہ وہ واقعی میں بہت اچھی آرٹسٹ ہے۔ وہ اتنے بڑے آرٹسٹ تھے مگر سائرہ کو ان کے اندر غور نام کی کوئی چیز نظر نہیں آئی تھی۔ وہ بہت کم بولتے تھے مگر جس سے بھی ملتے تھے نہایت عاجزی اور انکساری سے بات کرتے تھے۔

☆.....☆

جب سے علی ان کی زندگی میں آیا تھا۔ ان کے لب بات بے بات مسکرانے لگے تھے۔ سائرہ نے ان کو اس طرح خوش پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ اب ان کے پاس کم ہی جاتی تھی۔ اسے لگتا تھا اب موسیٰ حیات کو سائرہ کی کمپنی کی ضرورت نہیں رہی۔ علی کا رویہ بھی اسے کچھ عجیب سا لگ رہا تھا۔ اسے محسوس ہوتا تھا کہ علی اس کی موجودگی کو پسند نہیں کرتا ہے۔ اس لیے اس نے بہتر یہی سمجھا کہ وہ موسیٰ حیات کی ذاتی زندگی سے دور ہی رہے اور ان دونوں باپ بیٹوں کو زیادہ سے زیادہ اکٹھے وقت گزارنے دے۔ برسوں بعد تو علی اپنے باپ کو ملا تھا۔ ایسے میں وہ اس کی کیفیت سمجھ سکتی تھی اس کو خود بھی مناسب نہیں لگتا تھا کہ وہ ان دونوں کے درمیان کباب میں ہڈی بن جائے مگر وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ موسیٰ حیات اب کیا سوچنے لگے ہیں اور ان کے دماغ میں علی کو پالنے کے بعد کیا سوچ سرائے لگی ہے۔ اسے تو تب پتا چلا جب محمد عبداللہ نے اسے آکر بتایا کہ انہوں نے سائرہ کو ہمیشہ کے لیے علی کی زندگی میں شامل کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے مگر وہ اس سلسلے میں اس وقت تک کوئی قدم نہیں اٹھائیں گے جب تک سائرہ کوئی مثبت جواب نہیں دے گی۔ یہ بات سن کر سائرہ کے لبوں پر بے اختیار ایک حسین مسکراہٹ رقص کرنے لگی تھی اور اس کے بغیر کچھ کہے ہی محمد عبداللہ



# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✦ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسجے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

✦ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

✦ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

# WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on  
Facebook

[fb.com/paksociety](https://fb.com/paksociety)



[twitter.com/paksociety](https://twitter.com/paksociety)



سمجھ گئے تھے کہ ان کی بیٹی دل و جان سے اس خوب صورت بندھن میں بندھنے کے لیے تیار ہے اور پھر ایک خوب صورت شام میں چند مہمانوں کی موجودگی میں سائرہ کو علی کے ساتھ نکاح کے حسین بندھن میں باندھ دیا گیا۔ موسیٰ حیات نے سڈنی کے ایک مشہور ساحل کے کنارے علی اور سائرہ کے لیے ایک خوب صورت گھر خریدا تھا۔ موسیٰ کی خواہش تھی کہ وہ دونوں اپنی نئی زندگی کا آغاز اسی گھر سے کریں۔ اس لیے نکاح کے فوراً بعد وہ دونوں نئے گھر میں منتقل ہو گئے تھے۔

سائرہ کو اپنے خاندان کا حصہ بنا کر موسیٰ بہت خوش تھے۔ وہ مائدہ کو تو واپس نہیں لاسکتے تھے مگر انہیں یقین تھا کہ اس روز آسمانوں پر مائدہ کی روح بہت خوش ہوگی۔ انہیں اس روز عروہ بھی بہت یاد آئی تھی۔ ان کا ارادہ تھا کہ اب وہ کچھ عرصے کے لیے پاکستان چلے جائیں۔ وہ اپنے ملک کے لیے بہت کچھ کرنا چاہتے تھے اور اب جب کہ ان کی زندگی میں کوئی حسرت نہیں رہی تھی۔ اس لیے اپنے لوگوں میں جا کر وہ ان کے دکھ کو کم کرنا چاہتے تھے۔ اس بار ان کا دوست محسن بھی ان کے ساتھ تھا۔ کراچی سے ان دونوں کی بہت تلخ یادیں وابستہ تھیں مگر وہ اور محسن ان تلخ یادوں کو بھلا کر ایک نئے سرے سے اپنی زندگی کا آغاز کرنا چاہتے تھے۔ علی کے حوالے سے اب وہ بالکل بھی فکر مند نہیں تھے۔ انہیں اپنے انتخاب سائرہ پر پورا بھروسہ تھا کہ وہ علی کی ایک بہترین ہمسفر ثابت ہوگی۔ وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ اس رشتے کے حوالے سے علی کیا سوچ رہا ہے اگر انہیں اس کے ارادوں کی خبر ہوتی تو وہ اسے بھی اس رشتے کے لیے راضی نہ کرتے۔

سائرہ کو رخصت کرنے کے بعد محمد عبداللہ مائدہ کی قبر پر چلے گئے اور بہت دیر تک اس کی قبر کے پاس بیٹھ کر اپنی زندگی کے سو دوزیاں کا حساب کرتے رہے، وہ جانتے تھے کہ مرتے وقت وہ ان سے ناراض تھی مگر اب انہوں نے ہر لحاظ سے ایک بہترین انسان کا سائرہ کے لیے انتخاب کیا تھا جس پر انہیں یقین تھا کہ مائدہ کی ساری ناراضی بھی ختم ہوگئی ہوگی۔ اندھیرا جیسے ہی بڑھنے لگا وہ اسلامک سینٹر چلے گئے۔ ان کا زیادہ تر وقت اب اسلامک سینٹر میں ہی گزرتا تھا۔ انہوں نے قرآن کے ساتھ ساتھ حدیث اور فقہی علوم پر بھی عبور حاصل کر لیا تھا۔ لوگ اپنے دینی مسائل کے لیے اکثر ان سے رجوع کرتے تھے۔ وہ اپنی پچھلی زندگی کی طرف دیکھتے تھے تو انہیں احساس ہوتا تھا کہ انہوں نے کس قدر غلیظ اور گناہوں میں لتھڑی ہوئی زندگی گزاری تھی مگر اب ان کی زندگی کیا بدلی، ان کے اندر سے غم اور پریشانیوں کا احساس جیسے رخصت ہو گیا تھا۔ اب انہیں صرف ایک ہی بات کی فکر رہتی تھی کہ وہ اپنے کسی عمل سے اپنے رب کو ناراض نہ کریں۔ وہ ہر لمحہ اپنے رب کو راضی کرنے کی کوشش میں لگے رہتے تھے۔ انہیں خوشی تھی کہ موسیٰ حیات نے لوگوں کی خدمت کو اپنی زندگی کا نصب العین بنا لیا ہے۔ موسیٰ کے تمام فلاحی منصوبوں میں وہ ان کے ساتھ تھے۔ وہ اپنے استاد محترم کے پاس بھی کافی وقت گزارتے تھے۔ ان کے استاد کا حکم تھا کہ اب وہ آسٹریلیا سے باہر جا کر دین کی تبلیغ کریں۔ سو وہ ان کے حکم پر کچھ عرصے کے لیے فرانس چلے گئے۔ وہ بہت خوشگوار حالات میں فرانس گئے تھے مگر یہ نہیں جانتے تھے کہ جب واپس آئیں گے تو ایک اور آزمائش ان کی منتظر ہوگی۔

☆.....☆

”تم مجھے کتنا چاہتی ہو؟“ یہ وہ پہلا سوال تھا جو علی نے اپنے کمرے میں آتے ہی سائرہ سے کیا تھا۔ وہ دلہن بنی اتنی خوب صورت لگ رہی تھی کہ اسے لگا کہ علی سب سے پہلے اس کے حسن کو سراہے گا مگر آنے والے نے تو بہت عجیب سا سوال اس سے کر دیا تھا۔ وہ خاموش رہی۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اسے



یہ سوال ہی انتہائی غیر مناسب لگا تھا۔  
 ”سائرہ! مجھے بتاؤ کہ تم مجھے کتنا چاہتی ہو؟“ اس بار علی کی آواز اونچی ہو گئی تھی۔ سائرہ کو اس کے لہجے سے خوف محسوس ہو رہا تھا۔

”میں آپ کو بہت چاہتی ہوں علی!“ سائرہ نے علی کی طرف دیکھ کر کہا۔ اسے لگا کہ اس کا شوہر اب اس کے جواب سے مطمئن ہوا مگر علی کے چہرے کے تاثرات سے لگ رہا تھا کہ وہ بالکل بھی مطمئن نہیں ہوا۔  
 ”کوئی ثبوت؟“ اب اگلا سوال کیا گیا۔

”آپ کو کیسا ثبوت چاہیے؟“ سائرہ نے بھی اسی انداز میں پوچھا جس انداز سے علی اس سے سوال و جواب کا یہ کھیل کھیل رہا تھا۔  
 ”اٹھو۔“ علی نے اب اسے حکم دیا۔

وہ اس کے حکم کی تعمیل میں بیڈ سے اتری تو علی اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے کمرے میں موجود کھڑکی کے قریب لے آیا۔ اس کھڑکی سے سمندر کا نہایت شاندار نظارہ کیا جاسکتا تھا۔

”اس کھڑکی سے نیچے سمندر میں چھلانگ لگا دو۔ مجھے تمہاری محبت کا یقین آ جائے گا۔“ علی انتہائی سنجیدگی سے کہتا ہوا کھڑکی کی دوسری طرف کھڑا ہو گیا۔

سائرہ نے ایک نظر کھڑکی سے نظر آتے خاموش اور گہرے سمندر کی طرف نگاہ ڈالی اور دوسری نظر اپنے شوہر کی طرف ڈالی جس کی ذہنی حالت اسے ٹھیک نہیں لگ رہی تھی۔ وہ کچھ دیر کھڑکی کے پاس کھڑی رہی اور پھر دوبارہ سے اپنے بیڈ پر آ کر بیٹھ گئی۔ ساری رات علی اسے شدید قسم کے ذہنی تشدد کا نشانہ بنا تا رہا۔ یہ سب کچھ اس کے لیے نیا نہیں تھا۔ اس کا باپ اس کی ماں کو مرتے دم تک ذہنی و جسمانی تشدد کا نشانہ بنا تا رہا تھا۔ مگر اب کی بار ہدف اس کی اپنی ذات تھی اس لیے تکلیف بھی زیادہ ہوئی تھی۔ علی تمام رات اسے وقفے وقفے سے کیتھی کی بے وفائی کی داستانیں سناتا رہا اور وہ خاموشی سے سنتی رہی۔ وہ چاہتی تھی کہ علی اپنے اندر موجود تمام نفرت اور غصہ باہر نکل دے اور ایسا ہی ہوا تھا۔ علی وہ تمام نفرت اور غصہ وقفے وقفے سے سائرہ کے اندر منتقل کرتا رہا۔ ہر لڑکی کے اپنی نئی زندگی کے حوالے سے کچھ خواب ہوتے ہیں اور ایسے ہی کچھ خوب صورت خواب سائرہ نے دیکھے تھے۔ علی موسیٰ حیات جس کے تا عمر ساتھ کی ہر لمحہ اس کے دل نے تمنا کی تھی کاتب تقدیر نے اس کے نصیب میں علی کا ساتھ لکھ دیا تھا مگر یہ وہ علی نہیں تھا جس کے دھیمے مزاج کی وہ گرویدہ تھی۔ یہ تو کوئی انتہائی اذیت پسند انسان تھا جسے سائرہ کو اذیت دینے میں لطف آتا تھا۔ وہ روزانہ ہی اسے اذیت دینے کے نئے نئے طریقے ڈھونڈا کرتا تھا۔ اسے روکنے والا بھی کوئی نہیں تھا۔ محمد عبداللہ اور موسیٰ حیات دونوں ان دنوں سڈنی سے باہر تھے۔ ایسے میں علی کے پاس بھرپور موقع تھا کہ وہ سائرہ کو اپنے غصے اور نفرت کا نشانہ بناتے، وہ سائرہ کو تب تک اذیت دیتا رہا جب تک سائرہ کے صبر کی حد نہیں ہو گئی۔ پورے چھ ماہ تک سائرہ اس کے ہر ظلم اور تکلیف کو برداشت کرتی رہی۔ موسیٰ حیات اور محمد عبداللہ سے تقریباً اس کی روزانہ ہی بات ہوتی تھی اور ان دونوں کو اس نے یقین دلایا تھا کہ وہ علی کے ساتھ بہت خوش ہے اور ایسا ہی یقین علی نے بھی ان دونوں کو دلایا تھا۔ سائرہ اور علی کے درمیان ایک خاموش معاہدہ تھا کہ وہ دونوں اپنے جھگڑوں کی خبر اپنے بڑوں کو نہیں ہونے دیں گے اور چاہے جو کچھ ہو وہ اپنے جھگڑوں کو صرف اپنی ذات تک ہی محدود رکھیں گے مگر جب جھگڑے حد سے بڑھ جائیں تو جو لوگ ہمارے



دل کے قریب ہوتے ہیں انہیں کسی نہ کسی طرح خبر ہو ہی جاتی ہے۔ سائرہ اپنی محبت سے علی کی ذہنی حالت کو بدلنے کی کوشش کرتی رہتی تھی مگر علی ہر بار اس کو بہت بری طرح دھکارتا رہتا تھا۔ وہ علی کی بے رخی سہتے سہتے تھک سی گئی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ علی کو اس سے جتنے بھی شکوے ہیں وہ علی اب ختم کر دے اور وہ ویسا ہی علی بن جائے جسے پہلی نظر میں دیکھتے ہی وہ اپنا دل ہار گئی تھی مگر وقتی طور پر تو اسے ایسا کچھ ہوتا نظر نہیں آ رہا تھا۔ علی کا تلخ رویہ ہی صبح و شام اس کا مقدر تھا۔ اس کی محبت، آنسو، آہیں، سسکیاں سب علی کا رویہ بدلنے میں ناکام رہے تھے۔ اسے لگتا تھا کہ اس کے اندر کی آرٹسٹ بھی مر گئی ہے۔ اس تمام عرصے میں بحیثیت مصور علی کو بہت کام مل رہا تھا اور اس کی شہرت میں اضافہ ہو رہا تھا مگر سائرہ کے کینوس پر اب کوئی رنگ نہیں ابھرتا تھا۔ دن اور رات کا سفر جاری و ساری تھا۔ جتنا اذیت ناک دن نکلتا تھا، رات کے سیاہ رنگ میں بھی ویسی ہی تلخی ہوتی تھی۔ کچھ دنوں سے وہ بہت خاموش تھی۔ اس نے علی کے ساتھ الجھنا بھی اب ختم کر دیا تھا۔ وہ کسی روبروٹ کی طرح گھر کے کام کرتی تھی۔ علی کی اذیت سہتی تھی اور اسی طرح دن کا اختتام ہو جاتا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ اب وہ کبھی بھی علی کو اپنی محبت کا یقین نہیں دلا سکے گی اور ایک روز مایوسی کے عالم میں اس نے خود کو سمندر کی لہروں کے سپرد کر دیا مگر سمندر کی لہروں نے اسے واپس اچھال دیا کیوں کہ ابھی زندگی کو اس کی ضرورت تھی۔

☆.....☆

علی مسلسل کئی راتوں سے جاگ رہا تھا اگر ذرا سی دیر کو اس کی آنکھ لگ بھی جاتی تو ہوش کی دنیا میں آنے میں اسے زیادہ وقت نہیں لگتا تھا۔ وہ کئی روز سے سڈنی کے اس اسپتال میں موجود تھا جہاں اس کی زندگی سائرہ زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا رہنے کے بعد کومہ میں چلی گئی تھی۔ علی روزانہ ہی گھنٹوں بیٹھ کر اسے دیکھتا رہتا تھا جو علی کی اذیت سہتے سہتے اس حال کو پہنچ چکی تھی۔ علی سے موسیٰ حیات اور محمد عبداللہ دونوں ہی سخت ناراض تھے۔ موسیٰ نے تو اسے خبردار کیا تھا کہ اگر سائرہ کو کچھ ہوا تو وہ ساری زندگی ان کی شکل دیکھنے کو ترس جائے گا۔ محمد عبداللہ اسے کہتے تو کچھ نہیں تھے مگر ان کی نظروں میں اب اس کے لیے اپنائیت کا کوئی جذبہ نہیں تھا۔ اس کا دل جانتا تھا کہ وہ ان دونوں کا سامنا کیسے کرتا تھا۔ وہ تو اپنے آپ سے چھپتا پھرتا تھا۔ اس کا اپنا حال بھی دیوانوں جیسا ہی تھا۔ ملگجے چلے اور بکھرے ہوئے بالوں کے ساتھ پہلی نظر میں اسے دیکھ کر کوئی بھی پہچان نہیں سکتا تھا کہ وہ نامور مصور علی موسیٰ حیات ہے۔ اب تو اس کی ساری تصویریں اپنے رنگ کھو چکی تھیں۔ وہ کیسے سائرہ کو اپنی زندگی میں واپس لے کر آتا اسے تو خود اس نے اپنے ہاتھ سے موت کا راستہ دکھایا تھا۔ اسے یقین تھا کہ سائرہ آنکھیں کھول دے گی۔ وہ علی کی التجاؤں کو سن کر اس دنیا میں واپس لوٹ آئے گی اور تب وہ اسے بتائے گا کہ اسے سائرہ کے بغیر رہنا نہیں آتا حالانکہ اب تو وہ روزانہ ہی اس سے یہ بات کرتا تھا۔

سائرہ سے محبت تو اسے اسی دن ہو گئی تھی جب پہلی بار آرٹ اسکول کمپنیشن میں اس نے سائرہ کو دیکھا تھا اور بے اختیار اس کے دل نے تمنا کی تھی کہ یہ لڑکی ہمیشہ کے لیے اس کی ہم سفر بن جائے، ابھی اس کا دل ایک خوشگوار سی تان پر دھڑکنا شروع ہوا تھا کہ ایک روز اس کی ملاقات سائرہ اور اس کے منگیتیر ایرک سے ہو گئی تب اسے پہلی بار پتا چلا تھا کہ محبت کی پہلی چوٹ کتنی تکلیف دہ ہوتی ہے اور وہ اس دن کے بعد کئی راتیں سکون سے سو نہیں پایا تھا۔ کچھ دنوں بعد اپنے کالج میں سائرہ کو ایک بار پھر اپنے سامنے



دیکھ کر اس کی آنکھوں نے پھر سے اس کے ساتھ کے سنے دیکھنے شروع کر دیے تھے۔ حالانکہ وہ جان چکا تھا کہ سائرہ عنقریب کسی اور کی دلہن بن جائے گی مگر وہ اپنے دل کو کیسے سمجھاتا جو ہر بار سائرہ کو دیکھ کر ایک خوشگوار انداز میں دھڑکنے شروع ہو جاتا، وہ اس سے دوستی کرنا چاہتا تھا، اس کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزارنا چاہتا تھا مگر اس کی نوبت ہی نہیں آئی، اسے تو بہت بعد میں پتا چلا کہ کیتھی کے ساتھ اسے دیکھ کر سائرہ اس سے بدظن ہوئی تھی ورنہ تو وہ کبھی بھی ہمدردی کی آڑ میں کیتھی کو اپنے قریب نہیں آنے دیتا اگر سائرہ اس سے بدظن ہوئی تھی تو وہ بھی ایرک والے معاملے کو اسے ناراض تھا۔ ایرک اس کا دوست نہیں تھا مگر آہستہ آہستہ وہ اس کا دوست بنا چلا گیا۔ اس نے علی کو سائرہ سے مزید بدظن کیا۔ علی کے دل میں پلٹی غلط فہمی کی دیواریں مزید وسیع ہوتی چلی گئیں اور وہ سائرہ کے نام سے بھی دور بھاگنے لگا۔ انہی دنوں اس کی زندگی میں کیتھی کا عمل دخل بہت زیادہ بڑھنے لگا تھا۔ وہ جو اپنے باپ کی موت کے بعد اپنی زندگی میں آنے والے کچھ بھیانک انکشافات کی زد میں تھا اور اپنی تلاش کے سفر پر نکلا تھا مگر اس سفر میں بھی سوائے آنسوؤں اور تنہائیوں کے اس کے ہاتھ کچھ نہیں آیا تھا۔ ایسے میں کیتھی کی ہمدردی نسلی اور دلاسے اس کے لیے اکسیر کا کام کرتے تھے۔ اسے لگتا تھا کہ جسے کوئی اس کے زخموں پر مرہم رکھ رہا ہو۔ رفتہ رفتہ وہ کیتھی کا عادی ہوتا چلا گیا۔ ان دنوں اسے لگتا تھا کہ اگر کیتھی نہیں ہوگی تو وہ زندہ کسے رہے گا۔ اس نے کیتھی سے منگنی کر لی تھی۔ اب سائرہ کے بارے میں وہ کچھ سوچنا بھی نہیں چاہتا تھا مگر سائرہ پھر بھی روزانہ ہی اس کے خوابوں میں چلی آتی تھی۔ کیتھی جس تیزی سے اس کی زندگی میں داخل ہوئی تھی اسی تیزی سے واپس بھی چلی گئی۔ علی نے تو اپنی اور کیتھی کی آئندہ زندگی کے حوالے سے بہت سے منصوبے بنا لیے تھے مگر کیتھی نے بہت جلد اپنی اصلیت علی پر ظاہر کر دی اور اسے بتا دیا کہ اسے صرف علی کی دولت سے محبت تھی، علی کی ذات میں اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ کیتھی کا دیا ہوا زخم بہت گہرا تھا۔ اگر موسیٰ حیات اسے نہ ملتے تو وہ شاید اسی زخم کے زیر اثر اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیتا مگر موسیٰ حیات سے ملنے کے بعد اسے زندگی خوب صورت لگنے لگی تھی۔ اسے احساس ہوا تھا کہ باپ کا رشتہ کیا ہوتا ہے۔ محبت تو نواز شاہ نے بھی اس سے بہت کی تھی مگر موسیٰ حیات کی محبت کے آگے اسے ان کی محبت بہت چھوٹی لگنے لگی تھی۔ اپنے باپ کے ساتھ سائرہ کی بے تکلفی دیکھ کر اسے ایک خوش گوار قسم کی حیرت ہوئی تھی مگر اپنے باپ کے ساتھ اب وہ اکیلے وقت گزارنا چاہتا تھا۔ ایسے میں وقت بے وقت سائرہ کی آمد اسے بری لگنے لگی تھی۔ سائرہ نے بھی شاید اس کے گریز کو محسوس کر لیا تھا، اس لیے اس نے اب ان کی طرف آنا بہت کم کر دیا تھا۔ وہ ابھی اپنے اس نئے رشتے کو ٹھیک طرح محسوس بھی نہیں کر پایا تھا کہ ایک روز اس کے باپ نے اس کی اور سائرہ کی شادی کا ذکر چھیڑ دیا۔ وہ جو ابھی کیتھی کے دیئے ہوئے زخموں کو مکمل طور پر بھول نہیں پایا تھا۔ ایسے میں کسی لڑکی کے ساتھ ایک نارمل زندگی کیسے شروع کر دیتا اور وہ لڑکی بھی کوئی عام لڑکی نہیں بلکہ اس کی محبت سائرہ ہو، وہ اپنے باپ کو انکار کرنا چاہتا تھا مگر یہ بات کرتے ہوئے ان کی آنکھوں میں جو ننھے ننھے سے دیئے جلنے لگے تھے وہ ان کو بھانپ نہیں پایا اور اس نے ان کی مرضی کے آگے سر جھکا دیا۔ وہ یہ بھی سمجھتا تھا کہ سائرہ نے کیسے طریقے سے یہ پیغام اس کے باپ تک پہنچایا ہے۔ اسے سائرہ پر بہت غصہ تھا اور اسی غصے، نفرت اور انتقام کے ساتھ اس نے اپنی ازدواجی زندگی کا آغاز کر دیا۔ شادی کی پہلی ہی رات سے علی نے اسے شدید قسم کے ذہنی تشدد کا نشانہ بنانا شروع کر دیا۔ کوئی اور لڑکی ہوتی تو شاید وہ علی کو چھوڑ کر جا چکی ہوتی مگر



سائرہ نہ جانے کس مٹی کی بنی ہوئی تھی جو علی کے ہر ظلم کو نہس کر سہہ جاتی تھی۔ وہ اس کی برداشت دیکھ کر کبھی کبھی بہت حیران رہ جاتا تھا۔ سائرہ کو اذیت دے کر وہ خود کہاں سکون سے سو پاتا تھا۔ اپنی بے سکونی کو ختم کرنے کے لیے وہ سکون آور ادویات کا استعمال کرتا، گھنٹوں گھر سے باہر رہتا مگر اسے سکون نہیں ملتا تھا۔ دن رات اس کی ذات کو بے مول کرنے والا علی اکیلے میں خود کو ہزار بار لعنت ملامت کرتا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ وہ کوئی ذہنی مریض بننا جا رہا ہے۔ اسے رات کو نیند نہیں آتی تھی۔ نیند کی گولیاں بھی اسے پرسکون نیند دینے میں ناکام رہی تھیں۔ سائرہ کی اس زندگی میں آنے کے بعد اس پر تو جیسے کامیابیوں کے دروازے کھل گئے تھے۔ اس کی تصویریں ہاتھوں ہاتھ بکنے لگیں تھیں مگر وہ اس کامیابی کو ہمیشہ اپنی قسمت اور محنت قرار دیتا تھا۔ وہ گھر کے باہر ایک مہذب انسان تھا مگر گھر کے اندر اس کی ساری تہذیب دم توڑ جاتی تھی۔ سائرہ کو دیکھ کر اس پر ایک عجیب قسم کی وحشت سوار ہو جاتی تھی۔ اس کی اذیتوں کا سلسلہ تو ختم نہیں ہوا مگر اس کی سائرہ اب بہت خاموش رہنے لگی تھی اور پھر ایک روز جب وہ گھر سے باہر تھا اسے خبر ملی کہ سائرہ نے اپنی جان لینے کی کوشش کی ہے۔ زندگی میں پہلی بار اسے محسوس ہوا تھا کہ جیسے اس کی جان نکلی جا رہی ہو اور اسے لگتا تھا کہ اس کا پورا وجود پچھتاوے کی آگ میں جل کر ختم ہو جائے گا۔

سائرہ کے کوڑے میں جانے کے بعد اسے معلوم ہوا تھا کہ وہ کتنی معروف آرٹسٹ ہے۔ اس کے کمرے کے اندر اور باہر ہر وقت پھولوں کا ڈھیر لگا رہتا تھا۔ پھولوں کا تحفہ دینے والے تمام لوگ اس کے پرستار تھے جو اس کی زندگی کی دعائیں مانگتے نہیں تھکتے تھے۔ علی جب اس کے پاس بیٹھا ہوتا تو اسے اپنے آنسوؤں پر قابو نہیں رہتا تھا۔ اس کے دل میں اور زیادہ شدت سے یہ احساس بیدار ہو جاتا تھا کہ اس نے سائرہ کو ہمیشہ اپنی نفرت اور انتقام کا نشانہ بنایا ہے۔ وہ اس کے پاس بیٹھ کر روتارہتا تھا۔ ہاتھ جوڑ کر کتنی ہی بار اس سے معافیاں مانگ چکا تھا کہ ایک بار وہ آنکھیں کھول کر اس کی معافی کو قبول کر لے وہ دوبارہ کبھی بھی اسے دکھ نہیں دے گا مگر وہ آنکھیں ہی تو نہیں کھولتی تھی۔ اسے دیکھ کر لگتا تھا کہ وہ بہت پرسکون نیند لے رہی ہے مگر علی کو اب اس کی اس طویل نیند سے شدید قسم کی الجھن ہونے لگی تھی مگر وہ بے بس تھا، اس کی اس حالت کو دیکھ کر موسیٰ حیات کا دل بھی پسیج گیا تھا۔ محمد عبداللہ کا رویہ بھی اب اس کے ساتھ بہتر ہو گیا تھا۔ ان کی زبانی سائرہ کی ایرک کے ساتھ زبردستی شادی کی باتیں سن کر وہ اپنے رویے پر مزید شرمندگی محسوس کرنے لگا تھا۔ وہ اب ان کے ساتھ اسلامک سینٹر بھی جانے لگا تھا۔ اسے خدا سے دعا مانگنے کا طریقہ نہیں آتا تھا۔ محمد عبداللہ نے اسے وہ طریقہ سکھایا، خدا کے آگے اس نے کتنے ہی سجدے کر ڈالے تھے۔ اس کے سجدوں، دعاؤں اور التجاؤں کو ایک روز شرف قبولیت مل ہی گیا جب اس کے سامنے اس کی زندگی نے آنکھیں کھول دیں۔ بہار نے اپنی آمد کا اعلان کر دیا۔ خزاں کے طویل موسم نے بالآخر رخصت باندھ ہی لی تھی۔ سائرہ نے آنکھیں کھول دیں تھیں اور اس کے ساتھ ہی علی کی ڈوبتی سانسوں کو قرار مل گیا اور اب کی بار اس نے سائرہ کو اس کے حصے کی خوشیاں لوٹائی تھیں۔

”آپ مجھے کتنا چاہتے ہیں؟“ علی نے اس سوال پر بے اختیار گردن گھما کر سائرہ کی طرف دیکھا جسے اسپتال سے گھر منتقل ہوئے ابھی کچھ ہی دن ہوئے تھے اور اس وقت بستر پر دراز سائرہ نے ایک نہایت ہی عجیب سوال اس سے کر دیا تھا۔

”علی! آپ مجھے بتائیں کہ آپ مجھے کتنا چاہتے ہیں؟“ سائرہ نے دوبارہ وہی سوال کیا۔ اس کا لہجہ



انتہائی سنجیدہ تھا۔ نہ جانے وہ علی سے کیا پہلوانا چاہ رہی تھی۔  
 ”میں تمہیں تمہاری سوچ سے بھی زیادہ چاہتا ہوں سائرہ۔“ علی نے نہایت گھمبیر لہجے میں اس کو اپنے قریب کرتے ہوئے کہا مگر علی کو لگا اس کے اس محبت بھرے جملے کا سائرہ پر کوئی اثر نہ ہوا ہو۔  
 ”کوئی ثبوت!“ ایک اور سوال پوچھا گیا۔

”تمہیں کیسا ثبوت چاہیے۔“ علی نے گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔  
 ”آئیں..... میرے ساتھ چلیں۔“ سائرہ یہ کہہ کر بیڈ سے اتری اور علی کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے کمرے کی کھڑکی کے پاس لے آئی۔ اس کھڑکی سے روزانہ کی طرح سمندر اپنا خوب صورت نظارہ کروا رہا تھا۔  
 ”اس کھڑکی سے نیچے سمندر میں چھلانگ.....“ اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گئی۔ علی نہایت غور سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ وہ اسے ماضی کے کچھ اذیت ناک لمحات یاد کروا رہی ہے مگر وہ اپنی محبت کو ثبات کرنے کے لیے کسی بھی آزمائش سے گزرنے کے لیے تیار تھا اور اگر سائرہ کو اس کے چھلانگ لگانے سے محبت کا یقین آتا ہے تو علی نے سوچ لیا تھا کہ وہ یہ بھی کر گزرے گا۔  
 ”اس کھڑکی سے نیچے سمندر میں چھلانگ مت لگائیں بلکہ جو نیچے خوب صورت سائبرنٹ نظر آ رہا ہے وہاں لے جا کر مجھے اچھا سا کھانا کھلائیں۔“ اتنا کہہ کر وہ مسکرا کر علی کی طرف دیکھنے لگی۔  
 علی کو اس کی مسکراہٹ دیکھ کر یوں لگا کہ جیسے پوری کائنات مسکرا رہی ہو۔ سڈنی کے ساحل سمندر کے قریب اس ویران گھر میں بھی بالآخر بہاروں نے دستک دے دی تھی اور وہ بھی محبت کی انوکھی خوشبوؤں سے مہکتے لگا تھا۔

میرے دل میرے مسافر  
 ہوا پھر سے حکم صادر  
 کہ وطن بدر ہوں ہم تم  
 دیں گلی گلی صدا میں  
 کریں رخ نگر نگر کا

Downloaded from paksociety.com

☆.....☆

علی اور سائرہ کے درمیان تلخیوں کا خاتمہ کیا ہوا، موسیٰ حیات کی زندگی میں بھی سکون کے پل لوٹ آئے تھے۔ وہ اب مستقل طور پر کراچی منتقل ہو گئے تھے۔ ہاں البتہ اپنے بیٹے اور بہو سے ملنے کے لیے آتے رہتے تھے۔ محمد عبداللہ کی تبلیغ کا سفر جاری و ساری تھا۔ ان کے استاد محترم ان پر جو ذمہ داری لگاتے تھے وہ اسے احسن طور پر نبھانے کی کوشش کرتے تھے۔ اپنی بیٹی کو خوش دیکھ کر انہیں لگتا تھا کہ اب انہیں کوئی غم نہیں ہے۔ زندگی میں ایک طویل سفر کے بعد ان مسافروں کو ستانے کا موقع مل گیا تھا مگر کون جانے کسی مسافر پر پھر کوئی آزمائش آجاتی اور وہ ایک نئے سفر پر نکل پڑتا اور پھر ایک نئی کہانی کسی مسافر کا انتظار کر رہی ہوتی۔ زندگی نے ان سب کو آزمائشوں کے طویل سفر کے بعد سکون کی چھاؤں میں لایٹھایا تھا اور وہ سب پر امید تھے کہ آنے والے پل بھی اتنے ہی خوب صورت ہوں گے۔ کیوں کہ وہ سب محبت کی ڈور سے بندھے تھے اور انہیں یقین تھا کہ اب یہ ڈور کبھی نہیں ٹوٹے گی۔

☆.....☆ ختم شد ☆.....



# فصلہ

لہلاتے کھیت کے بیج گڈ ڈنڈی پر چلتے پورے پانچ سال بعد اس نے اپنے گاؤں کا رخ  
ہوئے وہ خود کو بہت پرسکون محسوس کر رہا تھا۔ آج کیا تھا۔ یہ وہی گاؤں تھا جہاں وہ پیدا ہوا جہاں وہ



READING  
Section



”بس کر دو مہر و نہ کرو اس قدر ماتم اپنی قسمت  
 پر تقدیر میں جو لکھا ہے وہ تو ہوتا ہی ہے نہ کرو خود کو  
 اس قدر ہلکان اس قدر رو رو کر۔“ شہر بانو اور ماہ  
 رخ کب سے اس کو بس یہی سمجھا رہی تھیں اور مہر و  
 تو جیسے عقل و خرد سے بے گانہ ہو چکی تھی کچھ سمجھ ہی  
 نہیں رہی تھی اس کو دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے بس اب  
 اس کو روٹا ہے اور صرف روٹا ہے۔

”کیسے نہ روؤں میرے ساتھ جو ہو رہا ہے وہ  
 کیا کسی کو نظر نہیں آ رہا، کیا داد کا نہیں کو کوئی نہیں

بڑا ہوا وہ اپنی ہی دہن میں چلتا جا رہا تھا۔ اس کو  
 آج بھی اس کے گلے کو چپے نہیں بھولے تھے۔ آخر  
 بھولتا بھی کیوں اس کا سب کچھ تو نہیں تھا۔ جیسے  
 جیسے حویلی قریب آ رہی تھی ویسے ویسے اس کے  
 دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہو رہی تھیں اس کے  
 خیال میں سب اسے معاف کر دیں گے مگر کیا وہ  
 اسے معاف کرے گی جس کے لیے وہ آج لوٹ  
 آیا تھا۔

☆.....☆





روک سکتا کب تک وہ ہمیں اپنے غلط فیصلے کے  
بھینٹ چڑھاتے رہیں گے۔“ مہر و جیسے پھٹ  
پڑی تھی۔

”نہ میری دھی یہ غلط فیصلہ نہیں یہ تیری ادھی  
کی زندگی کا سوال ہے۔“ اماں سائیں نہ جانے  
کب سے دروازے پر کھڑی ان کی باتیں سن  
رہی تھیں اس کی آخری بات سن کر اندر آ کر اس کو  
سمجھانے لگیں۔

”اماں سائیں اس حویلی میں وہی ہوتا ہے جو  
اس حویلی کے مرد چاہتے ہیں۔ یہاں کی عورتوں کی  
اپنی کوئی زندگی نہیں ہے اماں سائیں آپ ہماری  
بڑی ہیں۔ آپ تو جانتی ہیں سب کچھ پھر کیوں  
ہورہا ہے ایسا میرے ساتھ یہ کہتے ہوئے وہ اماں  
سائیں کے قدموں میں بیٹھتی چلی گئی۔

”میری دھی میں بے بس ہوں۔“ یہ کہتے  
ہوئے اماں سائیں کمرے سے چلی گئیں۔

”دیکھو مہر و اگر بھائی نے داہن آنا ہوتا تو وہ  
جاتے ہی کیوں اور جانے والے تو کبھی لوٹ کر  
آتے ہی نہیں ہیں۔“ ماہ رخ اس کو سمجھانے لگی  
کیوں کہ وہ بھی اس مقام سے گزری تھی جہاں پر  
آج مہر و کھڑی تھی شاہ ویز بھی اس کے ساتھ وعدہ  
وفا کر کے گیا تھا اور لوٹ کر نہیں آیا اور بالآخر دادا  
سائیں نے یہی فیصلہ کیا تھا کہ اس کی شادی شاہ  
میران سے کر دی جائے۔

”دیکھو مہر و میری بہن شاہ سکندر تجھے چاہتا ہے  
تجھے خوش رکھے گا وہ۔“ شہر بانو اس کے گال پر پھیلے  
ہوئے آنسو صاف کرتے ہوئے بولی۔

”نہیں ادھی اس کی آنکھوں میں سوائے حرص و  
ہوس کے کچھ بھی نہیں ہے ادھی میں مرجاؤں گی مگر  
اس رشتے کو قبول ہرگز نہیں کروں گی۔“ مہر و ایک  
دفعہ پھر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

☆.....☆

”شاہ سائیں شاہ سائیں! خوش خبری ہے  
سائیں۔“ اللہ رکھا ہانپتا کا ہنپتا اوطاق میں ہی آ گیا  
جہاں حویلی کے سب ہی مرد بیٹھے ہوئے تھے۔

”کیا بات ہے اللہ رکھا اس قدر ہانپ کیوں رہا  
ہے تو۔“ دادا سائیں نے اس سے گرج کر پوچھا۔  
”وہ سائیں باہر شاہ سوار سائیں آئے ہیں۔“  
اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کو جوڑتے ہوئے کہا۔  
اس کا یہ کہنا تھا کہ گویا اوطاق میں بھونچال  
آ گیا۔

”یہ تو کیا کہہ رہا ہے؟ اللہ رکھا۔“ شاہ سائیں کو  
شاہ سوار کا نام سن کر ایک دم غصہ آ گیا۔

”شاہ سائیں میری گناہ گار آنکھوں نے شاہ  
سوار سائیں کو حویلی کے باہر دیکھا ہے۔“ اللہ رکھا  
نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا۔

”تم سچ کہہ رہے ہوناں اللہ رکھا میرا شاہ  
سوار آیا ہے باہر۔“ شاہ زاوار کو یقین کرنا مشکل  
ہو رہا تھا۔

”جی سائیں بالکل سچ۔“ اللہ رکھا نے  
جواب دیا۔

”شاہ زاوار یہ سن کر باہر کی جانب جانے لگے تو  
شاہ سائیں کی آواز پر انہیں رکتا پڑا۔

شاہ زاوار ہم نے اسے اس حویلی سے ہی نہیں  
بلکہ اپنی زندگیوں سے بھی نکال دیا ہے اس لیے  
اسے حویلی کے اندر بلانے کی ہرگز کوشش نہیں کرنا  
اس نے اور شاہ ویز نے ہمیں بہت دکھ دیئے  
ہیں۔“ دادا سائیں نے گرج دار آواز میں کہا۔

”مگر بابا سائیں میرا بیٹا ہے وہ۔ وہ یہی کہہ کر  
گیا تھا کہ وہ لوٹ کر آئے گا کیسے اسے ہم اپنی  
زندگی سے نکال سکتے ہیں۔“ یہ کہہ کر شاہ زاوار نے  
باہر کی جانب قدم بڑھا دیئے تھے۔

”نہر و شاہ زاوار تم نے سنا نہیں بابا سائیں نے  
کیا کہا ہے۔“ اب کے شاہ نواز نے انہیں روکنا



چاہا۔ آپ کے سب حکم مانوں گا۔“ یہ کہہ کر اس نے دادا

سامنے کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔

”معاف کر دیجیے ناں بابا سامیں وہ اپنے کیے

پر شرمندہ ہے۔“ شاہ بختیار جو کب سے ہونے

والی اس کارروائی کو دیکھ رہے تھے۔ باپ کے

سامنے آکر بھتیجے کی وکالت کرنے لگے۔ یوں تو

شاہ ویز کے دیئے ہوئے زخم ابھی ان کے دل میں

تازہ تھے مگر اس حویلی کے ایک اور بیٹے کو شاید وہ

کھونا نہیں چاہتے تھے وہ کیا بلکہ کوئی بھی نہیں۔ دادا

سامیں کہتے تھے سب ہی لڑکے اس حویلی کے مان

ہیں تو کون اپنا مان کھونا چاہے گا۔

”تم لوگ بھی ناں بہت دکھ دیتے ہو اور ہمیں

بھی نہ چاہتے ہوئے معاف کرنا پڑتا ہے۔“ یہ کہہ

کر دادا سامیں نے اس کے سر پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

”اللہ وسائی اللہ وسائی! شاہ زاوار نے حویلی

کی سب سے بڑی نوکرانی کو آواز دی۔

”جی سامیں حکم!“ اللہ وسائی، شاہ زاوار کی

آواز پر بھاگی دوڑی چلی آئی۔

جاؤ اندر جا کر سب کو بتاؤ شاہ سوار آیا ہے۔“

شاہ زاوار نے بیٹے کو سینے سے لگاتے ہوئے اسے

حویلی کے اندر اطلاع دینے کو کہا۔

”بابا سامیں یہ تیاری کیسی ہے حویلی میں کسی کی

شادی ہے کیا؟“ حویلی میں ہونی چہل پہل کو دیکھ

کر پوچھا تھا۔

”ہاں شادی ہے مہرو کی۔“ شاہ زاوار نے

اپنے لخت جگر سے نظریں چراتے ہوئے جواب دیا

جسے سن کر شاہ سوار کے دل کو ایک دم کچھ ہوا تھا۔

☆.....☆

شاہ امان اپنے بھائیوں اللہ دادا اور میر دادا کے

ساتھ اندرون سندھ کے ایک گاؤں میں رہتے

تھے جہاں ان کے باپ دادا کی بہت بڑی حویلی

تھی ان کے والد نے انتقال کے وقت شاہ امان کو

وہ اس حویلی کا سب سے چھوٹا بیٹا ہے۔ ہم

اسے اپنی زندگی سے نہیں نکال سکتے میرے جگر کا

کھڑا ہے وہ۔“ شاہ زاوار نے اپنے بھائی کے

سامنے سخت لہجے میں مگر نظریں نیچی رکھ کر

جواب دیا۔

”شاہ زاوار تم بھول رہے ہو شاید اس نے

ہماری حکم عدولی کی ہے اور جو ہمارے حکم کو نہیں

مانتے ہم اسے اپنی نظروں میں برداشت نہیں

کرتے۔“ شاہ زاوار کی بات پر دادا سامیں کا

غصہ ساتوں آسمان پر پہنچ گیا تھا۔

”ہم نے آپ کی حکم عدولی نہیں کی دادا سامیں

بلکہ اپنا حق مانگا تھا آپ سے۔“ شاہ سوار نہ جانے

کب سے اوطاق کے دروازے پر کھڑا تھا بالآخر

اندرا آتے ہوئے بولا۔

”ہمیں حویلی کے اندر گھسنے کی اجازت کس

نے دی اس حویلی کے دروازے تم نے اپنے لیے

خود بند کیے تھے۔“ دادا سامیں اس کو دیکھ کر آپے

سے باہر ہو گئے تھے۔

”نہیں دادا سامیں اس حویلی سے ہمارا بھی

اسی طرح رشتہ جڑا ہے جیسے باقی سب کا بس میں

نے اور شاہ ویز نے حصول علم کے لیے جو قدم

اٹھائے تھے شاید اس کا طریقہ غلط تھا۔“ شاہ

سوار یہ کہتے ہوئے دادا سامیں کے قدموں میں

بیٹھ گیا۔

”حصول علم نہیں لڑکے انگریزی تعلیم کہو جس

سے ہمیں سخت نفرت ہے۔“ دادا سامیں نے زہر

خند لہجے میں کہا۔

”آپ کو انگریزی تعلیم سے نہیں بلکہ شاید آپ

کو علم سے ہی نفرت ہے۔“ وہ یہ صرف سوچ سکا تھا

مگر بولا کچھ نہیں۔

”معاف کر دیجیے دادا سامیں اب آ گیا ہوں نا



یہی گدی نشینی کا فرض سونپا تھا۔  
شاہ نواز کو شادی کے بعد اللہ نے دو بیٹوں شاہ  
سجاد اور شان میران اور بیٹیوں شہر بانو اور مہر  
بانو سے نوازا۔

شاہ بختیار کی تین اولادیں تھیں۔ شاہ ویز، گل  
افشاں اور شاہ سانول۔ جب کہ شاہ زاوار کی بھی  
تین ہی اولادیں تھیں۔ شاہ میر، ماہ رخ، شاہ  
سوار۔

شاہ امان نے بیٹوں کی تو شادی کر دی مگر بیٹی کو  
نظر انداز کر دیا تھا انہی دنوں ان کا بھتیجا شاہ داوڑ  
اپنی بہن امینہ بی بی سے ملنے اکثر سوہیلی آتا تھا۔  
اس نے مہر النساء کو دیکھا اور اسے اپنا دل دے بیٹھا  
یہ سوچے بنا کہ اس کا انجام بہت برا ہوگا۔

جب اس بات کا علم بے جی کو ہوا تو انہوں نے  
اپنی بیٹی کو سمجھایا مگر وہ بھی کیا کرتی۔ محبت جب ہوتی  
ہے سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت کہاں رہتی ہے۔  
اس میں یا تو انسان ٹوٹ کر بکھر جاتا ہے یا پھر مکمل  
ہو جاتا ہے اور جو ٹوٹتے ہیں اور نہ مکمل ہوتے ہیں  
وہ فنا ہو جاتے ہیں۔

اور مہر النساء شاہ داوڑ کے عشق میں پور پور ڈوبتی  
چلی گئی لیکن جب اس کا علم شاہ امان کو ہوا تو گویا گھر  
میں قیامت برپا ہو گئی۔ بیٹی تو انہیں پہلے ہی پسند نہ  
تھی سو انہوں نے اسے حویلی کے تہ خانے میں بند  
کر دیا اور ایک رات اللہ وسائی جب کھانا دینے  
تہ خانے میں گئی تو وہاں مہر النساء مردہ حالت میں  
پڑی تھی اس نے خواب آور گولیوں سے خود کو ختم  
کر لیا تھا۔ مہر النساء، شاہ داوڑ کی محبت میں فنا ہو  
گئی تھی۔

مگر شاہ امان کو اس کا نہ کوئی دکھ ہوا نہ ملال البتہ  
بے جی یہ صدمہ برداشت نہ کر سکیں اور وہ بیٹی کی  
جداگی میں ہمیشہ کے لیے اس دار فانی سے کوچ  
کر گئیں۔

اس واقعے کو پندرہ برس بیت گئے تھے کوئی بھی

شاہ امان مزا جا ایک سخت گیر انسان تھے جو  
صرف اپنے بارے میں سوچتے تھے۔ کسی اور کا ان  
کو خیال ہی نہ تھا جس کی وجہ سے ان کے بھائیوں  
نے بہت ہی جلد ان کا ساتھ چھوڑ دیا مگر پھر بھی  
بھائی ہونے کے ناطے ملنے آتے رہتے تھے۔

اللہ داد اور میر داد طبیعتاً نرم مزاج واقع ہوئے  
تھے۔ وہ گاؤں والوں کا خیال رکھتے تھے۔ جب کہ  
شاہ امان کو اس چیز سے کوئی غرض نہیں تھی کہ کون  
کیسے جی رہا ہے۔

شاہ امان کے تین بیٹے تھے۔ شاہ نواز، شاہ  
بختیار اور شاہ زاوار جب کہ ایک بیٹی مہر النساء تھی۔  
شاہ امان بھی انہی میں سے ایک مرد تھے جو  
بیٹوں کو بیٹیوں پر فوقیت دیتے تھے۔

اللہ داد کی تین اولادیں تھیں۔ ایک بیٹا شاہ  
زمان اور دو بیٹی زہرہ بیگم اور زینت بی بی جب کہ  
میر داد کی دو اولادیں۔ ایک بیٹی آمنہ بی بی اور بیٹا  
شاہ داوڑ۔

شاہ امان کی حویلی میں تعلیم کا کوئی رواج نہ تھا۔  
یہاں کی بیٹی ہی نہیں بلکہ بیٹے بھی اس زیور سے  
محروم تھے وہ کہتے تھے کہ تعلیم سے انسان میں شعور  
پیدا ہوتا ہے اگر لوگ پڑھے لکھے ہوں گے تو ان  
کے سامنے آواز اٹھائیں گے جو ان کو بالکل بھی  
گوارہ نہ تھی۔

حویلی میں ہی نہیں بلکہ پورے گاؤں میں شاہ  
امان کی دہشت پھیلی ہوئی تھی گاؤں والے ان کو  
ادب سے شاہ سائیں کہہ کر بلاتے تھے۔

جب ان کے بچے بڑے ہوئے تو انہوں نے  
ان کی خوب دھوم دھام سے شادی کروادی۔

شاہ نواز کی شادی زہرہ بیگم سے ہوئی۔ شاہ  
بختیار کی شادی آمنہ بی بی سے ہوئی اور شاہ زاوار  
کی شادی زینت بی بی سے ہوئی۔



اس واقعے کو ذہن سے نہیں نکال سکا تھا۔ مہر و کے ذہن میں بھی ہلکے ہلکے نقوش موجود تھے۔

جب یہ واقعہ پیش آیا تب مہر و کی عمر سات سال تھی۔ جب کہ شاہ سوار نو سال کا تھا۔

شاہ امان نے اپنے بیٹوں کو علم کے نور سے محروم رکھا تھا مگر چاہتے تھے کہ ان کے پوتے کم از کم دس جماعتیں ہی پاس کر لیں بے جی جب تک زندہ رہیں حویلی کے سب بچوں کو قرآن شریف پڑھاتی رہیں۔

جیسے جیسے بچے بڑے ہوتے گئے ویسے ویسے وہ شعور کی منزلیں طے کرتے گئے ماہ رخ اور شاہ ویز ایک دوسرے کو چاہنے لگے۔ شاہ سوار اور مہر و بھی ایک دوسرے کو دل دے بیٹھے اور ساتھ جینے مرنے کی قسمیں کھانے لگے یہ سوچے بنا کہ اس حویلی میں محبت کرنا ایک جرم ہے اور اس کی سزا موت ہے مگر یہ محبت کے پروانے انجام سے بے خبر منزل کو پانے کی جستجو کرنے لگے۔

شاہ سوار اور شاہ ویز کو پڑھنے کا بے حد شوق تھا۔ وہ اسکول سے آ کر نہ صرف خود پڑھتے بلکہ گل افشاں، ماہ رخ، شہر بانو اور مہر و کو بھی چھپ کر دادا سائیں سے پڑھا دیا کرتے تھے۔ وہ دونوں فیصلہ کر چکے تھے دسویں پاس کرنے کے بعد وہ شہر جائیں گے مزید پڑھائی کے لیے۔

شاہ ویز ان دنوں میٹرک پاس کر چکا تھا۔ جب کہ شاہ سوار ابھی نویں جماعت میں تھا شاہ ویز نے دادا سائیں سے کالج میں داخلے کی بات کی تو انہوں نے صاف لفظوں میں منع کر دیا مگر انسان بھی کیا کرے جب کسی چیز کا شوق چڑھ جائے تو پھر کہاں وہ کسی کی سنتا ہے اور یہ تو بات تھی بھی علم کی پھر شاہ ویز نے کہاں رکنا تھا۔ سو ایک دن وہ بنا کسی کو بتائے گاؤں چھوڑ کر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد ماہ رخ کے دن انتظار میں گزرنے

لگے اور اس کے ایک سال بعد ہی شاہ سوار بھی شاہ امان کے سامنے دستِ سوا لی بن کر کھڑا ہو گیا تھا۔

”تمہیں بھی ہماری اجازت کی کیا ضرورت ہے تم بھی نکل جاتے شاہ ویز کی طرح کسی دن بن پتائے۔“ دادا سائیں شاہ سوار کی بات سن کر خشکیوں نگاہوں سے اسے گھورتے ہوئے بولے تھے۔

”نہیں دادا سائیں آپ اجازت دیجیے میں آپ کی اجازت سے جانا چاہتا ہوں۔“ اس نے التجائیہ لہجے میں کہا اور دادا سائیں کو خاموش پا کر ایک دفعہ پھر بولا۔

”دادا سائیں علم حاصل کرنا ہمارا شوق بھی ہے اور ہماری ضرورت بھی ہے اب جس دور میں ہم جی رہے ہیں وہاں ہم ایک ہی جگہ پر نہیں رک سکتے ہمیں اس حویلی سے باہر نکل کر دنیا کو دیکھنے دیجیے۔“

”واہ لڑکے واہ ابھی تو تم گئے بھی نہیں ہمیں تو ابھی سے سبق دینے لگے۔“ دادا سائیں اس پر طنز کرتے ہوئے بولے تھے۔

”کوئی ضرورت نہیں ہے کہیں جانے کی یہیں پر رہ کر اپنے بھائیوں کے ساتھ مل کر زمینیں دیکھو گیوں کہ یہ سب تم لوگوں کا ہی تو ہے پھر ہم تم سب کی خوب دھوم دھام سے شادی کروائیں گے۔“ دادا سائیں اس کو خاموش پا کر محبت سے بولے تھے۔

”معاف کیجیے گا دادا سائیں میں ابھی سے ان زمینوں کے چکر میں نہیں پڑنا چاہتا۔ پہلے میں پڑھوں گا پھر آ کر اسے بھی دیکھ لوں گا۔“ وہ بھی آخر انہی کا پوتا تھا اپنی بات پر بضد رہا۔

”ٹھیک ہے چلے جاؤ تم بھی دو کے چلے جانے سے ہماری حویلی ویران نہیں ہو جائے گی۔ مگر یاد رکھو اس حویلی میں دوبارہ قدم رکھنے کی ضرورت



نہیں ہے تمہیں بھی اور اسے بھی۔“ یہ کہہ کر وہ ر کے نہیں تھے اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف چلے گئے۔  
”بیٹا تمہارے دادا سائیں جو کہہ رہے ہیں اس کو مانو۔“ شاہ زاوار بیٹے کو جانے کی تیاری کرتے ہوئے دیکھ کر بولے تھے۔

”بابا سائیں آپ بھی! آپ تو ایسا نہ کہیں میرے جذبات کو سمجھنے کی کوشش کیجیے آپ سب۔“ شاہ سوار باپ کے سامنے التجائیہ لہجے میں بول رہا تھا۔

”تم جانتے ہو تمہارے اس فیصلے سے مہر و پر کیا اثر پڑے گا۔ ادھر میں ماہ رخ کے لیے الگ پریشان ہوں۔ شاہ ویز نے شاید کبھی نہ آنے کی قسم کھالی ہے کتنی زندگیاں برباد کرو گے تم لوگ آخر۔“ شاہ زاوار جانتے تھے کہ یہ لوگ ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے اور ان کے دل کی بھی یہی خواہش تھی کہ مہر و کی شادی شاہ سوار سے ہو اور ماہ رخ کی شاہ ویز سے مگر یہاں تو شاید قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

”بابا سائیں کچھ نہیں ہو گا میں واپس ضرور آؤں گا۔ تعلیم مکمل کر کے اور شاہ ویز بھی ضرور آئے گا دیکھ لیجیے گا آپ۔“ وہ ہار ماننے کو تیار نہیں تھا۔

”ٹھیک ہے مگر کہیں دیر نہ ہو جائے میرے لخت جگر یاد رکھنا مہر و کی آنکھوں میں تمہاری محبت کے عکس دیکھے ہیں میں نے کہیں ماہ رخ کی طرح اسے بھی انتظار کی سولی پر نہ چڑھا دینا۔“ شاہ زاوار بیٹے کے چہرے کو ہاتھوں کے پیالے میں لیتے ہوئے بولے تھے۔

زینت بی بی کو کوئی اعتراض نہ تھا مگر بیٹے کی چیدائی سے افسردہ ضرور ہو گئیں تھیں آخر کو خاندان بھر میں چھوٹا بیٹا تھا وہ۔ اور پھر تیار ہو کر وہ آنے کا کہہ کر چلا یا مگر جاتے ہوئے مہر و سے ضرور ملا تھا۔

مہر و نے جب سے اس کے جانے کا سنا تھا اس کا برا حال ہو گیا تھا۔ شاہ سوار کو سمجھ ہی نہیں آ رہا تھا اس کو کیسے حوصلہ دے۔

”کیا حال بنا لیا ہے تم نے اپنا مہر و۔ میں ساری زندگی کے لیے تو نہیں جا رہا سنبھالو خود کو۔“ وہ خود مہر و کی حالت سے پریشان ہو گیا تھا۔

”کیسے سنبھالوں خود کو اگر تم بھی بھائی شاہ ویز کی طرح لوٹ کر نہ آئے تو جانتے بھی ہو کہ کیا ہو گا۔“ وہ آنے والے دنوں سے شاید کچھ زیادہ ہی خوف زدہ تھی۔

”ارے بھئی، شاہ ویز تعلیم مکمل کر کے آئے گا اور میں بھی اور دیکھنا تمہیں بھی اس حویلی سے دور بہت دور لے جاؤں گا۔“ وہ اس کے ہاتھوں کو تھامے محبت سے کہہ رہا تھا۔

”سچ کہہ رہے ہونا تم۔“ مہر و بے یقینی سے بولی تھی۔

”ہاں بالکل سچ۔“ وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بول رہا تھا۔

اور وہ چلا گیا۔ کتنے ہی ماہ و سال گزر گئے ان کے بغیر زندگی ہی بے رونق لگ رہی تھی سب کو دادا سائیں نے شاہ ویز کی طرح شاہ سوار سے بھی کوئی راپہ نہ رکھے دیا۔ ان چند سالوں میں بہت کچھ بدل گیا۔

شاہ زمان کے تین بچے تھے ایک بیٹی زیب النساء اور دو بیٹے شاہ دادا اور شاہ سکندر۔  
جب کہ شاہ دادا نے مہر النساء کے بعد کسی سے شادی ہی نہ کی۔

دادا سائیں نے فیصلہ کیا کہ شہر بانو اور زیب النساء کی شادی وٹے ٹے میں کر دی جائے سو اس فیصلے کے مطابق شاہ سجاد کے لیے زیب النساء کو بیاہ کر لے آئے اور شہر بانو کی شادی شاہ دادا سے ہو گئی شاہ سکندر بھی مہر و سے شادی کا خواہش مند تھا



مگر شاہ نواز نے اتنی جلدی اپنی بیٹی کی شادی سے انکار کر دیا شاہ مہران کی شادی ماہ رخ کی ہزار دہائی دینے کے باوجود اس سے ہو گئی جب کہ گل افشاں کی نسبت شاہ مہر سے جوڑ دی گئی سب کچھ ٹھیک ہو گیا تھا مگر پھر بھی سب کے دلوں میں کہیں نہ کہیں خلش باقی رہ گئی تھیں۔

پھر ایک دن شاہ زمان اپنے بیٹے شاہ سکندر کے لیے مہر و کاہتھ مانگنے آگئے تھے۔ اپنے تایا سائیں کے سامنے جسے سن کر اماں سائیں (زہرہ بیگم) کو بھہ ہی نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کریں اگر شاہ سکندر بھتیجا تھا ان کا تو شاہ سوار بھانجا۔ ان کے لیے فیصلہ کرنا مشکل ہو رہا تھا مگر ان کا دل کہیں سے نہیں مان رہا تھا کہ وہ شاہ سکندر کے حق میں فیصلہ دیں کیوں کہ وہ ایک اوباش قسم کا آدمی تھا۔ عیاش پسند جسے عورتوں کی عزت کا ذرا پاس نہ تھا۔ سوزہرہ بیگم کیسے اپنی پھول سی بچی کو اندھیرے کنویں میں ڈھکیں دیتیں مگر انہیں اس کے مستقبل کی شدید فکر تھی کہ اگر شاہ سوار نہ آیا تو کیا ہوگا۔

”تایا سائیں میرا سکندر اتنا برا نہیں ہے بس ذرا بگڑ گیا ہے مگر دیکھ لیجیے گا شادی ہو گئی ناں اس کی وہ بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔“ شاہ زمان اپنے تایا کے سامنے اصل مدعا بیان کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

”ہاں! میرا پوتا مہر و کو رانی بنا کر رکھے گا۔“ اللہ داد بھی اپنے آوارہ پوتے کی وکالت میں بول رہے تھے۔

”یہ سب تو ٹھیک ہے مگر ابھی اس حویلی میں ایک لڑکا موجود ہے ہم چاہتے ہیں کہ مہر و کی شادی اس سے ہو۔“ دادا سائیں کا اشارہ شاہ سانول کی طرف تھا۔

”اب تو ہم جانتے ہیں تایا سائیں مگر ہم

اپنے سکندر کے لیے بہت امید لے کر آپ کے پاس آئے ہیں سکندر مہر و کو خوش رکھے گا تایا سائیں۔“ شاہ زمان کسی بھی طرح اپنے تایا کے منہ سے انکار نہیں سنا چاہتے تھے۔ اسی لیے ایک بات بار بار دہرا رہے تھے۔

”دیکھو چاچا اللہ داد اور بھائی زمان میں اپنی بیٹی کو حویلی سے باہر نہیں بیاہتا چاہتا ابھی اس حویلی میں لڑکے موجود ہیں اس لیے۔“ ابھی شاہ نواز نے بھی باتوں میں حصہ لیا ہی تھا کہ شاہ زمان بیچ میں بول پڑے۔

”ارے کن لڑکوں کی بات کرتے ہو تم وہ جو باہر جا کر بیٹھے ہوئے ہیں ان کے آنے کی امید لے کر بیٹھے ہوئے ہو تم اور یہ کیا تم نے حویلی کی بات کی ہم کیا حویلی سے باہر رہتے ہیں یا ہمارا کوئی تعلق ہی نہیں ہے حویلی سے۔“ شاہ زمان غصے میں بولتے ہوئے کھڑے ہو گئے تھے۔

”بس کرو تم لوگ کیا بچوں کی طرح لڑ رہے ہو اللہ داد سمجھاؤ شاہ زمان کو اس طرح کے مسئلے لڑائی جھگڑوں سے حل نہیں ہوتے۔“ دادا سائیں نے دونوں کو چھپ کر داتے ہوئے کہا تھا۔

”مسئلہ! یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے اس کو تو مسئلہ آپ لوگ بنا رہے ہو بس فیصلہ ہو گیا مہر و ہماری ہی بہو بنے گی ورنہ..... شاہ زمان اپنی بات پر بضد تھا جیسی بات کو ادھوری چھوڑ کر سب کی طرف دیکھنے لگے۔

”ورنہ کیا؟ کیا کرو گے تم؟“ شاہ زمان کی بات پر شاہ نواز اور شاہ زاوار ایک ساتھ بولے تھے۔

”ورنہ یہ کہ ہم یہ رشتہ ابھی اور اسی وقت ختم کر دیں گے میں زیب النساء کو لے جاؤں گا اور شہر بانو کو ہمیشہ کے لیے اس گھر میں بٹھا کے رکھ لینا تم لوگ۔“ یہ کہہ کر شاہ زمان جانے کے لیے اٹھ



بھی آئے گا اور اس کے ساتھ ایک خاموش طوفان بھی آجائے گا اور اپنے ساتھ سب کچھ بہا لے جائے گا۔

☆.....☆

اللہ وسائی نے زمان خانے میں جا کر شاہ سوار کی آمد کی اطلاع دی تو ڈھولک پر بجاتے ہوئے گل افشاں کے ہاتھ یک دم رکے تھے ماہ رخ جو پھولوں کی تھال لیے ڈھولک بجانے والی لڑکیوں کی طرف آرہی تھی اس خبر کو سن کر سنائے میں آگئی۔ زینت بی بی کی خوشی کا کہیں کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ خوش تو اماں سائیں بھی بہت تھیں مگر بیٹی کی طرف سے سخت پریشان ہو گئی تھیں۔

”تجھے پتہ ہے مہر و بھاء واپس آ گیا ہے۔“ گل افشاں اور ماہ رخ نظر بچا کر اماں سائیں سے مہر و کے کمرے میں گئیں تھیں اور جو خبر مہر و کو سنائی تھی اس سے مہر و کا انگ انگ خوشی سے جھوم گیا تھا۔

”کیا تم ٹھیک کہہ رہی ہو؟ میں نے کہا تھا ناں شاہ سوار ضرور آئے گا اور دیکھا وہ آ گیا۔ مجھے اس سے ملنا ہے۔“ یہ کہہ کر جیسے ہی وہ باہر نکلنے لگی اماں سائیں اس کے کمرے میں آ گئیں۔

”گل اور ماہ رخ جاؤ باہر کی تیاری دیکھو تم دونوں۔“ یہ کہہ کر اماں سائیں نے ان دونوں کو جانے کو کہا۔

”اماں سائیں! مجھے ایک دفعہ اس سے ملنے دیں صرف ایک بار اس سے ملنے دیں۔“ اس سے پہلے کہ اماں سائیں کچھ کہتیں مہر و ان کے سامنے شاہ سوار سے ملنے کی ضد کرنے لگی۔

”پاگل ہو گئی ہے تو مہر و کل تیرا شاہ سکندر کے ساتھ نکاح ہے اور تو شاہ سوار سے ملنے کو بے تاب ہو رہی ہے۔“ اماں سائیں نے اسے سمجھانا چاہا تھا۔

”اماں سائیں میں آپ کے آگے ہاتھ جوڑتی

کھڑے ہوئے تھے جب کہ اللہ داد انہیں روکتے رہ گئے کہ فیصلے اتنی جلد بازی میں نہیں کرنے چاہئیں۔

”دیکھو شاہ زمان ایک لڑکی کے لیے تم دو دو زندگیاں تباہ نہیں کر سکتے شاہ سکندر کو پہلے اس قابل بناؤ کہ وہ ایک اچھی زندگی گزار سکے۔“ شاہ اماں بھتیجے کے فیصلے سے خوف زدہ ہو گئے تھے اور پھر ایک دفعہ سب کو خاموش پا کر بولے۔

”ہمیں سوچنے کا وقت دو، ہم تمہیں اپنا فیصلہ بعد میں بتائیں گے۔“

اور پھر وہی ہوا جس کا سب کو ڈر تھا سب کے منع کرنے کے باوجود دادا سائیں کا فیصلہ شاہ سکندر کے حق میں ہی ہوا۔

”بابا سائیں آپ کو سکندر کے حق میں فیصلہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔ آپ جانتے ہیں اسے اچھی طرح کس قدر آوارہ مزاج ہے وہ میری بیٹی کو برباد کر دے گا۔“ شاہ نواز کو اپنی مہر و بہت عزیز بھی جیسی ان کے لیے فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا تھا۔

”اس کے حق میں فیصلہ نہ کروں تو اور کیا کروں اس ایک لڑکی کی وجہ سے دو گھر برباد کر دوں۔ شاہ نواز مت بھولو کہ شاہ سجاد اور شہر بانو تمہاری ہی اولاد ہیں۔ اگر وہ برباد ہو گئے تو اس کے ذمہ دار تم ہو گے۔“ دادا سائیں نے شاہ نواز کو قائل کرنے کے لیے باقی دو بچوں کا حوالہ دیا تھا۔

”ہاں شاید آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں بابا سائیں! ٹھیک ہے آپ چاچا اللہ داد اور شاہ زمان کو پیغام بھیجوا دیجئے۔“ اور بالآخر دادا سائیں شاہ نواز کو منانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

اور آج جب شاہ سوار لوٹ کر آیا تھا جس کے لیے وہ تو بہت دور جا رہی تھی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے یہ محض اتفاق تھا کہ شادی کی تاریخ بھی اسی دن رکھی گئی جس دن اس نے آنا تھا اور کس کو خبر تھی کہ وہ



ہوں مجھے صرف ایک بار اس سے ملنے دیں۔“ اس نے باقاعدہ اماں سائیں کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے تھے۔

”بس کر مہرو، ضد نہ کر تو جو میرے بس میں نہیں مت مانگ مجھ سے وہ۔“ اماں سائیں اس کے سامنے بے بس تھیں۔

”بڑے دادا سائیں کو پتہ چلے گا تو تو بھی نہیں بچے گی اور میں بھی.....“ ابھی اماں سائیں کی بات ادھوری تھی مہرو بیچ میں بول پڑی پھر تو ایسی زندگی جینے سے بہتر ہے میں مر ہی جاؤں میں نہیں رہ سکتی اس کے بغیر۔“ وہ ہچکیوں میں رو رہی تھی۔

”بس کر بے حیا بے شرم۔“ یہ کہہ کر زوردار پھپھڑ اماں سائیں نے اس کے منہ پر جڑ دیا۔

”تیرے دادا سائیں تک یہ باتیں پہنچ گئیں تو تجھے زندہ زمین میں گاڑ دیں گے۔“ یہ کہہ کر اماں سائیں رکی نہیں تھیں اور جاتے جاتے دروازہ باہر سے لاک کر گئیں تھیں تاکہ صبح تک مہرو باہر نہ آسکے اور اندر مہرو چنچنی رہ گئی مگر اس کی یہ چیخ و پکار سننے والا سوائے کمرے کے درو دیوار کے کوئی نہ تھا تب مہرو نے ایک فیصلہ کیا اور اس فیصلے پر عمل کرنے کے لیے وہ اپنے بیڈ کے سائیڈ ٹیبل کی طرف بڑھی تھی۔

☆.....☆

”یہ سب کیا ہو رہا ہے اماں سائیں کچھ دن اور انتظار کر لیتے تو کیا ہو جاتا۔“ وہ زینت بی بی کے قدموں میں بیٹھا ان سے شکوہ کر رہا تھا۔

”مجھے معاف کر دے میرے پتر میں تیرے لیے کچھ نہ کر سکی۔“ زینت بی بی اپنے بیڈ سے شاید کچھ زیادہ ہی شرمندہ تھیں۔

”دیکھ پتر جو قسمت میں لکھا ہو وہی ہوتا ہے۔“

شاید تیرے اور مہرو کی قسمت میں بھی یہی لکھا تھا۔“ اماں سائیں شاہ سوار کو دلا سادیتے ہوئے

بول رہی تھیں۔

”ہاں شاید جو قسمت میں لکھا ہوتا ہے وہی ہوتا ہے ماہ رخ کے قسمت میں بھی یہی تھا شاد ویز کی قسمت میں بھی یہی تھا۔ اب مہرو کی قسمت اور میری قسمت میں بھی یہی لکھا ہے۔ اس حویلی میں رہنے والے کبھی لوگوں کی قسمت خراب ہے۔“ یہ کہہ کر وہ جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا تھا مگر جاتے ہوئے آمنہ بی بی کے پاس رکا تھا۔ ”بھول جائیں شاہ ویز کو چچی سائیں شاہ ویز اب نہیں آئے گا لوٹ کر کیوں کہ اب کچھ نہیں رکھا اس حویلی میں اس حویلی کے مکینوں کو ہم پر ترس نہیں آتا تو ہم کیوں ترس لکھائیں۔“ یہ کہہ کر وہ آنسو صاف کرتا اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

☆.....☆

وہ کمرے میں ادھر سے ادھر ٹہل رہا تھا۔ اس کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کیا کرے بالآخر اس نے فون نکالا اور شاہ ویز کو فون کرنے لگا۔

”ہیلو شاہ ویز۔“

”ہاں ہیلو شاہ سوار، کیا حال ہے خیریت سے تو پہنچ گئے ناں تم؟“ دوسری جانب سے شاہ ویز کی آواز ابھری تھی۔

وہ دونوں بیرون ملک میں بھی اکٹھے ہی رہے تھے جس کی وجہ سے ان کی دوستی مزید گہری ہو گئی تھی۔

”ہاں پہنچ گیا خیریت سے۔“ اس نے کھوئے ہوئے انداز میں جواب دیا۔

”کیا بات ہے شاہ سوار تم مجھے ٹھیک نہیں لگ رہے حویلی میں تو سب ٹھیک ہیں ناں؟“ اس نے شاہ سوار کی آواز سے اندازہ لگا لیا تھا کہ کچھ گڑبڑ ہے۔

”کچھ بھی ٹھیک نہیں ہے۔ حویلی میں تجھے پتہ ہے مہرو کی شادی ہے کل اور میں کچھ نہیں کر سکتا۔“



کچھ کہے گا تو اس کا دل پھٹ جائے گا۔  
 ”اچھا تو بس کر اور حوصلے سے کام لے ٹھیک ہو  
 جائے گا سب انشاء اللہ اور میں بھی کوشش کرتا ہوں  
 کہ ایک دو دن میں پاکستان آسکوں پھر دونوں مل  
 کر کوئی نہ کوئی حل نکال ہی لیں گے۔“ شاہ ویز  
 اسے حوصلہ دیتے ہوئے بولا۔

”نہیں تو نہیں آتا تب تک بہت دیر ہو جائے گی  
 اور ویسے بھی کچھ نہیں رکھا ادھر نہ تیرے لیے اور نہ  
 میرے لیے اور میں نے سچی سے بولا ہے کہ تو نہیں  
 آئے گا۔“ وہ انتہائی مایوس کن لہجے میں بولا۔  
 ”لیکن تو نے یہ کیوں کہا۔“ شاہ ویز اس سے  
 پوچھ رہا تھا۔ ”تا کہ ماہ رخ تجھے بھول جائے میں  
 نے آج بھی اس کی آنکھوں میں تیری محبت کے  
 عکس دیکھے ہیں جانتا ہے تو اس کی شادی شاہ  
 میران سے ہو گئی ہے۔“ وہ اسے ایک اور نئی  
 اطلاع دے رہا تھا جسے سن کر شاہ ویز کے دل کو  
 کچھ ہوا تھا۔

شاہ سوار جانتا تھا شاہ ویز اور ماہ رخ ایک  
 دوسرے کو چاہتے ہیں وہ حویلی کے دیگر مردوں کی  
 طرح نہیں تھا سب سے بڑھ کر اس کی اپنی خواہش  
 یہی تھی کہ ماہ رخ کی شادی شاہ ویز سے ہو کیوں کہ  
 وہ اور شاہ ویز بچپن کے دوست تھے۔

”اچھا یہ بتا اماں سائیں اور باہا سائیں کا کیا  
 حال ہے؟ اور گل افشاں اور شاہ سانول ٹھیک ہیں  
 نا۔“ شاہ ویز اب والدین اور بہن بھائی کی  
 خیریت دریافت کر رہا تھا۔

”ہاں سب ٹھیک ہیں گل افشاں کی شادی ادھا  
 شاہ میر سے ہوئی ہے مگر شاہ سانول نے ابھی تک  
 شادی نہیں کی۔“ شاہ سوار نہ چاہتے ہوئے بھی  
 اسے سب کچھ بتا رہا تھا۔

”کیا گل افشاں کی بھی شادی ہو گئی آہ کاش  
 میں یوں دیر نہ کرتا پتا نہیں اماں سائیں کے دل پر

میں دادا سائیں کو کبھی معاف نہیں کروں گا۔“ وہ  
 ہنکیوں میں رو رو کر کہہ رہا تھا۔

”یہ کیا کہہ رہا ہے شاہ سوار کس کے ساتھ ہے  
 اس کی شادی اور سنبھال تو خود کو۔“ وہ بھی اس کی  
 بات سن کر صحیح معنوں میں پریشان ہو گیا تھا۔

”شاہ سکندر کے ساتھ لیکن میں مہر و کی شادی  
 اپنے سوا کسی اور کے ساتھ ہونے نہیں دوں گا۔  
 میں آج رات کو ہی مہر و کو لے کر حویلی سے نکل  
 آؤں گا۔“ وہ انتہائی جذباتی لہجے میں بول رہا تھا۔  
 ”پاکل بن کی ہاتھ مت کر شاہ سوار اور شاہ  
 سکندر شاہ زمان تایا کا بیٹا ہے ناں وہ جو آوارہ  
 حراج اور انتہائی بدتمیز اور مغرور ہے۔“ شاہ ویز کو  
 شروع سے شاہ سکندر پسند نہیں تھا۔ اس کا نام سن کر  
 چوکتے ہوئے پوچھا تھا۔

”ہاں وہی شاہ سکندر جس کو فضول کاموں کے  
 سوا اور کوئی کام نہیں آتا۔“ اس نے انتہائی بے  
 زاری سے جواب دیا۔

”دادا سائیں کو اس میں آخر نظر کیا آ گیا ہے جو  
 وہ تجھے چھوڑ کر اسے منتخب کر بیٹھے ہیں۔“ شاہ ویز  
 کچھ نہ سمجھتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

”پتا نہیں اماں سائیں کہہ رہی تھیں شہر بانو اور  
 شاہ سجاد کا گھر بچانے کے لیے دادا سائیں نے  
 کیا ہے یہ فیصلہ۔“ شاہ سوار اتنا کہہ کر خاموش ہو  
 گیا۔

”کیا ان سب کی شادی ہو گئی ہے اور اگر میں  
 غلطی پر نہیں تو کیا شہر بانو کی شادی شاہ داد سے  
 ہوئی ہے۔“ شاہ ویز کچھ کچھ معاملے کی تہہ تک پہنچ  
 گیا تھا۔

”ہاں اور سجاد کی شادی زیب النساء سے مگر  
 اس کے ہاں جو تایا شاہ زمان کو اپنے آوارہ بیٹے  
 کے لیے میری مہر وہی ملی تھی یا مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا  
 میں کیا کروں۔“ شاہ سوار کو لگ رہا تھا جیسے وہ مزید



اس امید سے کہ شاید مہر و دروازہ کھول دے مگر اندر گہری خاموشی تھی جیسے اندر کوئی تھا ہی نہیں اور وہ بالآخر نا کام اپنے کمرے میں چلا آیا۔

”آخر مہر و نے دروازہ کیوں نہیں کھولا۔ کیا وہ نہیں جانتی کہ میں آیا ہوں کہیں کوئی گڑبڑ تو نہیں ہے۔“ وہ خود سے سوال کر رہا تھا اس کے دل میں خطرے کی گھنٹی بجی تھی مگر وہ بے بس تھا۔

☆.....☆

صبح ہو چکی تھی۔ حویلی میں خوب چہل پہل ہو رہی تھی مگر شاہ سوار کے اندر گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ شاہ سوار کے علاوہ کبھی مرد اور طاق میں بیٹھے ہوئے تھے۔ آج مہر و کا نکاح شاہ سکندر سے ہونا تھا۔ شاہ میر نے شاہ سوار سے اوطاق میں چلنے کو کہا اس نے منع کر دیا اور اب شاہ میر اس کو سمجھانے بیٹھ گیا تھا۔

”دیکھو شاہ سوار تو میرا بھائی ہے اور دوستوں کی طرح ہے۔ ہم سب نے دادا سائیں کو بہت روکا مگر وہ نہیں مانے۔ میرے بھائی خود کو سنبھال یہ رونا دھونا زنانوں کا کام ہے۔ مرد بن مرد، تیرے لیے کوئی لڑکیوں کی کمی توڑی ہے مہر و سے اچھی لڑکی سے تیرا بیاہ کر دیں گے ہم۔“ شاہ میر اس کو سمجھا رہا تھا۔

”بس کرو یہ میری زندگی کا معاملہ ہے۔ مہر و محبت ہے میری نہیں رہ سکتا میں اس کے بنا اور آپ کہتے ہو کہ میرے لیے اچھی لڑکی کی کمی نہیں ہے۔ میں مہر و کے علاوہ کسی کے ساتھ جینے کا تصور ہی نہیں کر سکتا۔“ وہ اپنے بھائی کو تاسف بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

”اچھا اب تجھے پتا چلا ہے کہ تو اس کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ادھر پردیس میں پانچ سال کیسے رہا؟“ شاہ میر اس کی بات پر طنز کرتے ہوئے بولا۔

کیا گزری ہوگی میرے آنے کے بعد کاش کہ ہم یوں پردیس میں نہ آئے ہوتے تو یوں آج ہمیں رشتوں کی دوری نہ سہنی پڑتی۔“ وہ ٹھنڈی آہیں بھرتا ہوا بولا تھا۔

”لیکن اب کیا ہو سکتا ہے جو ہونا تھا وہ تو ہو گیا مگر اب جو ہونے والا ہے اسے روکنا ہے مجھے ہر حال میں خیر میں اب فون رکھتا ہوں ٹھیک ہے اور ہاں تو جلدی آنے کے لیے کوشش کرنا۔“ یہ کہہ کر وہ فون بند کرنے لگا تو شاہ ویز کی آواز پر وہ رکا تھا۔

”سن تو، کیسے رو کے گا دیکھ شاہ سوار تو نے جو فیصلہ کیا ہے مہر و کو حویلی سے نکالنے کا اس کو ترک کر دے کیوں کہ تو جانتا ہے ناں دادا سائیں کے بندے ساری ساری رات جاگتے ہیں سمجھ رہا ہے ناں تو۔“ شاہ ویز اس کو سمجھاتے ہوئے بولا تھا۔

”اچھا ٹھیک ہے، OK اللہ حافظ۔“ یہ کہہ کر اس نے ایک لمبی گفتگو کے بعد فون بند کر دیا۔

☆.....☆

رات کے تین بج گئے تھے اور وہ ابھی تک کروٹیں بدل رہا تھا۔ نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے جب وہ ایک فیصلہ کرتے ہوئے اٹھا اور مہر و کے کمرے کی جانب بڑھا تھا اور کمرے تک پہنچ کر آہستگی کے ساتھ دروازہ بجایا تھا مگر اندر سے کوئی آواز نہ آئی اس نے پھر بجایا اور کوئی آواز نہ آئی۔

”مہر و دروازہ کھولو میں شاہ سوار پلیز مہر و دروازہ کھولو۔ ورنہ بہت دیر ہو جائے گی۔“ وہ دروازہ بجانے کے ساتھ ساتھ آوازیں بھی دینے لگا۔ اس بات سے بے خبر کہ دروازہ مہر و نے اندر سے بند نہیں کیا بلکہ باہر سے لاک کیا گیا ہے۔

وہ بہت دیر تک دروازے کے پاس کھڑا رہا۔



سوار بھاگا۔

شہر بانو! ماہ رخ اور گل افشاں زمین پر بڑی مہرہ کی لاش کے گرد بیٹھیں دھاڑیں مار رہی تھیں اور اس کو جھوڑ رہی تھیں۔ اس نے اپنی ٹوٹی پھوٹی اردو میں دادا سائیں اور حویلی کے بانی لوگوں کے نام ایک خط لکھا تھا جو کہ سائڈ ٹیبل پر پڑا تھا۔ اس پر شاہ سوار کی نظر پڑی تو جا کر اٹھالیا مگر پڑھا نہیں۔ ”آہ میری دھی۔“ یہ کہتے ہوئے اماں سائیں غش کھا کر زمین پر گرنے ہی لگی تھیں کہ شاہ سوار انہیں سنبھالنے کے لیے آگے بڑھا تھا۔

”یہ تم نے کیا کیا مہرہ، میرا انتظار تو کیا ہوتا۔“ شاہ سوار صرف اتنا ہی کہہ سکا تھا اور اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے تھے۔

اللہ وسائی جو اماں سائیں کو ڈھونڈتی مہرہ کے کمرے میں ہی آگئی تھی مہرہ کی لاش کو دیکھ کر چیخ ماری اور طاق کی طرف پلٹی تھی اور وہاں جا کر مہرہ کی موت کی اطلاع دی۔ پوری حویلی میں کہرام مچ گیا تھا۔ حویلی میں پندرہ سال بعد ایک اور جوان لڑکی کا جنازہ اٹھا تھا۔

”کاش کہ کمرے کو باہر سے بند نہ کرتی میں۔ تو شاید آج ہمیں یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔“ اماں سائیں اپنے کپے پر سخت پچھتاری تھیں۔ اس کی لاش کو دفن دیا گیا تھا۔ حویلی کا ایک ایک مکین سوگوار تھا۔

☆.....☆

بہتے ہونے کو آئے تھے مگر حویلی کی افسردگی اور سوگواری ابھی باقی تھی۔ دادا سائیں اپنے کمرے میں بند ہو گئے تھے۔ شاہ ویز مہرہ کی موت کا سن کر واپس آ گیا تھا دادا سائیں نے اسے معاف نہیں کیا مگر اسے نکالا بھی نہیں تھا۔

تھوڑے دنوں بعد حالات کچھ بہتر ہوئے تو شاہ سوار کو اس خط کا خیال آیا جو مہرہ کے کمرے

”بھائی تب مجھے اس بات کا ڈر نہیں تھا وہ تب میری تھی لیکن اب وہ مجھ سے دور جا رہی ہے میں باہر کوئی عیاشی کرنے نہیں گیا تھا۔ صرف اس کے لیے اپنے مستقبل کو بہتر بنانے گیا تھا۔“ وہ شاہ میر کی بات پر بھڑک اٹھا۔

”تب تو میرے بھائی تو یہ سمجھ تو نے اپنی محبت کو علم کے لیے قربان کر دیا ہے۔“ یہ کہہ کر وہ رکائیں اور پیچھے اس کو سوچتا ہوا چھوڑ گیا۔

☆.....☆

”شہر بانو، ماہ رخ، گل افشاں جاؤ جلدی سے مہرہ کو تیار کر دو نکاح کے لیے۔“ اماں سائیں نے تینوں لڑکیوں کو بلا کر ہدایت دی تھی۔

”جی اماں سائیں ہم ابھی جاتی ہیں۔“ یہ کہہ کر وہ تینوں کمرے کی طرف چل دیں۔

”لیکن سن شہر بانو چاہی تو لیتی جا کرے کی۔“ یہ کہہ کر اماں سائیں نے اس کو چابی پکڑا دی۔

”کیا تائی سائیں نے کمرے کو لاک کیا ہوا تھا۔“ شاہ سوار جو کمرے سے نکل کر ادھر ہی آ رہا تھا اماں سائیں کی بات سن کر شہک اٹھا۔

”بھرجائی کیا آپ نے کمرہ باہر سے بند کر دیا تھا؟“

”ہاں تاکہ وہ کمرے سے باہر نہ آسکے۔“ اماں سائیں نے روکھے پن سے جواب دیا۔

”ادھی تم تو اس حویلی کے مردوں کی طرح سنگدل نہ بنو۔“ زینت بی بی تڑپ کر بولی تھیں۔

”نہیں میں سنگدل نہیں ہوں وہ میری دھی ہے۔ مجھے اس کی زندگی بہت پیاری ہے اسے میں نے.....“ ابھی ان کی باتیں ادھوری تھیں کہ شہر بانو کی دردناک چیخ سنائی دی۔

”اللہ سائیں خیر۔“ تینوں خواتین کے منہ سے ایک دم نکلا تھا اس کے ساتھ ہی تینوں مہرہ کے کمرے کی طرف بڑھ گئیں اور ان کے پیچھے ہی شاہ



میں ملا تھا۔ اس نے خط نکالا اور پڑھنا چاہا مگر یہ سوچ کر رکھ دیا کہ خط سب کے سامنے پڑھ کر سنانا چاہیے۔

پھر ایک دن دادا سائیں سمیت سبھی افراد اکٹھے بیٹھے ہوئے تھے تب شاہ سوار نے خط نکالا۔ ”میں آپ لوگوں کو کچھ پڑھ کر سنانا چاہتا ہوں اگر آپ سب اجازت دیں تو۔“ اس نے دادا سائیں کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

”کیا سنانا چاہتے ہو تم۔“ شاہ نواز اس کو مہلکوں نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پوچھ رہے تھے۔

”اس دن جب ہم مہر کے کمرے میں گئے تھے وہاں سے ایک خط ملا تھا مجھے، میں نے سوچا وہ آپ سب کو پڑھ کر سنایا جائے۔“ اس نے جیب سے خط نکالتے ہوئے کہا۔

”خط..... کیسا خط جلدی پڑھ کر سناؤ ہمیں۔“ دادا سائیں خط کے بارے میں سن کر بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے بولے تھے۔

”شاہ ویز یہ خط پڑھ کر سنا دو۔“ یہ کہہ کر اس نے شاہ ویز کی جانب خط کو بڑھایا۔

شاہ ویز نے سب کے چہروں کو دیکھا اور خط پڑھنا شروع کیا۔

”دادا سائیں آج آپ کو میری لاش دیکھ کر پندرہ سال پہلے والی مہر النساء یاد آگئی ہوگی۔ دادا سائیں میں آج وہی کہانی دہرا رہی ہوں جو پندرہ سال پہلے آپ کی بیٹی نے دہرائی تھی۔ آپ ہی تو کہتے تھے مہر و شاہ نواز بالکل مہر النساء جیسی ہے تو میں نے کام بھی وہی کرنا ہے جو انہوں نے کیا۔ آہ دادا سائیں آج میں آپ کے فیصلے کے بھینٹ چڑھ گئی۔“

دادا سائیں آج مجھے پتا چلا ہے اس حویلی میں محنت کرنا جرم ہے اور اس کی سزا موت ہے وہ

چاہے کسی بھی طرح سے ملے۔

اماں سائیں اور بابا سائیں مجھے معاف کر دیجئے گا۔ میرے اس فعل سے آپ کو بہت تکلیف اٹھانی پڑی ہوگی۔ بہت شرمندہ ہونا پڑا ہوگا آپ سب کو مگر اماں سائیں آپ تو سب جانتی تھیں اور اس کے باوجود مجھے آپ سب ایک ایسے شخص کے ساتھ باندھ رہے تھے جسے عورتوں کی عزت کا کوئی پاس نہیں جو انتہائی عیاش پسند ہے بابا سائیں چاچا شاہ زادار نے تو کئی بار مجھے آپ سے مانگا تھا اور آپ نے تو حامی بھی بھری تھی پھر ایسا کیوں کیا آپ سب نے۔ شاہ سوار ہمیشہ کے لیے تو باہر نہیں گئے تھے انہوں نے یہی کہا تھا ناں کہ وہ واپس آجائیں گے پھر آپ لوگوں نے انتظار کیوں نہیں کیا؟ اور پھر یہی فیصلہ دادا سائیں نے ماہ رخ کے لیے کیا مگر اس نے اس فیصلے پر سر جھکا دیا کیوں کہ آپ سب نے شاد ویز ادھا کو جائیداد سے ہی عاق کر دینے کی دھمکی دی تھی مگر مجھ میں شاہ سوار کے بغیر زندہ رہنے کی ہمت نہیں۔ ادھی شہر بانو اور ادھا سجاد مجھے معاف کر دینا کہ میں آپ دونوں کے لیے کچھ نہ کر سکی۔

بس اس حویلی کے تمام مردوں سے یہی کہوں گی کہ آپ لوگوں کے فیصلوں نے ہم عورتوں کو مار ڈالا ہے ہو سکے تو مجھے معاف کر دیجیے گا۔“

آپ کی مہر و شاہ نواز خط پڑھ کر شاد ویز نے سب کے چہروں کو ایک بار پھر بغور دیکھا تھا۔ جہاں حزن و ملال کے سوا کچھ نہ تھا۔ سب ہی سر جھکے ہوئے تھے اور دادا سائیں بنا کچھ کہے ایک دفعہ پھر اپنے کمرے میں بند ہو گئے تھے۔

.....☆.....



افسانہ

# لا پرواہ

ایسا نہیں تھا کہ وہ خود سے لا پرواہ تھی۔ نہیں..... وہ اپنے باطن سے لا پرواہ تھی نہ اپنے اطراف سے، ہاں

اس کی شخصیت کو اگر کسی ایک لفظ میں واضح کیا جاتا تو بلاشبہ وہ لفظ ہوتا "لا پرواہ"۔

پاک سوسائٹی



READING  
Section



لیکن اس کی ظاہری شخصیت اس کی توجہ کی اکثر محتاج نظر آتی لیکن چونکہ وہ تھی ہی لاپرواہ۔ اس لیے اس طرف دھیان دینے کی اسے کوئی خاص ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی۔

باتیں کر رہا ہے۔  
بڑے بھائی کے کپڑے آفس کے لیے تیار ہیں یا نہیں۔  
خود اس کی اپنے بارے میں فکریں کچھ اس انداز کی ہوتی ہیں۔

اس کے دھیان دینے کے لیے دوسری فکریں ہی کافی تھیں۔

کل ٹیسٹ ہے..... افوہ ایک لفظ بھی یا نہیں۔  
رات میں کاپی پر ذرا کی ذرا نگاہیں دوڑائیں۔ لو بس اتنا سا ہی تو ہے اور پٹ کاپی بند.....  
”چھوڑ یار! کل کی کل دیکھیں گے، ابھی کون

امی کی دوائیں وقت پر دینی ہیں، ختم تو نہیں ہو رہیں، کتنی باقی ہیں؟  
ابا کا بلڈ پریشر کب گر رہا ہے۔ کب آسمان سے

پاک سوسائٹی



READING  
Section



محلے والیوں کا منہ بن جاتا کزنز اس کی کہنی میں  
بور ہو جاتیں اور بڑی بہن یعنی آپنی اسے لکھتیں کرتے  
کرتے تھک جاتی۔

وہ لا پرواہ تھی، کبھی کان پر سے مکھی اڑا دیتی۔ کبھی  
او کے کہہ کر آنکھیں پٹیٹا دیتی۔

☆.....☆

”تم خود ہی لے آنا ناں اپنی پسند سے۔“ وہ بڑی  
جانفشانی اور لگن سے امی کے دوپٹے کے کنارے پر  
کروشیہ سے مرہ بنا رہی تھی۔

”اور اگر تمہیں پسند نہ آیا تو؟“ کسی کی شادی پر  
ہنسنے کے لیے سوٹ کی بات ہو رہی تھی۔

”تو بھی خیر ہے، کوئی بات نہیں۔“

اس نے آپنی کو اپنے سوٹ کے تمام جملہ حقوق  
دیتے ہوئے کروشیہ کا دھاگہ توڑا اور دوپٹے کو  
پھیلا کر قدرے دور سے ڈیزائن کو ستائشی نظروں  
سے دیکھا۔

”اوں..... دیکھو آپی۔“ آپنی نے جواب نہیں  
دیا۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔  
”کیا ہوا اب؟“

”کچھ توجہ خود پر بھی دے لو۔“ حمئی بڑی بہن  
ہونے کے ناطے سنجیدہ تھی۔

”کیوں کیا ہوا؟“ اس نے سامنے ڈریننگ کے  
آئینے میں خود پر ایک اچھتی نگاہ ڈالی۔

”ہج روشی! تمہیں نظر نہیں آ رہا تمہاری اسکن رف  
اور ڈل ہو رہی ہے۔ بالوں کا حشر دیکھو ٹرنگ کرواؤ۔  
آخر کب کرواؤ گی۔“

”کروالوں گی ناں۔“ وہ اب لا پرواہی سے سوئی  
میں دوسرا دھاگا ڈال رہی تھی۔

”کب آخر؟“ وہ زچ ہو گئی۔ ”شادی سر پر آگئی  
ہے۔“

”تو کون سا میری شادی ہے۔“

”تو کیا اپنی شادی سے پہلے خود پر توجہ دینا حرام

دماغ لڑائے..... اونہہ..... خوار.....“

”اے شٹ یار! تو تھ برش تو کل نالی میں گر گیا تھا  
چلو ابا کا منجن زندہ باد، اب ایک برش کے لیے کون  
بازار جائے خوار.....“

اور یہ خوار تو اس کا پسندیدہ لفظ تھا۔ اپنے لیے کوئی  
بھی کام مل کر کرنے سے اسے اپنی خواری کا شدید  
خوشہ لاحق ہو جاتا اور وہ خود کو خوار ہونے سے بچانے  
کے لیے کبھی بھی وہ کام نہ کرنے کا عہد کر لیتی اسے  
دوسرے وہ سب لوگ بھی خوار نظر آتے جو ایسی  
چیزوں کے پیچھے بھاگتے جو اس کے نزدیک انسان کی  
خواری کا ذریعہ نہیں۔

لڑکیاں جو ہر مہینے باقاعدگی سے فیشنل لیتیں۔  
”گھر پر کلیننگ کر لیں اگر اتنا ہی چسکا ہے تو پیسے  
کی بربادی اور ٹائم کی الگ..... ہونہہ..... خوار۔“  
”کتنا ٹائم ہے فالو، ان خواروں کے پاس۔“

”اور تم تو ایسے کہہ رہی ہو جیسے تم تو اپنے منگیتر سے  
کبھی بات ہی نہیں کرو گی۔“ کالج میں اس کی بات سن  
کر گروپ کی ایک لڑکی تب گئی۔ اس کا منگیتر بھی اسے  
روز فون کرتا تھا۔

”یا اللہ! یہ تین گھنٹے کی قلم کیسے دیکھو گے تم لوگ اور  
وہ بھی ایک ایک سین یا اللہ..... اتنی خوازی!“ وہ  
کانوں پر ہاتھ رکھ لیتی۔

محلے کی وہ عورتیں جنہیں گھر گھر پھر کر غیبتیں کرنے  
کی بیماری تھی۔ اس سے خاص طور پر دور دور رہتیں۔  
کیوں کہ ذرا سی دیر کسی کی برائی سن کر فوراً ہی سچ میں  
کود پڑتی۔ پھر امی ”ہیں..... ہیں.....“ کرتی رہ  
جاتیں اور وہ بات کھل کر کے یہ جاوہ جا۔

”دنیا کہاں سے کہاں چلی گئی خالہ! اور آپ ابھی  
تک یہی سوچ لے کر بیٹھی ہیں کہ ماسی زرینہ نے اپنی  
بٹی کی شادی اتنے اونچے گھرانے میں کیسے کر دی۔  
چھوڑیں بھی۔ نصیب تھا لڑکی کامل گیا اسے۔ آپ

خواہ خواہ میں سوچ سوچ کر خوار ہو رہی ہیں۔“



جلدی سے پیر سمیٹ کر امی کے لیے جگہ بنائی اور  
کروڑیے کی خوب صورت نیل سے سجادو پٹہ ان کی گود  
میں رکھ دیا۔

”اوہو! آج تو میری بیٹی تھک گئی ہے پھر کسی  
دن چلی جائے گی۔“ دوپٹہ دیکھ کر امی تعریفی  
نظروں سے اس پر ہاتھ پھیرنے لگیں اور پھر  
خلاف توقع حمسنی کی مخالفت اور اس کی حمایت میں  
بول گئیں۔ ورنہ عام طور پر وہ اپنی بڑی بیٹی کی ہم نوا  
نظر آتی تھیں۔

رشنا کی ہنسی نکل گئی۔ حمسنی بھی اس کی ہنسی کا مطلب  
سمجھ کر مسکرا دی۔

”اور سنو پلینز بلیک یا وائٹ سوٹ مت لانا۔“ اس  
نے اٹھ کر بولتے ہوئے مزے سے امی کی گود میں سر  
رکھ دیا۔

☆.....☆

حمسنی اس کے لیے بے حد خوب صورت گہرے  
کاہی سبز رنگ کا سوٹ لائی تھی۔ ساتھ ہی چوڑیاں  
اور سینڈل بھی خود ہی لے آئی۔ رشنا نے بے حد آسانی  
سے اپنی پسندیدگی کی سند دے دی۔ اس کی تو ہمیشہ کی  
عادت تھی۔ خود ہر وقت اور پیسہ صرف کرنا سے ہمیشہ  
ہی خواری لگتی تھی۔ بس نہیں چلتا تھا کہ اپنے فیشنل اور  
ہیئر کٹنگ کے لیے بھی حمسنی کو روانہ کر دیتی مگر  
تیسرے ہی دن حمسنی پھر آدمکی اور اسے تھیٹ کر  
پارلر لے گئی۔

اس بار امی بھی بار بار سختی سے تاکید کر رہی تھیں۔  
”ڈراڈھنگ کی شکل نکال کر لانا۔“

”تو کیا پارلر والوں نے ڈبے میں شکلیں ڈال کر  
رکھی ہوئی ہیں کہ جو جتنا زیادہ پیسے دے گا اسے اتنی  
ہی اچھی شکل نکال کر دے دیں گی۔“  
”فضول کی باتیں مت کرو۔“

”لو میں کب..... وہ تو امی ہی بول رہی تھیں۔“ وہ  
حمسنی کی سنجیدہ شکل دیکھ کر مزید بک بک کا ارادہ کینسل

ہے۔“ حمسنی کا جی چاہا اپنے بال نوچ ڈالے اسے حمسنی  
کے انداز پر ہنسی آگئی۔

”اچھا جب تم جاؤ پارلر تو مجھے بھی لے چلنا۔“ اس  
نے رضامندی دے ڈالی اور فوراً ہی پھنس گئی۔

”چلو پھر آج ہی۔“  
”کیا..... آج.....“ اس کی آواز چیخ سے  
مشابہ تھی۔

”کیوں آج کیا یوم کشمیر ہے؟“  
”کیوں یوم کشمیر کو شاپنگ منع ہوتی ہے۔“ انداز  
بہت ہی دل جلانے والا تھا۔

”جی نہیں عام تعطیل ہوتی ہے۔ مارکیٹیں بند ہوتی  
ہیں۔“ حمسنی چڑھی تو گئی۔

”اچھا اچھا..... نہیں میں تو اس لیے منع کر رہی  
ہوں کہ آج تو تمہیں اپنے اور میرے لیے کپڑے بھی  
لینے ہیں نا، تو میں کہاں خوار ہوتی پھروں گی۔“ وہ  
سنجیدہ ہو گئی۔

”ہاں تم گھر میں ہی خوار ہوتی رہو۔“  
”جی نہیں میں گھر میں خوار نہیں ہوتی، بلکہ اپنے  
گھر میں کوئی بھی خوار نہیں ہوتا، گھر تو جنت ہوتا ہے۔  
جنت پر سکون..... آرام وہ..... آہ۔“

اس نے امی کا دوپٹہ طے کر کے رکھا اور خود بستر پر  
اپنی گردن سہلاتی ہوئی گر گئی۔

”تو تم نہیں چلو گی؟“ اس کے انداز بتا رہے  
تھے۔ پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔

”پلینز آج نہیں، پہلے اپنی شاپنگ کر لو، پھر کسی  
دن میں تمہارے ساتھ نکلوں گی تو یہاں سے سیدھا  
پارلر اور پارلر سے سیدھا گھر واپس۔“

حمسنی نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا۔ پھر امی کو  
آتے دیکھ کر روئے سخن ان کی طرف کر لیا۔

”امی! آپ اس روشی کی بیٹی کو سمجھاتی کیوں نہیں  
کتنا کہ لوں ساتھ چل کر اپنی مرضی سے کپڑے لے  
لو لیکن اس گھر حمسنی کو تو سمجھ ہی نہیں آتی۔“ رشنا نے



www.Paksociety.com  
 کر کے خاموش ہو گئی۔  
 سوٹ میں یہ دو چیزیں نمایاں رہیں، باقی جو بھی رنگ اور ڈیزائن پہنتی اس پر اٹھ جاتا جیولری سے اسے خاص شغف نہ تھا، تمنی ہی تھی بے چاری جو ہلکان ہوتی رہتی۔

وہ تو کانوں میں بالے پہن کر بھی خاص نظر آتی اور ٹاپس پہن کر بھی۔ رہے بال تو وہ بھی قدرت کی مہربانی سے اس قدر سلکی اور سیدھے تھے کہ اسے ہیرے اشائل کے لیے بھی کبھی فکر مند نہ ہونا پڑا۔ رات میں تقریب ہے تو صبح شیمپو کر لیا اور برش کر کے کھلے چھوڑ دیئے۔ بہت تردد کیا تو بیچ کی مانگ کو سیدھے اور کبھی اٹنے ہاتھ کی طرف سے نکال لیا، لوبی بن گیا ہیرے اشائل۔

گہرا کاجل، موٹا آئی لائزر اور گورڈ میک اپ کھل۔ پورے خاندان میں اس سے زیادہ سادی اور پرسکون کوئی لڑکی دکھائی نہیں دیتی تھی اور وہ اس سادگی میں بھی سب کو دکھائی دے جاتی۔

شاید خود سے لا پرواہ رہنے کی ایک بڑی وجہ وہ تحریقی نظریں بھی تھیں۔ جو ہر محفل میں اس کا احاطہ کر لیتیں، وہ خود شناس تھی۔ جانتی تھی کہ قدرت نے اسے بہت فرصت میں نہیں تو اتنی جلدی بھی نہیں بنایا۔ ہر چیز مکمل، خوب صورت اور اپنی جگہ فٹ تھی۔ مناسب سراپا اور قد بھی نمایاں تھا۔ یوں خود سے لا پرواہ کر بھی وہ دوسروں سے ان کی غفلت چھین لینے کی صلاحیت تو رکھتی ہی تھی۔ دیکھنے والا پہلی نہیں تو دوسری تیسری نگاہ میں متوجہ ہو ہی جاتا تھا۔

☆.....☆

شادی تمنی کے سسرال میں تھی۔ یوں ان لوگوں کی اتنی قریبی رشتے داری بنتی نہیں تھی لیکن تمنی نے اسے بہت اچھا سا میک اپ کر کے تیار کیا تھا۔ وہ خود بھی خود کو بہت اچھی لگ رہی تھی۔ پھر پوری تقریب میں جس طرح تمنی اسے لپٹے پھری گھر آتے آتے اسے

☆.....☆  
 عصر کے بعد ان کی واپسی ہوئی تھی۔ جب تک امی نے چائے تیار کی ابا اپنی دکان اور بڑا بھائی احمد بھی جا بے واپس آ چکا تھا۔

”دیکھا کتنی اچھی شکل نکلی ہے میری بیٹی کی؟“ امی کے کمنٹس اسی انداز کے تھے۔  
 ”اور نہیں تو کیا۔ اب لگ رہی ہے تھوڑی انسان کی بچی۔“ تمنی نے بول کر زبان دانتوں میں دہالی ابا سامنے ہی بیٹھے تھے اور اس وقت شام کی چائے پی جا رہی تھی۔

”ابا! سن رہے ہیں آپ۔“ اس نے جھٹ سے تمنی کی بات پکڑی۔ ابا مسکرا دیئے۔

”بات کو غلط رنگ مت دو اچھا، بھیا دیکھیں میں ٹھیک کہہ رہی ہوں ناں کتنی اچھی لگ رہی ہے روٹی۔“ تمنی کو اپنی بہن پر بار بار پیار آ رہا تھا۔

”ارے میری بہن تو ہے ہی اچھی۔“ احر نے بھی مسکرا کر رشنا کو دیکھا وہ اترانے لگی۔ امی بار بار نظروں ہی نظروں میں اس کی بلائیں لے رہی تھیں۔

اور یہ سچ ہی تھا کہ جس طرح رنگ روپ خدا کی دین ہوتا ہے اور بندے اپنی محنت سے اس میں چار چاند لگاتے ہیں تو رشنا کو یہ چار چاند والی محنت کی ضرورت نہ تھی۔ وہ خود سے جتنی بھی غافل رہتی مگر

حقیقت یہ تھی کہ اللہ نے اسے بہت پیاری من موہنی صورت سے نوازا تھا رنگت اگرچہ سرخ و سفید نہ تھی مگر چمکتی دکتی رہتی تھی دن میں ایک بار ہی وہ اپنے فیس واٹس سے منہ دھوتی جو تمنی اس کے لیے لائی تھی لیکن اسی سے اس کی صحت مند جلد دکنے لگتی، کبھی عید اور

شادی بیاہ کے موقعوں کے علاوہ فیشنل تو دور کی بات وہ کبھی پینج ٹیک استعمال نہیں کرتی تھی۔ اس کی پسند بھی بے حد محدود تھی۔

جن والی آستینیں اور چوڑی دار پاجامہ بس ہر



حمسنی نے دوپہر میں فون کیا تھا۔

”دیکھو روشی! اپنا حلیہ ٹھیک سے درست کرنا ورنہ

گھبراہٹ خیر نہیں ہوگی۔ یہ میرے سرال والے ہیں

اب میری عزت تمہارے ہاتھوں میں ہے۔“ رشنا

نے صبر سے اس کا بھاری بھرکم ڈائلاگ سنا۔

”فکر مت کرو، میں نے صبح اٹھتے ہی ناشتے کے

بعد کلیننگ کر لی تھی اور جو کپڑے تم بتا کر گئی تھیں وہی

پریس کر کے رکھے ہیں۔“

”گڈ۔“ وہ مطمئن ہو گئی۔

جس وقت مہمانوں کی آمد ہوئی اور امی ابا اور احمر

انہیں ریسیو کرنے گئی تک گئے اس اسحق کو یہ یاد نہ

رہا کہ مہمان سیدھے یہیں آئیں گے۔ یعنی

ڈرائنگ روم میں، وہ آخری ناقہ انہ نگاہ سب طرف

ڈال رہی تھی۔ جب قریب آتی آوازوں پر اسے

ہوش آیا۔

وہ تیزی سے باہر نکلنے لگی تھی کہ اس کا ہاتھ لگنے

سے لہا اور خوب صورت گلدان زمین بوس ہو گیا۔

دھات کا بنا ہوا تھا اس لیے ٹوٹا تو نہیں مگر سین خاصا

قلبی ہو گیا۔

امی تو لڑکے کی ماں اور بہن کو لے کر اپنے کمرے

کی طرف چلی گئیں اور موصوف خود اپنے والد کے

ہمراہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے تو ایک گھبرائی

بوکھلائی حسینہ ہاتھوں میں پھول تھامے استقبال کو تیار

کھڑی تھیں۔

شاہان حسن اس پر نظر پڑتے ہی ٹھک گیا۔ دل

نے فوراً ہی سید قبولیت جاری کی اور وہ ہکلائی ہوئی

سلام کر کے پھول سینٹر نیبل پر تقریباً پھینکنے والے

انداز میں وہاں سے نکل بھاگی۔

”معاف کیجئے گا میری بچی ذرا نادان ہے۔“ ابا

کی مسکراتی معذرت خواہانہ آواز کانوں میں پڑی تو

دل میں افسوس کی لہر نے سراٹھایا۔

”ارے صاحب! بچیاں تو سب ہی نادان اور

حمسنی کے سرال میں ہی سے ایک جگہ سے اس

کے لیے پرپوزل آنے والا تھا اور یہ شادی کی تقریب

ایک طرح سے اس کا بردکھوا تھا۔

وہ گھر آ کر حمسنی پر خوب برسی کہ اسے پہلے سے

کیوں نہ بتایا گیا۔

”تمہارا کوئی بھروسہ نہیں یا تو سن کر جانے سے ہی

انکار کر دیتیں اونہہ..... خوار۔“ حمسنی نے اس کی لعل

اتاری۔

”یا پھر اس قدر کنفیوژ ہو جاتیں کہ ایک دم ہونق

نظر آتیں۔“

بات غلط نہیں تھی اس کے ساتھ پہلے بھی اس طرح

ہو چکا تھا کہ کسی تقریب کے دوران اسے پتا چلا کہ

یہاں وہ موصوف خود بھی موجود ہیں جن کے لیے

اسے تاڑا جا رہا ہے اس کی شکل ایسی ہی قابل رحم ہو گئی

تھی کہ حمسنی نے فون کر کے امی کو کہا تھا۔

”اگر ان کی جگہ میں ہوتی تو کب کا اسے ریجنکٹ

کر چکی ہوتی۔ سمجھائیں اسے۔ ساٹھ کی دہائی کی

ہیروئن کو جب گھر سے نکلے گی نہیں لوگوں سے ملے گی

نہیں تو ایسے ہی کارٹون بنی رہ جائے گی۔“

وہ سن کر بھی ساٹھ کی ہیروئن ہی رہی اور ہیروئن تو

ہیروئن ہی ہوتی ہے چاہے ساٹھ کی ہو یا دو ہزار پندرہ

کی یوں بھی پردہ کرنی تھی اس کی جوتی۔

☆.....☆

جن لوگوں نے اسے پسند کیا تھا آج حمسنی انہیں

ساتھ لے کر ابا اور احمر سے ملوانے اور گھر دکھانے لا

رہی تھی۔ موسم صبح سے ایر آلود تھا اور رشنا اس فکر میں

ہلکان تھی کہ خدا نہ کرے مہمانوں کے آنے سے پہلے

یا ان کی موجودگی میں آندھی نہ آجائے۔

فضا میں جس اور گرمی تو نہیں تھی لیکن ٹیالے

بادلوں کی موجودگی نے اسے ٹھیک ٹھاک ہولا کر رکھا

ہوا تھا۔



”تمام مراحل بخیر و خوبی نئے دن پر لگا کر اڑ گئے۔ وہ اپنے باہل کی دلہیز ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر پیاسنگ رخصت ہو گئی۔ جہاں ایک چھوٹا سا پیارا سا گھر اس کا منتظر تھا۔ شاہان ایک بہت ہی محبت کرنے والا اور خیال رکھنے والا شوہر ثابت ہوا۔

وہ ہر بات میں رشنا کی پسندنا پسند کو ترجیح دیتا، جب تک آفس کی طرف سے چھٹیاں ختم نہیں ہوئیں روزامی سے ملوانے لے جاتا رہا۔ ساس سر جیٹھ کے ساتھ دوسرے شہر میں اپنے آبائی گھر میں رہتے تھے۔ چند دن اسی کے گھر گزار کر ساس نے اس سے کھیر پکوائی۔ گھر کا انتظام اس کے حوالے کیا اور اپنا رخصت سفر باندھا۔

جانے سے ایک دن پہلے شام میں جب اس نے پہلی بار سب کے لیے خود چائے بنائی اور اپنے سر سے انعام بھی وصول کیا۔ تب اس کی ساس نے محبت سے اسے اپنے قریب بٹھالیا۔

”تھک تو نہیں گئی میری بیٹی۔“  
”نہیں امی! بھلا کام ہی کیا کیا ہے میں نے۔“ وہ ذرا شرمندہ سی ہو گئی۔

”اچھا مگر چہرے سے تو بہت تھکی ہوئی لگ رہی ہو۔“ اس کی جھٹائی بھی پاس ہی بیٹھی تھیں۔

”اچھا!“ اس نے بے ساختہ اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ دل ہی دل میں ہلکی سی گھبراہٹ بھی ہوئی۔ بے ساختہ جمینی کی نصیحتیں یاد آنے لگیں۔

”سسرال والے جب تک ہیں خوب بن سنور کر رہنا لوگ نئی نوپلی دلہنوں کو بس دلہن کی طرح ہی دیکھنا چاہتے ہیں۔ ان کے جانے کے بعد بھلے اتنا کچھ لادنا مت خود پر۔ لیکن دن کے وقت شام میں جیسے ہی شایان کے آنے کا نام ہو نہادھو کر تیار ہو جایا کرنا۔“

”کیوں۔ میں کیا کوئی ماڈل گرل بن کر ان کی

معصوم ہوتی ہیں۔“ یہ یقیناً اس کے متوقع سسر تھے۔  
”جی! چالاک، عیار تو آج کل کے بچے ہوتے ہیں۔“ کچن میں گھستے ہوئے اس کے دل سے آواز آئی، کسی کی شبیہ نگاہوں میں لہرائی اور وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

”کہا بھی تھا امی کہ ڈھنگ سے تیار ہونا اور اس کی حالت دیکھیں۔ یہ..... یہ نہ ہاتھوں میں چوڑی نہ انگلی میں چھلاکان ننگے..... اف!“ جمینی ان کے جانے کے بعد دانت کچکچا رہی تھی۔

”تم اتنی ہلکان کیوں ہو رہی ہو؟“  
”ہلکان کیوں نہ ہوں میں آج کل لڑکیاں کتنا تیار ہو کر سامنے آتی ہیں معمولی شکل و صورت کی بھی خود کو کیا سے کیا کر لیتی ہیں اور ایک تم ہو اچھی خاصی شکل ہے اور یہ ماٹھا حلیہ۔“

ای چپ تھیں صاف ظاہر تھا کہ وہ جمینی سے متفق ہیں وہ اطمینان سے احمر کی پینٹ پر جما جما کر اسٹری کرتی رہی۔ پھر چند لمحوں کے بعد اس کی مسکراتی ہوئی آواز ابھری۔

”تم فکر مت کرو، مجھے پسند کر لیا ہے انہوں نے۔“ جمینی جو بدک کر پھر کچھ کہنے جا رہی تھی چونک گئی۔

”کیا مطلب..... تمہیں کیسے پتا۔“ وہ ماتھے پر ہاتھ مار کر رہ گئی۔ اب پھولوں والا قصہ جمینی کے گوش گزار کرنا ناگزیر تھا۔ اس نے پلٹ کر امی اور جمینی کو دیکھا پھر سر جھکا کر پوری روداد نشر کر دی۔

”یا اللہ امی! دیکھی آپ نے اس کی حرکت۔ یعنی ڈرائنگ روم میں جو اکلوتا ڈیکوریشن پین تھا مٹرمہ نے گرا کر پھول ٹیبل پر پھینک دیئے اف!“ وہ سر پکڑ کر امی کے برابر میں گر گئی۔ اس کے لبوں پر دبی دبی مسکراہٹ ابھری جسے چھپانے کے لیے اس نے رخ

موڑ لیا۔



زندگی میں شامل ہوئی ہوں۔“

”ہاں شروع سال میں ہر آدمی اپنی بیوی کو

ماڈل کے روپ میں ہی دیکھنا چاہتا ہے۔ سن لو کان کھول کر۔“ جمنی محض دو سال بڑی ہو کر کتنی سمجھ دار ہو گئی تھی۔

”تو یہ ہے۔ تمہارے بچے نہیں ہیں آپنی مگر تم

باتیں بالکل اماں دادیوں کی طرح کرتی ہو۔“ اسے

کیا کچھ یاد آنے لگا۔

”کہاں کھو گئیں لی بنو، اس طرح بات بات پر

بیٹھی سوچتی رہیں تو ہو گیا گزارا۔“ جثنانی بظاہر ہنس

کر بولی تھیں ساس بھی مسکرا دیں۔

”جاؤ نہادھو کر کپڑے بدلو تیار ہو جاؤ شاہاش۔“

وہ جلدی سے کھڑی ہو گئی۔ مبادا جثنانی پھر کچھ کہہ

دیں۔

”جی ابھی جاتی ہوں، وہ اصل میں آج ان کے

سر میں کچھ درد تھا تو میں ڈسٹربنس کے خیال سے

کمرے میں نہیں گئی۔“ اس نے سرسری کا ذکر کیا

لیکن اس کی جثنانی پھر اچھل پڑیں۔

”کیا..... ارے امی! شایان کے سر میں درد

ہے۔ تم نے کوئی ٹیبلیٹ وغیرہ دی؟“

”جی انہوں نے پین کلر لے لی تھی۔“ وہ گھبرا

سی گئی۔

”اس کو تو میگزین ہوتا ہے پتا نہیں کتنی تکلیف

ہوگی۔“

”میں دیکھتی ہوں۔“

کمرے میں نیم اندھیرا تھا۔ وہ اندر داخل ہوئی تو

شایان اسے دیکھ کر مسکرا دیا۔ روشنی کو اس کی طبیعت

کافی بہتر محسوس ہوئی اور اپنی جثنانی کی اتنی فکریں لمحہ

بھر کے لیے فضول کا دکھاوا۔

”آپ کی طبیعت ٹھیک ہو گئی۔ بھابھی کہہ رہی

تھیں کہ آپ کو بہت خطرناک درد ہوتا ہے آدھے

سر کا۔“

”ہاں لیکن اب طبیعت بہتر ہے۔ امی سے کہو

چائے دے دیں۔“

”میں لاتی ہوں۔“ اس نے بے اختیار اطمینان کا

سانس لیا۔

زندگی اپنی مخصوص ڈگر پر چل پڑی تو جانے کب

دن ہفتوں میں ہفتے مہینوں میں اور مہینے سالوں میں

بدل گئے۔ رشنا شاہان کا آنگن تین ننھے منے پھولوں

کی قلقاریوں سے چمکنے لگا۔ شایان نے اسے خوب

محبت دی حتیٰ المقدور خیال رکھا۔ شکایات کے مواقع

بھی کم ہی آئے دوسری طرف رشنا نے بھی اس کے

گھر کو جنت بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ پورا

گھر اس کی محبت، سکھڑا پے اور محنت کا منہ بولتا

ثبوت تھا۔

پردوں سے لے کر کیشنز کوڑ تک اس کے اپنے

ہاتھوں کے بنے ہوئے، کیاریاں تھیں تو وہ مہکتی

ہوئی، چمن تھا تو وہ آسینے کی طرح شفاف اور بیڈروم

کی تو بات ہی کیا تھی۔ ماں کے گھر میں جہاں اس پر

کوئی خاص ذمہ داری نہیں تھی وہاں اسے خود بھی اپنی

صلاحیتوں کا اندازہ نہیں تھا۔ سر پر ذمہ داری پڑی

تو جیسے کھل کر صلاحیتیں سامنے آئیں اور پھر نکھرتی

چلی گئیں۔

اگر پورے گھر میں کوئی چیز ایسی تھی جو اس کی توجہ کو

ترستی تھی تو وہ تھی اس کی اپنی شخصیت۔ کئی کئی بار جمنی

کے کہنے پر وہ بار بار کا چکر لگاتی ورنہ گھر میں پڑا ہوا

کلیننگ اور فیشل کا سامان بھی بس اپنی ایکسپاٹری

ڈیٹ کا انتظار ہی کرتا رہتا۔

صبح صبح ایک بار اس کا منہ دھل جاتا پھر سارا دن

وہ تین رنگ کے کپڑوں میں ملبوس پھر کی کی طرح

ادھر سے ادھر کام نمٹاتی پھرتی۔ کئی بار شاہان نے اس

کی توجہ اس طرف مبذول کروائی پھر جیسے اس کی

عادت سے سمجھوتا کر لیا۔ روشنی بھی مطمئن سی زندگی

کے شب و روز میں مصروف ہو گئی لیکن یہ اس کی خام



خیالی تھی کہ شاہان نے اس کی عادت کے ساتھ سمجھوتا کر لیا تھا۔

ایسا نہیں تھا۔ یہی وہ جگہ تھی جہاں اس نے شاہان کو سمجھنے میں غلطی کر دی تھی۔

☆.....☆

”کل آپ ریستورنٹ میں کسی لڑکی کے ساتھ لہجے کر رہے تھے؟“ رات کے کھانے پر اس نے بہت سرسری انداز میں ذکر چھیڑا تھا۔

”کل!“ شاہان سوچ میں پڑ گیا۔

”اوہ..... وہ..... ہاں میری ایک کولیگ ہے، تمہیں کس نے بتایا؟“

”جمنی آپنی نے۔“ روشی نے کھوجتی نظروں سے اپنے مجازی خدا کا چہرہ پڑھا مگر وہاں کوئی خاص تاثرات نہ تھے۔

”اچھا۔“ شاہان کھانا کھاتا رہا۔

”اگر اس نے دیکھ ہی لیا تھا تو مجھ سے مل بھی لیتی۔“

”وہ سمجھی کہ آپ کا کوئی انیئر چل رہا ہے۔“ شاہان نے اس کا چہرہ دیکھا۔ وہ برتن اٹھانے لگی۔ شکل سے تو بہت سنجیدہ لگ رہی تھی۔

”اور تم کیا سمجھیں؟“

”میں تو وہی سمجھوں گی جو آپ سمجھا دیں گے۔“ اس نے خود پر مصنوعی مصومیت طاری کر لی۔

”اوہ یار پلیز! دیکھو ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ ہم دونوں کو بھوک لگی تھی ایک کلائنٹ سے مل کر آرہے تھے تو راستے میں.....“ اس کی بات ادھوری رہ گئی۔

رشنا کے منہ سے قل قل ہنسی کا فوارہ پھوٹ پڑا تھا۔ شاہان چند لمحے اسے دیکھتا رہا پھر اس کی شرارت سمجھ گیا۔

”بہت بری بات ہے روشی! تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا۔“ وہ ریلیکس ہو کر اس کا ہنستا ہوا چہرہ دیکھنے لگا۔

☆.....☆

بچے ٹیوشن پڑھنے گئے ہوئے تھے۔ مغرب سے پہلے کا وقت تھا۔

اس نے چائے دم پر رکھ کر ٹرائی کو نئے سرے سے جانچا۔ پھر کچن سے نکلنے سے پہلے اپنے نئے سوٹ کی میچنگ کا جارجٹ کا دوپٹہ سلیقے سے اوڑھا اور ڈرائنگ روم کی راہ لی۔

آج شاہان کے دو کولیگ جن میں وہ خاتون بھی شامل تھیں جنہیں جمنی نے شاہان کے ساتھ ریستورنٹ میں دیکھا تھا۔ شام کی چائے پر ملنے کے لیے آئے تھے۔ شاہان نے صبح سے ہی اسے بتا دیا تھا اور جتا بھی دیا تھا کہ آج اسے اکھٹلی ڈھنگ سے تیار ہو کر مہمانوں کے سامنے آنا ہے۔

”ہمیشہ کی طرح اس بے ڈھنگے حلے میں مت اٹھ کر چلی آنا۔ وہ بہت ویل ڈریسڈ لڑکی ہے اور ہر چیز کو بہت غور سے دیکھتی ہے۔“

اسے یوں خاص طور پر شاہان کا جتنا بالکل برا نہیں لگا تھا۔ پچھلے کچھ دنوں یا شاید ہفتوں سے وہ رشنا کے بے ہنگم پھیلتے وجود اور خود سے لاپرواہی پر کچھ زیادہ ہی ٹوکنے لگا تھا۔ اور وہ تھی کہ ہمیشہ کی طرح..... افوہ..... کھانا پینا ہم سے نہیں چھوڑا جاتا۔ لاپرواہی سے اس کی بات کو چنگیوں میں اڑانی۔

شامی کباب، چائیز رول، کباب، بیٹھے وہی بڑے اوڈر یہاں تک کہ گلاب جامن تک اس نے گھر میں تیار کر ڈالے۔ اگر شاہان اپنی کولیگ سے متاثر تھے تو آج وہ بھی اس کو متاثرین میں شامل کر کے ہی یہاں سے بیچنے کا ارادہ رکھتی تھی۔

صبح سے ان چیزوں کی تیاری اور گھر کی خاص الخاص صفائی نئے سرے سے سیٹنگ کی تبدیلی نے ہمیشہ کی طرح اسے خود سے بیگانہ کر دیا تھا۔ نتیجتاً جب تک اس نے نہا ڈھو کر نیا سوٹ زیب تن کیا مہمان آچکے تھے۔ لیکن شکر تھا کہ ہر چیز وقت پر تیار اور بچے ٹیوشن کو روانہ ہو چکے تھے۔



# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✦ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسجے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

# WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on  
Facebook

[fb.com/paksociety](https://fb.com/paksociety)



[twitter.com/paksociety](https://twitter.com/paksociety)



اس نے ڈرائنگ روم میں داخل ہونے سے پہلے لمحہ بھر رک کر ایک گہری سانس اندر کو کھینچی۔ وہ پہلی بار شاہان کے کسی آفس کو لیک سے ملنے جا رہی تھی۔

”خیر تمہاری تو پر سنالٹی ہی سب سے الگ ہے۔“ شاہان کے تعریفی کلمات نے اس کی سانس اندر کی اندر ہی گھونٹ دی۔

”بھلا میری وائف اور تمہارا کیا مقابلہ۔ پاگل ہو تم ابھی آئے گی تو دیکھنا اسے جب سے شادی ہوئی ہے شاذ و نادر ہی کھل سوت میں دیکھا ہے۔“ رشنا کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔

یہ اس کا محبوب شوہر تھا۔ جس کی خاطر وہ جان سے گزر سکتی تھی۔ جس کے گھر اور بچوں کو بنانے کی خاطر اس نے اپنا آپ سٹاڈالا تھا۔ وہ کسی اور عورت سے اس کی تعریف کر رہا تھا۔ اپنی بیوی کی برائی کے ساتھ اور وہ بھی اس قدر مبالغہ آمیزی سے کہ حد ہی کر دی تھی۔

”یار یہ ہاؤس واپس تو سب ہی ایک ہی ہوتی ہیں، گھر اور بچوں کی فکر ہر وقت سر پر سوار کر کے بدحواس اور بوکھلائی ہوئی پھرنے والی۔“

یہ دوسرے مرد کی آواز تھی۔ رشنا کا جی چاہا اندر جا کر ایک زوردار طمانچہ مارے، اپنے شوہر کے منہ پر۔ جو بڑے طمطراق سے نامحرموں کی یہ محفل سجا کر بیٹھا خود بھی ایک غیر عورت کی مدح سرائی میں مصروف تھا۔ بلکہ دوسرے نامحرم مرد اس کی اپنی بیوی پر سٹکس پاس کر رہے تھے اور اسے ہوش تک نہیں تھا۔

اسے لگا وہ یہیں چکرا کر گرے گی اور ساری زندگی اٹھ نہ سکے گی۔ کپکپاتے ہاتھوں سے اس نے دروازہ ناک کیا اور وہیں سے پلٹ گئی۔

”ارے رشنا! تم آئی نہیں وہاں وہ دونوں تمہارا.....“ کمرے میں داخل ہوتے ہی شاہان کے الفاظ منہ میں رہ گئے۔ ڈرائنگ کے سامنے بالکل مختلف چلیے والی رشنا کھڑی تھی۔

یہ اس کی وہ بیوی نہیں تھی جسے وہ روز آفس سے واپسی پر سر جھاڑ منہ پہاڑ کبھی بچوں تو کبھی کچن کے ساتھ مصروف دیکھتا تھا۔

یہ..... یہ تو کوئی ماڈل گرل تھی شاید، جدید تراش کے سوٹ میں ایک سائٹ پر دوپٹہ کھلے ہوئے سلکی اخروٹی بال، ڈارک لپ اسٹک اور آؤٹ آف آن کے ساتھ چمکتا ہوا چہرہ۔ وہ تینا پہلے سے کچھ موٹی ہو گئی تھی۔ لیکن بد صورت نہیں۔

کانوں میں نئے موتی جگمگا رہے تھے۔ ہاتھوں میں بریلیٹ تھا۔

”چلیں میں ذرا تیار ہونے لگی۔“

اس کا لہجہ، انداز، آواز سب بے حد نارمل تھا۔ کہیں سے نہیں لگتا تھا کہ کچھ لمحوں پہلے اس نے اپنے شوہر کی کوئی بات سنی تھی جو اس کی دل آزاری کا سبب بنی تھی۔ اس نے کمرے میں داخل ہونے سے پہلے اپنے لڑکھڑاتے قدموں کو قابو کیا تھا۔ اپنی سرخ بھری ہوئی آنکھوں کو رگڑا تھا اور چند لمحے صورت حال کا جائزہ لینے کے بعد اپنے شوہر کو اس بے ایمانی پر معاف کر دیا تھا۔ جی ہاں اس نے معاف کر دیا تھا۔

شاہان کے شانہ بشانہ پروقار چال چلتے ہوئے اس نے غیر جانبداری سے سوچا۔

”قلطی میری ہی تھی۔ نہ میں خود سے اتنا غافل رہتی نہ یہ بات سننا پڑتی۔“ ساری زندگی خود سے لاپرواہ رہنے والی کو شوہر کے ایک جملے نے سدھار کر رکھ دیا تھا۔

☆.....

☆.....☆



# چند روزمانی



READING  
Section



رانی نے مسکرا کر دس کے نوٹوں کی گڈی دیکھی اور پھر مسکرا کر دو اور ایک کے سکوں کی جھنکار سنی تو لب آپ ہی آپ مسکرا دیئے اس کے گرد بیٹھے چاروں نفوس نے اشتیاق سے رقم جانتی چاہی۔

”آپا مطلوبہ رقم پوری ہو گئی ہے یا نہیں؟“  
صدا کی بے صبری سوئی فٹ سے بولی۔ صبحی، شان اور مان نے بھی امید بھری نگاہوں سے آپا کو دیکھا، دس ہزار سات سو پینتیس روپے سب کے چہرے کھل کر گلاب ہو گئے۔

اصغر اور آسید دونوں غریب گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ اصغر معمولی مزدور سے مستری بن گیا مگر اور تیلے کے پانچ بچوں نے اس مہنگائی کے دور میں کمر توڑ دی۔ بیٹیوں کو آٹھ جماعتوں تک پڑھایا، شان مان دونوں دسویں جماعت میں پڑھ رہے تھے سو خرچے اس لیے قربانی کرنے سے رہ جاتے۔ بچوں کی بڑی خواہش تھی کہ سب گھرانوں کی طرح ان کے گھر بھی ہفتہ بھر پہلے قربانی کا بڑا نہ سہی چھوٹا جانور تو ضرور ہو۔ برے ہوتے گئے حالات نے ان کی خواہش کو راکھ کر ڈالا مگر دبی دبی چنگاری باقی رہ گئی اس لیے ان پانچوں نے کچھکی عید پر عہد کیا کہ عید قربان پر ان کے گھر بھی انشاء اللہ قربانی ہوگی اماں ابا سے کہنا فضول تھا، کبھی ڈانٹ دیتے بلوں کی فہرست ان کی سماعتوں میں اٹھیل دیتے بھی آپا نے پلان کیا، وہ سب ملا کر پیسے جمع کریں گے تو اگلے سال انشاء اللہ وہ بھی قربانی کر سکیں گے۔ سبھی نے آپا کے ریڈ شیشے والے بکس میں سب بہنوں کی چاندی کی انگوٹھیاں اور ہالیاں رکھی تھیں اپنی عیدی کا ایک جوڑا اپنے پاس رکھا اور تین جوڑے محفوظ کر لیے آپا سلائی کرتی تھیں محلہ کی عورتیں آ کر ڈیزائن دیتی یوں آپا نے سلائی کے سوٹ چھپا کر

سینا شروع کر دیئے اور بکس میں پیسوں کا اضافہ ہونا شروع ہوتا گیا۔ سوئی اور صبحی نے کڑھائی کر کے پیسے بچانے شروع کر دیئے۔ شان اپنی اچھی میٹھ کی بنا پر بچوں کو ٹیوشن پڑھانے لگا۔ مان جنرل اسٹور پر جاب کرنے لگا، اتنی دیر باہر رہنے پر اماں ابا نے ڈانٹا بھی آج ان سب کی محنت ان روپوں کی صورت میں سامنے تھی۔

”شان تم کل ہی جا کر منڈی سے ریٹ کا پتہ کرو۔“

”نہیں آپا! منڈی سے نہیں نہیں کسی گاؤں سے پتہ کرنا ہوگا، ابھی تو ایک ماہ رہتا ہے۔“ رانی نے مسرت سے پیسے سنبھالے اور بکس کے چمکی تہہ میں رکھ دیئے۔

”اف میرے خدا! اس سے پہلے کہ لائٹ جائے میں تم لوگوں کا یونین فارم استری کر دوں۔“  
صبحی بھاگی، سوئی ادا اس پیٹھی تھی۔

”کیا ہوا گریا؟“ مان نے محبت سے پوچھا۔  
”اتنے پیسوں میں بکرا آجائے گا؟“

”ہاں بالکل انشاء اللہ، بس دعا کرو خدا ہمیں قربانی کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور ہماری قربانی کو قبول کرے۔“

اصغر جیسے ہی گھر آیا تو خلاف معمول خاموشی تھی ورنہ رانی سامنے بیٹھی سلائی مشین گھر گھر چلا رہی ہوتی، تو ان کا دل وہم سے بھر جاتا، صبحی فل ولیم میں ایف ایم چلائے خود بھی یعنی اور ملکہ ترنم بننے کی کوشش کرنی، آسید مہنگائی کا دکھڑا رو رہی ہوتی، جسے سب ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دیتے یا کبھی اماں کے ساتھ پریشان ہو جاتے۔ چھوٹی صبحی بڑی بی بی بن کر تسلی دیتی تو سب کھلکھلا دیتے۔ اصغر نے رانی کو پکارا۔ ”رانی اورانی! ایک گلاس پانی تو پلا۔“

”جی ابالائی۔“



www.Paksociety.com  
 کر رہا ہے۔ ہمارا جذبہ قربانی سن کر پکھل گیا۔  
 مبارک ہو انشا اللہ ہمارا جذبہ قربانی ضرور رنگ  
 لائے گا۔“  
 اصغر گھر آیا تو خلاف معمول کنڈی اندر سے لگی  
 تھی۔

”شان!“

دستک کے ساتھ انہوں نے آواز دی تو فوراً  
 رانی نے دروازہ کھولا اس سے پہلے کہ وہ کچھ  
 پوچھتے ان کے کھلے منہ میں رس گلا آسایا۔ انہوں  
 نے بچوں کو حیرانی سے دیکھا جو قطار میں کھڑے  
 تھے اور پھر بیوی کو جو چہرے پر دھنک رنگ لیے  
 مسکرا رہی تھیں مان نے فوراً کہا۔ ”ابا آنکھیں بند  
 کر لیں۔“ سب دل میں دعا کر رہے تھے کہ ان کہ  
 بتانے سے پہلے بکرانہ بول پڑے۔  
 ”اب نکھول دیں۔“ سفید کالا بکرا فخر سے  
 گھاس کھاتے ہوئے انہیں دیکھ رہا تھا۔

”یہ وہ بمشکل بولے۔“

”یہ ہمارا بکرا ہے۔“

”یہ ہم سب کا جذبہ قربانی ہے اور انشا اللہ خدا  
 سے دعا ہے وہ ہم کو یہ سعادت ہر سال نصیب  
 فرمائے۔ سونی بھیگی آواز میں بولی خدا کے حضور یہ  
 چھوٹا سا نذرانہ ان کی بھیگی آنکھیں دیکھ کر ان کی  
 خود آنکھیں بھیگ گئیں اور محبت سے بیوی بچوں کو  
 دیکھا اور آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی تو آنسو  
 ڈھلک گئے۔“

”خدا یا تیرا شکر ہے جو تو نے مجھے اتنی صالح  
 اولاد سے نوازا میرے بچوں کے دلوں میں جذبہ  
 قربانی ڈالا میں تیرا شکر گزار ہوں خدا یا۔“  
 وہ اپنے بچوں کو دیکھ کر رب کے شکر گزار تھے۔

☆.....

”سب کہاں ہیں؟“  
 ”صبوحی اور اماں چھوٹی خالہ کے گھر گئی ہیں۔  
 سونی، مان اندر ہیں اور شان باہر گیا ہے، کہہ رہا تھا  
 ذرا دیر سے آئے گا۔“ رانی نے تفصیل بتائی ابا کو  
 رانی کی صورت اتری ہوئی لگی۔

”کیا ہوا رانی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟“

”جی ابا۔“ رانی گھبرا گئی اور جلدی سے  
 باورچی خانے کی طرف بڑھ گئی۔

بیس دن رہ گئے ہیں۔ شان نے بکرے کا پتہ  
 کیا بکرا وہ بھی ٹھیک سا گیارہ ہزار روپے کا وہ بھی  
 کسی گاؤں سے پتہ کیا تھا انہوں نے دو دن کا ٹائم  
 دیا تھا ورنہ وہ اور کسی کو بیچ دیں گے۔

”کہاں سے دو دن میں نو سو پچھتر روپے  
 لائیں۔ پانچ سو تو یک اپ والا مانگ رہا ہے دو سو  
 حاجی صاحب لیں گے۔ وہ پہلے بھی ساتھ گئے تھے  
 بکرا بالکل قربانی لائق ہے۔“

اس لیے سب کے چہرے اترے ہوئے تھے  
 رانی نے رات میں دو سو ٹوں کی سلائی کی اور اماں  
 سے جھوٹ بولا کہ بس ایک ہی سلوایا ہے۔ اماں بھی  
 کیا کرتی اس مہنگائی میں گزارا کرنا مشکل تھا۔ اس  
 لیے ہر وقت بچت کی لگی رہتی اور پھر عید کا خرچ۔

”شان تم کچھ وقت مانگ لو۔“

”ہاں یہ ٹھیک ہے ان کا نمبر ہے، میں پی سی او  
 سے فون کرتا ہوں اگر وقت دیا تو انشا اللہ بات بن  
 جائے گی۔“

”پانچ دن رک جائیں تو دو تاریخ کو تنخواہ مل  
 جائے گی۔“

”ہاں میں بھی دو تین جوڑے سلائی کر  
 لوں گی۔“

شان شام میں گھر آیا تو بہت خوش تھا۔  
 ”وہ خود بھی عمرے پر جانے کے لیے پیسے جمع



# ہوا عشق سے بستی و عشق ہی جہان

احتیاط سے اپنی گرفت میں پھڑ پھراتے کبوتر کے پر تراشتے ہوئے وہ خرمن کی طرف متوجہ ہوا تھا، جو کرسی پر براجمان اپنے چہیتے کبوتر سے لاڈ کرنے میں مصروف تھی، کچھ کوفت کے ساتھ وہ دوبارہ کبوتر کے پروں کی



READING  
Section



تراش کا جائزہ لے ہی رہا تھا کہ ایک دوسرے کی بوتل کے پھٹ پھڑاتے پر اس کے چہرے سے ٹکرائے تھے، ہز بڑا کراٹھتے ہوئے اس نے گرفت سے کیوترا کو آزاد کر دیا تھا، اور جھلائے انداز میں اپنے حملہ آور کی طرف بڑھا تھا مگر وہ کیوترا بھی ہوشیار تھا، پلک جھپکتے ہی پنجرے میں جا گھسا تھا۔

”یہ میرے ہاتھوں ذبح ہو جائے گا، جب سے میں نے تمہارے ان چہیتوں کی ذمہ داری لی ہے، ہر روز یہ مجھ پر جھپٹتا ہے، اس کی وجہ سے میرا چہرہ بگڑ جائے گا۔“ وہ شدید ناراضی کے ساتھ خرمن سے مخاطب تھا۔

”کچھ نہیں ہوتا تمہارے چہرے کو، حشر تو میرا بگڑ چکا ہے، اتنی بے ڈھب کہ گھر میں قید ہو کر رہ گئی ہوں۔“ خرمن نے حسمکین نظروں سے اسے دیکھا تھا جو بے ساختہ مسکرایا تھا۔

”مگر میری نظروں میں دنیا میں حسین ترین تم ہی ہو۔“ عارش نے وارفتہ نگاہوں سے اس کے جھلملاتے چہرے کو دیکھا تھا، ہر گزرتے دن کے ساتھ اس کی خاموشی ٹوٹ رہی تھی، چہرے پر طاری سوگواری میں کمی



READING  
Section



آتی جا رہی تھی، مگر دیکھا جائے تو حالات بدستور وہی تھے، بس یہ تھا کہ فاطمہ سے فون پر وہ رابطے میں رہتی تھی۔ احمد حسین نے ان کو فون پر خرمن سے بات کرنے سے نہیں روکا تھا، وہ خود بھی کس طرح اس کی آواز سے بغیر، اس سے کٹ کر کس طرح دن گزار رہے تھے، یہ عارش جانتا تھا مگر نہ ہی وہ احمد حسین کو راضی کر سکا تھا اور نہ ہی خرمن نے اپنی ضد میں کوئی چلک بیدار کی تھی۔

”مجھے معلوم ہے کہ تم ریڈیو اور مانگ کو بہت مس کر رہی ہو گی، مگر میں بہت مطمئن ہوں تمہیں صبح و شام گھر میں دیکھ کر۔“

”تمہارا یہ اطمینان زیادہ دن تک نہیں رہنے والا۔“ خرمن فوراً بولی تھی۔

”جب وقت آئے گا تو دیکھ لیں گے۔“ مسکراتی نظروں سے اس نے خرمن کو دیکھا تھا، جو بس اسے دیکھ کر رہ گئی تھی، آخری کبوتر کو اس نے بھجے میں ڈالا تھا، جب کال بیل کی آواز نے چونکا دیا تھا۔ عثمان کی آواز سے لگ رہا تھا کہ وہ ٹیرس کی سمت ہی آ رہا ہے، لہذا اس نے گرم شال کو مزید اپنے گرد ٹھیک کر لیا تھا۔

”مبارک ہو بہت بہت، چاچو بن ہی گئے تم، کتنا اچھا ہوا اگر انسان بھی بن جاؤ۔“ خرمن نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

”تم بس خاموش بیٹھی ہوئی ہی اچھی لگتی ہو، ورنہ تمہاری زبان کے لشکارے کافی ہوتے ہیں، اچھے خاصے بندے کو انسانیت بھلانے کے لیے۔“

”تم بھی زبان کھولنے سے پہلے ذرا یاد رکھ لیا کرو کہ یہ تمہارے لیے کافی معجزہ ہستی ہیں، یہ نہ ہوتی تو کون تم جیسے شیطان کو نماز، قرآن پڑھنا سکھاتا۔“ عثمان کی لائی ہوئی مٹھائی کھاتے ہوئے عارش نے اسے گھر کا تھا۔

”مجھے یاد ہے دوست، میرے اور استانی کے درمیان جو ببول کا کامیاب تمہاری صورت میں آگیا تھا، مجھے تو وہ بھی یاد ہے۔“ استہزائیہ نظروں سے عارش کو دیکھتے ہوئے عثمان نے اس سے مٹھائی کا ڈبہ تقریباً چھین لیا تھا۔

”یہ لو پکڑو، ایسی نفرت سے کیوں دیکھ رہی ہو مجھے، اپنے بھائی کی خوشی میں شریک کرنے آیا ہوں، ورنہ تمہارا شوہر تو میرے بھائی کا نام سنتے ہی انگاروں پر لوٹ جاتا ہے۔“ خرمن کے گھورتے رہنے پر عثمان نے

جلے کٹے انداز میں عارش کو چونکا دیا تھا۔

”جو گزر گیا سو گزر گیا، میں برہان بھائی کے لیے بہت خوش ہوں، وہ اب ایک بیٹی کے باپ بن چکے ہیں، ان کی بیٹی نے میرے دل کو ان کی طرف سے بالکل صیاف کر دیا ہے۔“ عارش صاف گوئی سے بولا تھا۔

”سنو! تم نے میزہ کو مبارک باد دی؟ وہ بھی ایک عدد بیجی کی پھپھو بن چکی ہے۔“ مٹھائی کھاتے ہوئے خرمن نے عثمان سے پوچھا تھا۔

”اس نے نوبت ہی کہاں آنے دی کہ میں اسے فون کرتا، اس نے تو شاید ہاسپٹل سے ہی مجھے فون کھڑکا دیا، اور تو اور خوشی میں ایسی پاگل تھی کہ مٹھائی بھی مجھ سے ہی مانگ رہی تھی، پھر میں نے اسے یاد دلایا کہ

تمہارے بھائی صاحب باپ بنے ہیں، اصولاً تو ان کو مٹھائی تقسیم کرنی چاہیے، میری کیا جھے داری ہے اس میں۔“ عثمان کے حسمکین انداز پر خرمن بے ساختہ ہنسی تھی۔

”تمہارے خاندان میں میزہ جیسے اور کتنے نمونے ہیں جن کو صرف مانگنے کی عادت ہے؟“ مسکراہٹ چھپائے عثمان اس سے پوچھ رہا تھا، جو اسے ہی حسمکین نظروں سے گھورنے میں مصروف تھا۔



”خرمن! تم اس سے ناراض تھیں، تم کو یاد ہے کہ یہ کتنے دن بعد یہاں آیا ہے؟“ عارش کو بدلہ لینے کا اچھا موقع ملا تھا۔

”ان کو اپنی بیگم کے ناز نخرے اٹھانے سے اور تقریبات اٹینڈ کرنے سے فرصت ملے، تو یہ یہاں آ کر وقت برباد کریں۔“ خرمن کا لہجہ شمناک تھا۔

”تقریبات اٹینڈ کرنے نہیں جاتا وہ کام ہے میرا، اور بیگم بے چاری کو درمیان میں نہ لاؤ، اس کا کیا لینا دینا تم لوگوں سے۔“

”کیا بول رہے ہو؟“ عثمان کی سنجیدگی پر عارش بے ساختہ ہنسا تھا۔

”یار! مجھ پر دراصل ہو رہا ہے نیند کا حملہ، بیلا نے زبردستی مٹھائی دے کر پہاں بھیجا ہے، ورنہ میں اتنا تھکا ہوا ہوں کہ تڑ سے گر کر پٹ سے سونے کے لیے تیار ہوں، پھر یہ خلش بھی تھی کہ اتنے دن گزر گئے اور میں نے اسٹانی کو.....“

”اس سے پہلے کہ نیند تمہارے مزید ہو اس گم کر دے، تمہیں یہاں سے نکل جانا چاہیے۔“ عارش نے جس طرح اس کی بات کاٹ کر اٹھنے کا اشارہ دیا تھا وہ مسکراہٹ نہیں چھپا سکا تھا۔

”تمہارے لیے اتنی بے عزتی برداشت کرنا ہوں مگر تمہیں میری کوئی قدر نہیں۔“ جاتے جاتے وہ خرمن کو جٹانا نہیں بھولا تھا۔

اپنا تکیہ درست کرتی وہ اس کی طرف متوجہ ہوئی تھی، جو ٹائٹ شرت کے بٹن بند کرنا ڈرینگ کے سامنے جارہا تھا۔

”خرمن! تم اپنی جادو بھری نظروں سے ایسے مت دیکھا کرو، ورنہ جانتی ہو میرا دل کیا چاہتا ہے؟“ ہمیشہ برش اٹھاتے ہوئے اس نے مسکرائی نظروں سے خرمن کو دیکھا تھا۔

”کہیں تمہارا دل یہ تو نہیں چاہتا کہ زمین پٹے اور تم اس میں سما جاؤ؟“ وہ مسکراہٹ چھپائے پوچھ رہی تھی۔

”سن کر اچھا لگا۔“ اس کی حکمکنین نظروں پر وہ دھیرے سے ہنسی تھی۔

”آج کچھ عجیب ہو رہا ہے، مجھے نہیں لگتا کہ نیند آج مجھ پر مہربان ہونے والی ہے۔“ بیڈ کی سمت آتا وہ کچھ الجھے لہجے میں بولا تھا جبکہ خرمن حیران نظروں سے مدھم روشنی میں اس کے چہرے کو تک رہی تھی۔

”میری چھٹی حس بار بار الارم دے رہی ہے، بے خبر ادل نہیں چاہ رہا کہ میں آنکھیں بھی بند کروں۔“ اس کے بے بس انداز پر خرمن بس مسکرائی تھی۔ عارش کی چھٹی حس کے اشارے بالکل درست تھے، آدھی رات گزرنے کے بعد خرمن کی طبیعت بگڑنے لگی تھی، اسے ہاسپٹل جانے کی ضرورت توقع کے عین مطابق درپیش آئی تھی۔ اس کے چہرے پر پھلتے تکلیف کے آثار نے عارش کے ہوش اڑا دیے تھے، مگر ہاسپٹل پہنچنے تک وہ راستے بھر خرمن کو حوصلہ اور تسلی و نشانی دیتا رہا تھا، اس وقت خرمن اسے بتا نہیں سکی تھی کہ اس کی

آواز اور اس کے ہاتھ کالس کتنی ڈھارس دے رہا تھا، وہ چاہتی تھی کہ عارش اس کا ہاتھ تھامے رکھے، مگر

سے نکلنے سے پہلے عارش نے فاطمہ کو بھی فون کر دیا تھا، بیلا اور عثمان ان کو پک کرتے ہوئے ہاسپٹل پہنچے تھے، فاطمہ کو دیکھتے ہی خرمن اپنے آنسو ضبط نہیں کر سکی تھی۔

”گھبراؤ مت، تمہیں کچھ نہیں ہوگا، میں تمہارے لیے اللہ سے دعا کر رہا ہوں۔“ جس وقت اسے لیبر روم میں لے جایا جا رہا تھا، عارش نے اسے یہ کہا تھا، مگر اس کے پریشان چہرے کو دیکھتے ہوئے بھی وہ اپنے



مینزہ اور صبیحہ آگے پیچھے ہی ہاسپٹل پہنچی تھیں اور اب وہ پٹنگ روم میں ایک ایک لمحہ قیامت بن کر گزر رہا تھا، فاطمہ ایک طرف جائے نماز بچھائے دعا میں مصروف تھیں، تو صبیحہ کے ہاتھوں میں تسبیح تھی، درزیدہ نظروں سے ان کی آنکھوں سے بہتے آنسو دیکھتے ہوئے مینزہ کے اضطراب میں اضافہ ہی ہو رہا تھا، ونڈو کے پاس کھڑے عارش کے چہرے کا رنگ اڑا ہوا تھا، جانے اس وقت وہ فون پر کس سے بات کر رہا تھا، مینزہ کو یہی لگ رہا تھا کہ وہ احمد حسین سے بات کر رہا ہے، اس گھمبیر ماحول میں اور خرمن کی فکر میں مینزہ کا دل حلق میں آ رہا تھا، بیلا بھی پاس نہیں تھی، کیونکہ فاطمہ کی ہدایت پر عثمان اسے ساتھ لے کر گھر چلا گیا تھا، گہری سانس لیتی وہ کچھ چونک کر سیل فون کی طرف متوجہ ہوئی تھی اور پھر جنکے سے ہارون کی کال ریسیو کر لی تھی۔

”مینزہ تم اس وقت کہاں ہو؟“ ہارون کے لہجے میں بے چینی نمایاں تھی۔

”میں ہاسپٹل میں ہی ہوں۔“

”سب خیریت ہے؟“

”ابھی کچھ نہیں کہہ سکتی، سب بہت پریشان ہیں، آپ بھی اس کے لیے دعا کیجیے۔“

”میری زندگی کا کوئی دن ایسا نہیں گیا، جس میں میں نے اس کے لیے دعا نہ کی ہو، اسے میری دعاؤں کی ضرورت نہ بھی ہو، تو بھی مجھ پر فرض ہے کہ میں اس کی خوشیوں اور آسودگی کے لیے دعا مانگوں اور میں دعا کر رہا ہوں کہ اس کے لیے سب اچھا ہو۔“ بوجھل لہجے میں بولتا وہ خاموش ہو گیا تھا۔

”انشاء اللہ آپ کی اور ہم سب کی دعائیں قبول ہوں گی، اسے آپ کی دعاؤں کی بھی ضرورت ہے اور آپ کی بھی، یہ اور بات کہ ابھی وہ آپ کی ضرورت اور اہمیت سے ناواقف اور انجان ہے مگر ایسا ہمیشہ نہیں رہے گا، اطمینان رکھیں۔“ مدہم لہجے میں مینزہ نے اسے تسلی دی تھی۔

☆.....☆

طلوع ہوتے سورج کی رو پہلی سنہری کرنیں اپنے ساتھ انتہائی خوش کن اور دل کو نہال کر دینے والی نوید لے کر کائنات میں انوکھے رنگ بھر گئی تھیں۔ فاطمہ اور صبیحہ کے سجدے طویل ہو گئے تھے، یہ حسین صبح زندگی کو ایک نیا خوبصورت رخ دے گئی تھی، مگر عارش کی جان تو اب تک سولی پر ہی تھی، جسم میں جان واپس آنے کے لیے ضروری تھا کہ وہ خرمن کو قریب سے دیکھ لے، اب انتظار ناقابل برداشت تھا، اس کے سر پر تلواریں اس وقت تک لٹکتی رہی تھی، جب خرمن کو روم میں شفٹ نہ کر دیا گیا۔ رکی سانسوں کے ساتھ وہ بے تابی سے اس کے قریب پہنچا تھا، جوار دگرد سے قائل نظر آ رہی تھی۔ چہرے کے گرد لپٹے سفید دوپٹے میں اس کا چہرہ انتہائی زرد اور ٹھٹھا تھا، اپنے چہرے پر محسوس ہوتے محبت بھرے ہر حدت لمس نے اس کی غفلت کو توڑ دیا تھا، بمشکل اپنی سوچی آنکھوں کو کھولتے ہوئے اس نے خود پر جھکے چہرے کو پہچاننے کی کوشش کی تھی۔

”تم ٹھیک ہو؟“ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں جکڑتا وہ پوچھ رہا تھا۔

”ہا ہا.....؟“ بس اس کے لبوں سے آہ نکلی تھی، اس کی آنکھوں سے پھسلے قطروں نے عارش کا دل جکڑ لیا تھا۔

”وہ بہت خوش ہیں، تم ان کی خوشی کا اندازہ بھی نہیں لگا سکتیں۔“

”پھر بھی وہ نہیں آئے؟“ اس کے لبوں سے سسکی نکلی تھی۔



”وہ آئیں گے، میں لے کر آؤں گا ان کو۔“ اس کے چہرے سے آنسو صاف کرنا وہ بولا تھا۔  
 ”اب نہیں رونا، بالکل نہیں، جانتی ہو، تم نے مجھے کتنا انمول اور خوبصورت تحفہ دیا ہے، میں تو اب اس قابل بھی نہیں رہا ہوں کہ تمہارا شکر یہ ادا کر سکوں۔“ اس کے ہاتھ چومتے ہوئے وہ تشکر آمیز لہجے میں بولا تھا۔  
 ”تم نے اسے دیکھا؟“ خرمن کی آواز بہت کمزور تھی۔

”ہاں، مگر بس کچھ دیر کے لیے وہ بھی دور سے، وہ بہت کمزور ہے، اسے چند گھنٹوں کے لیے انتہائی نگہداشت میں رہنا تھا، میرے علاوہ اسے ابھی تک کسی نے نہیں دیکھا، یہاں بہت ظالم ڈاکٹرز ہیں، مجھے میرے بیٹے کے قریب بھی نہیں جانے دیا ہے۔“ اس کے بے بس لہجے میں شکایت کرنے پر ہلکی سی مسکراہٹ خرمن کے چہرے پر نمودار ہو کر غائب ہوئی تھی، تب ہی دروازے پر ہوتی آہٹ پر وہ سرعت سے خرمن کے پاس سے اٹھا تھا، روم میں داخل ہونے والی نرس تھی، جس نے گلابی لمبل میں اس کی پوری کائنات کو اٹھا رکھا تھا، نرس کے قریب آنے کا انتظار کیے بغیر وہ تیزی سے آگے بڑھا تھا، جبکہ اس کی بے تابی پر نرس نے مسکراتے ہوئے بچے کو خرمن کی طرف لے جانے کے بجائے اس کے ہی ہاتھوں میں منتقل کر دیا تھا۔

”آپ کا بیٹا بہت خوبصورت ہے، اسٹاف کا ہر فرد باری باری اسے ایک نظر دیکھنے آتا رہا ہے۔“ نرس نے مسکراتے ہوئے کہا تھا اور خرمن کی طرف بڑھ گئی تھی، جبکہ عارش کو تو جیسے کچھ سنائی ہی نہیں دیا تھا، پہلی بار اپنے بچے کو ہاتھوں میں لیتے ہی اس کا دل پگھلنے لگا تھا، بے تحاشہ محبتوں کا سمندر سینے میں ٹھانٹھیں مارنے لگا تھا، سانس روکے، بغیر ہلکے جھکے وہ اپنے بچے کے چہرے کو دیکھ رہا تھا، ننھا سادہانہ، نازک نازک سے سرخ و سفید نقوش، چھوٹی سی ناک، ریشمی لائینی لائینی سی پلکیں، اس کا پھول سا چہرہ نور کے ہالے میں قید جگمگا رہا تھا، اس کی پیشانی کے عین وسط میں ہلکا سا دو دھبہ نشان پھیلا پھیلا سا تھا، اس کے معصوم خوابیدہ سانس لیتے وجود نے عارش کو یکدم اتنا جذبہ بانی کر دیا تھا کہ بہت چپکے سے اس کی آنکھ سے ٹپکتا ایک گرم قطرہ بچے کے گلابی رخسار پر گرا تھا، وہ نہیں جانتا تھا کہ اسے کہاں چھپا کر رکھے گا، بے اختیار بچے کے چہرے پر بوسہ لے کر عارش نے سے اپنے سینے سے لگایا تھا، روم سے نرس کے نکلنے ہی وہ خرمن کی طرف آیا تھا اور بچے کو اس کے حوالے کر دیا تھا، عارش کے سامنے اپنے بچے کو گود میں لیتے ہوئے بھی اسے شرم سی محسوس ہو رہی تھی، اس کے زرد چہرے پر گلاب بکھرنے لگے تھے، جھلملاتی نظروں سے بچے کو دیکھتی وہ اس کے روئی کے گالوں جیسے چہرے کو ہی چھو سکتی تھی، اس کے نقاہت سے چور چہرے پر بکھرتی روشنی اور انوکھے رنگوں نے عارش کو مبہوت کر دیا تھا، دل و نظر کو مسحور کر دینے والے اس منظر سے بڑھ کر حسین منظر کوئی اور اس کائنات میں نہیں ہو سکتا تھا۔

”عارش! یہ واقعی کچھ کمزور ہے۔“ خرمن کی آواز نے اسے چونکا دیا تھا۔  
 ”تم خود دیکھو!، مجھ پر تم غصہ کرتی تھیں، مگر میرا بیٹا میرے لیے کس قدر کڑھتا رہا تھا، اندازہ لگاؤ ذرا۔“ عارش کے مسکراتے لہجے پر وہ بھی کھل کر مسکرائی تھی مگر اگلے ہی لمبے دروازے کی طرف متوجہ ہوئی تھی، عارش فوراً ہی قافلہ کے استقبال کے لیے بڑھا تھا، اسے گلے سے لگا کر قافلہ نے مبارکباد دی تھی اور پھر خرمن کی طرف بڑھ گئی تھیں، جبکہ عارش عروسہ کی طرف متوجہ ہو گیا تھا، جو اپنے بچوں کے ساتھ وہاں آ پہنچی تھیں۔ صبیحہ اور منیزہ کو وہاں نہ پا کر وہ باہر آیا تھا، وہ دونوں اسے کاریڈور میں نظر آئی تھیں۔  
 ”عارش! آئی جانا چاہتی ہیں۔“ منیزہ کی اطلاع پر اس نے دنگ ہو کر صبیحہ کو دیکھا تھا۔



”میں جانتی ہوں، تمہیں ابھی میرا جانا اچھا نہیں لگے گا، مگر میرا یہاں سے جانا ہی بہتر ہے، ہارون مجھے لینے آچکا ہے۔“

”مگر میں آپ کو اس طرح نہیں جانے دوں گا، آپ اسے دیکھے بغیر کیسے جاسکتی ہیں، آپ میرے ساتھ چلیں۔“ وہ قطعی لہجے میں بولا تھا۔

”عارش! آج اللہ نے تمہیں بہت بڑی خوشی سے نوازا ہے اور میں خوشی کے اس ماحول کو بگاڑنا نہیں چاہتی، تم جانتے ہو خرمن.....“

”میں کچھ نہیں جانتا، میرے بیٹے کو دیکھنے کے لیے آپ کو خرمن کی اجازت کی ضرورت نہیں۔“ عارش نے فوراً ان کی بات کاٹی تھی۔ ”میں اسے یہیں لے آتا ہوں۔، اگر آپ اسے دیکھے بغیر یہاں سے گئیں تو آپ سے ناراض ہو جاؤں گا۔“

”خدمت کرو عارش!، میں بچے کو ضرور دیکھوں گی، مگر خرمن کی بے خبری میں اس کی رضا کے بغیر نہیں، میں جانتی ہوں تم مجھ سے ناراض نہیں ہو سکتے، سمجھ سکتے ہو میری بات کو اس لیے ابھی مجھے جانے دو، میں بہت خوش ہوں، اتنی بڑی خوشی ساتھ لے کر یہاں سے جا رہی ہوں، کیا یہ کافی نہیں ہے فی الوقت؟“ مسکرانے کی کوشش کرتیں وہ بولی تھیں۔

”میرے لیے یہ کافی نہیں ہے۔“ شکایتی نظروں سے عارش نے ان کو دیکھا تھا جو نظر چرا گئی تھیں۔

”چلیں پھر میں آپ کو ہارون کے پاس لے چلتا ہوں۔“ بالآخر عارش کو ہتھیار ڈالنے پڑے تھے، مگر وہ ان کے چہرے سے ہی اندازہ لگا سکتا تھا کہ ان کے دل پر کیا گزر رہی ہوگی، اتنی اذیت اور تڑپ کے طویل سفر کے بعد ان کی گمشدہ خوشیاں سو دسمت ان کو مل رہی تھیں، مگر طویل سفر سے زیادہ کھن تھا یہ وقت کہ وہ ان خوشیوں کو ہاتھ بڑھا کر چھو بھی نہیں سکتی تھیں۔

میزہ خاموشی سے صبیحہ کو عارش کے ہمراہ جاتے دیکھتی رہی تھی، اس کے نزدیک صبیحہ کا فیصلہ بالکل درست تھا، وہ جانتی تھی خرمن کے مزاج کو، اس کا کوئی بھروسہ نہیں تھا، اگر خرمن کی طرف سے ان کو مزید کوئی تکلیف پہنچتی تو اس کی تلانی عارش بھی کرنے کی پوزیشن میں اس وقت نہیں تھا۔

☆.....☆

برآمدے میں رکے وہ بغور اسے دیکھ رہے تھے، جو قاطمہ کو ہاسپٹل سے لے کر گھر آیا تھا، اس کے بے حد سنجیدہ چہرے سے احمد حسین کو اندازہ لگانا دشوار نہیں تھا کہ وہ ان کی طرف سے کتنا دلگرفتہ ہے۔

”مامی! آپ کو جو چیزیں لیتی ہیں، وہ لے آئیں، عروسہ آئی خرمن کو ہاسپٹل سے گھر لے جائیں گی، میں آپ کو ڈائریکٹ گھر ہی لے جاؤں گا۔“ احمد حسین کو صرف سلام کر کے وہ اسی سنجیدگی سے قاطمہ سے مخاطب ہوا تھا، جو تذبذب میں مبتلا احمد حسین کو ہی دیکھ رہی تھیں۔

”خدا کا شکر ہے کہ وہ خیریت و عافیت کے ساتھ آج گھر جا رہی ہے، میں نے میزہ سے کہہ دیا ہے کہ وہ خرمن کے گھر پر رکے گی، اس کے لیے اب قاطمہ کا جانا ضروری نہیں ہے۔“ اس کی جانب دیکھے بغیر احمد حسین بولے تھے۔

”مگر میں چاہتا ہوں کہ مامی اس کے قریب رہیں، اسے آپ کی اور مامی کی ضرورت ہے، وہ مامی سے الگ ہونے کے لیے تیار نہیں، آپ کم از کم مامی کو تونہ روکیں۔“ وہ شدید تاسف سے بولا تھا۔



”اس سے کہو کہ اس کی ایک ماں نہیں ہے، جب تک وہ اپنی دونوں ماؤں کو ایک درجہ نہیں دے گی، ان کی ضرورت کا اسے احساس نہیں ہوگا، وہ ایک سے بھی محروم رہے گی، جب تک فاطمہ کا اس کے قریب رہنا ضروری تھا، میں خاموش رہا، مگر اب تم فاطمہ کو گھر لے جانے کی بات مت کرو، سب جانتے ہو تم، بے خبر نہیں ہو۔“ دل پر پتھر رکھ کر ان کو یہ کہنا پڑا تھا۔

”میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ آپ سب کے فیصلوں اور تکرار میں میری حق تلفی ہو رہی ہے، کیا قصور ہے اس بچے کا جو پس رہا ہے سرد جنگ میں؟ آپ میرے لیے بھی اسے ایک نظر دیکھنے تک نہیں آئے، وہ میری بھی اولاد ہے، مگر آپ میری خاطر چند لمحوں کے لیے بھی اپنے فیصلے میں نرمی نہیں لاسکے۔“ بالآخر آج عارش کا ضبط ختم ہوا تھا جو وہ پھٹ پڑا تھا۔ ”میری بیوی زندگی اور موت کے درمیان سے گزری ہے، اگر اسے یا میرے بچے کو کچھ ہو جاتا تب بھی آپ خود پر پہرے لگائے رکھتے، چہرہ تک نہیں دیکھتے ان دونوں کا؟“

”ایسا مت، کہو عارش! ایسی باتیں زبان پر بھی نہیں لاتے۔“ فاطمہ نے دہل کر اسے ٹوکا تھا۔

”میں اور کیا کروں ماما! پریشان ہو چکا ہوں میں ان حالات سے، میں خوش بھی نہیں ہو پا رہا، کتنا بد قسمت ہے وہ بچہ کہ کوئی اس کا چہرہ تک دیکھنے کا روادار نہیں ہے، اس کے لیے بھی اصول نہیں توڑے جا سکتے۔“ سرخ چہرے کے ساتھ بولتا وہ رکنا نہیں تھا۔

”عارش! رک جاؤ۔“ فاطمہ تڑپ ہی تو اٹھی تھیں، مگر وہ ان کی پکار پر بھی نہیں رکنا تھا۔

”وہ ٹھیک ہی تو کہہ گیا ہے، وہ کب تک یہ سب برداشت کرے گا، بچے کو ایک نظر بھی آپ دیکھنے نہیں گئے، حالانکہ عارش خود آپ کو لے جانے یہاں آیا تھا، آپ کے انکار نے کتنا دکھ پہنچایا ہے اسے اور اب اس کے سامنے مجھے بھی روک کر حد کر دی ہے آپ نے۔“ شکایتی لہجے میں بولتے ہوئے فاطمہ آبدیدہ ہو گئی تھیں۔

”میں سب جانتا ہوں، میں یہ بھی جانتا ہوں کہ میں نے کس طرح خود پر جبر کیا ہوا ہے، اگر اس وقت میں کمزور پڑ گیا تو میری ساری کوششیں بے ثمر رہیں گی، کیا چہرہ دکھاؤں گا میں ان دو انسانوں کو جن کی کڑی آزمائشوں کے سامنے عارش کا دکھ، میرا صبر اور تمہاری تڑپ کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔“ احمد حسین بچھے لہجے میں بولے تھے۔

”میں جانتی ہوں کہ آپ یہ سب کس کے لیے کر رہے ہیں، مگر میں اب خرمین سے اس کے بچے سے اور عارش سے لا تعلق ہو کر نہیں رہ سکتی۔“ فاطمہ کی بھرائی آواز پر احمد حسین نے ان کو دیکھا تھا اور پھر تھکے تھکے انداز میں تخت کے کنارے بیٹھ گئے تھے۔

”فاطمہ! تم نے زندگی کے ہر کٹھن دور میں میرا ساتھ دیا ہے، اب اگر اپنی اولاد کی وجہ سے تم یہ کام نہیں کر سکتیں تو مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں ہوگی، تم جانا چاہتی ہو تو چلی جاؤ، میں زبردستی تمہیں نہیں روک سکتا۔“

”اب اگر میں جاؤں گی تو آپ کے ساتھ ہی جاؤں گی، ورنہ کس طرح عارش کا سامنا کروں گی؟“

فاطمہ بولی تھیں اور پھر فوراً کمرے کی جانب بڑھ گئی تھی۔

☆.....☆

گیٹ کھول کر ایک طرف ہٹتے ہوئے اس نے عثمان کو اندر آنے کا راستہ دیا تھا۔

”اچھا ہوا تم آگئے، عارش کا موڈ ابھی تک خراب ہے، وہ زبردستی منیزہ کو اس کے گھر لے جا رہا ہے،



جبکہ وہ خرمن کے پاس رکنے پر مصر ہے۔“ بیلا نے بجلت میں اسے اطلاع دی تھی۔ حیران ہوتا وہ لاؤنج میں آیا تھا، جہاں میزہ شدید ناراضی سے عارش کو گھور رہی تھی۔

”عارش! یہ کیا سن رہا ہوں میں، تم زبردستی پر اتر آئے ہو، وڈیرے کے بیٹے ہو رہے ہو بالکل۔“ غیر سنجیدگی سے عثمان نے اسے گھر کا تھا۔

”میں تم سے کہہ چکا ہوں، تم یہاں نہیں رکو گی، تم کسی کے حکم کی پابند نہیں ہو۔“ عثمان کی بات نظر انداز کیے وہ بہت سنجیدگی سے میزہ سے مخاطب تھا۔

”عارش! وہ اپنی مرضی سے یہاں رکنا چاہتی ہے، تم کیوں اسے یہاں سے بھیجنے پر بضد ہو؟“ بیلا نے ناراضی سے کہا تھا۔

”اس کی جان اپنے بھائی کی بچی میں اٹکی ہے، مگر یہ پھر بھی یہاں رکنے پر بضد ہے، کیا میں جانتا نہیں ہوں اس کی وجہ؟“ عارش بگڑتے تاثرات کے ساتھ بولا تھا۔

”تم چچا جان کا غصہ مجھ پر مت اتارو، میں خود یہاں تمہارے بیٹے کے لالچ میں رک رہی ہوں، تمہاری بیوی کو بچے سنبھالنے ہی کہاں آتے ہیں، وہ میرے بغیر کیسے رہے گا؟“ میزہ تنک کر بولی تھی جبکہ عثمان کا قبہ بے ساختہ تھا۔

”بول تو اس طرح رہی ہو جیسے درجن بھر بچوں کی پرورش کرنے کا تجربہ تمہارے پاس ہے۔“ عثمان نے کہا تھا۔

”تم سیدھی طرح میرے ساتھ چل رہی ہو یا نہیں؟“ عارش زچ ہوا تھا۔

”میں نہیں جاؤں گی، شرم نہیں آتی تمہیں، مجھے اپنے گھر سے نکال رہے ہو۔“

”تم ایسے نہیں مانو گی۔“ عارش اس کی جانب بڑھا تھا۔

”میں خرمن کو جگا کر تمہاری شکایت کر دوں گی عارش!“ اسے دھمکاتے ہوئے وہ چیختی تھی، مگر عارش اس کا ہاتھ پکڑ چکا تھا۔

”کھڑے کھڑے انجوائے کر رہے ہو، روکو اسے۔“ اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرتی وہ عثمان پر چیختی تھی۔

”میں کیوں روکوں، میں تو چاہتا ہوں، ہارون یہ منظر دیکھیں اور انگاروں پر غلاٹیاں کھائیں۔“ عثمان اطمینان سے بولا تھا۔

”بتاؤں ابھی تمہیں، سگی۔“ میزہ پھر چیختی تھی۔

”خواہ مخواہ چیننا مت مجھ پر، چیخنے کا حق چاہے تو پہلے اپنے حملہ حقوق میرے نام ٹرانسفر کرو۔“ وہ بگڑا تھا۔

”عثمان ا“ بیلا نے پھاڑ کھانے والی نظروں سے اس کے مسکراتے چہرے کو گھورا تھا۔

”کیوں میرا بیج خراب کر رہی ہو، خاموشی سے چلو، کل خود تمہیں یہاں لے آؤں گا۔“ میزہ کی ڈھٹائی پر عارش نے اسے گھر کا تھا۔

”میں نہیں جاؤں گی، نہیں جاؤں گی، مجھے چھوڑ دو ورنہ تمہارے ہاتھ پر کاٹ لوں گی۔“ میزہ کی وارننگ پر بیلا اپنی ہنسی نہیں روک سکی تھی۔

”اس کا میٹر گھوما ہوا ہے، دھمکیاں دینے کے بجائے پیار سے راضی کر لو آئی لو یو کہہ کر۔“ عثمان نے



”مائی! اس وقت مذاق نہیں۔“ عارش نے تنبیہی نظروں سے اسے دیکھا تھا۔ ”یہ یہاں نہیں رکے گی

کیونکہ.....“

”ٹھیک ہے، اب میں بھی سنجیدگی سے کہہ رہی ہوں کہ تمہاری منت سماجت کے باوجود میں یہاں نہیں آؤں گی۔“ عارش کی سنجیدگی نے میزہ کے تیور بگاڑے تھے۔

”کہہ تو رہا ہوں کل آ جانا۔“

”تم جب چاہو گے مجھے اپنے گھر بلاؤ گے، جب چاہو گے نکال دو گے، اندھیر مچا کر رکھی ہوئی ہے، اپنے مسئلوں میں مجھے کیوں گھسیٹ رہے ہو، جہنم میں جاؤ۔“ غصیلے لہجے میں وہ اپنا بیگ اٹھاتی عارش سے پہلے ہی آگے بڑھ گئی تھی۔

”کل میں تمہیں پک کرنے پہنچ جاؤں گا، ہارون کے ساتھ۔“ عثمان نے پیچھے سے میزہ کو آواز لگائی تھی۔

”تمہاری ان ہی حرکتوں کی وجہ سے آج تک کسی لڑکی نے تم سے آئی لو یو نہیں کہا۔“ عثمان نے اسے لٹاڑا تھا جو ناگوار نظروں سے اسے دیکھتا میزہ کے پیچھے جا رہا تھا۔

”عارش کو سمجھانے کے بجائے تم اپنی ہی ہانکتے رہے، کیا سوچ رہی ہو گی میزہ۔“ پیلانا کواری سے بولی تھی۔

”ابھی تو وہ غصے میں کھول رہی ہو گی۔“

وہ ڈھٹائی سے ہنستا صوفے پر براجمان ہوا تھا۔

”جا کر استانی کو بتاؤ میں اس کے دیدار کے لیے آیا ہوں، اور عارش کے جانشین کو بھی اٹھالاؤ، میں نے اسے ٹھیک سے دیکھا بھی نہیں ہے۔“

”تمہارے پاس تو مجھے بھی دیکھنے کا وقت نہیں۔“ پیلانے نے رک ک اسے بتایا تھا۔

”میں اس وقت بھی تمہیں دیکھ سکتا ہوں اگر تم آنکھیں بند کر کے مراقبے میں نہ جانے کا وعدہ کرو۔“ عثمان کی حسمکین نظروں پر وہ بمشکل ہنسی روکتی بیڈروم کی سمت بڑھ گئی تھی۔

☆.....☆

بغیر کسی آہٹ کے احتیاط سے کمرے میں داخل ہوتا وہ چونکا تھا، کیونکہ خرمن بیڈ پر نہیں تھی۔ تب ہی وہ ٹاؤل سے بھیجا چہرہ صاف کرتی واش روم سے باہر آتی دکھائی دی تھی۔

”عثمان اور پیلانا جا چکے ہیں کیا؟“ اس سے نظر ملانے بغیر وہ پوچھ رہی تھی۔

”ہاں کافی رات جو ہو چکی ہے، مجھے یہی لگا کہ تم سو رہی ہو گی۔“ بخور اسے دیکھتا وہ اس کے قریب آنے کا منتظر تھا، اس کی بے تحاشیہ متورم سرخ آنکھوں نے عارش کو حیران نہیں کیا تھا۔

”میں بہت دیر سے سو رہی تھی پھر کچھ دیر پہلے اچانک آنکھ کھل گئی۔“ لہجے کو سرسری رکھتے ہوئے اس نے چونک کر نگاہ اٹھائی، مگر زیادہ دیر تک عارش کی گہری سنجیدہ نظروں میں نہیں دیکھ سکی تھی، اس کی پیشانی پر چپکے نم ہال سمیٹتے ہوئے عارش نے دھیرے سے اس کا چہرہ اوپر اٹھایا تھا۔

”اس طرح بات بنا کر تم دوسروں کی آنکھوں پر بردہ ڈال سکتی ہو، مگر میں یہ دیکھ سکتا ہوں کہ کسبل میں چہرہ چھپا کر تم سو نہیں رہی تھیں۔“ اس کی آنکھوں میں چھپکتی نمی دیکھتا وہ بولا تھا۔ ”کیوں رورو کر خود پر ظلم کرتی



"وہ یہ تک دیکھنے نہیں آئے کہ میں زندہ بھی ہوں یا نہیں۔" اس کے لرزتے لہجے پر عارش نے اس کے چہرے پر بکھرتی اذیت کو دیکھا تھا اور پھر گہری سانس لیتے ہوئے اسے اپنے قریب کیا تھا۔

"وہ میرا چہرہ بھی نہ دیکھتے، مگر میرے بچے کو تو اپنے سائے سے محروم نہ رکھتے۔" اس کی آنکھوں سے کئی آنسو گھسلتے عارش کے گریبان میں جذب ہوئے تھے۔

"تم بھی تو ان کے لیے خود پر جبر کرتی رہی ہو، یہ یاد رکھو کہ اگر تم ان کی بیٹی ہو تو وہ تمہارے باپ ہیں۔"

عارش کے سنجیدہ لہجے پر اس نے تیزی سے سر اٹھایا تھا۔

"کیا کہنا چاہتے ہو تم؟"

"کچھ نہیں۔" عارش نے اسے شانوں سے تھاما تھا۔ "بس اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ تم تنہا نہیں ہو، میں تمہارے ساتھ ہوں، لہذا ایسی ممکن صورت بنائے رکھ کر مجھے اس خوشی کو محسوس کرنے سے نہ روکو جو تمہاری وجہ سے مجھے ملی ہے۔" اس کی آنکھوں میں دیکھتا وہ دھیرے سے مسکرایا تھا اور پھر اس کا ہاتھ تھام کر بیڈ تک لے گیا تھا، خاموشی سے وہ بیڈ کے کنارے بیٹھ گئی تھی، جبکہ عارش کاٹ کی سمت بڑھ گیا تھا اور احتیاط سے بچے کو کاٹ میں سے اٹھا کر واپس خرمین کی طرف آ گیا تھا۔ بچے کے خوابیدہ معصوم چہرے کو دیکھتے ہوئے عارش کے چہرے پر روشن مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔

"یہ اتنا پیارا ہے کہ میری نظریں اس پر سے نہیں ہٹتیں، تم اس کی نظر اتارتی رہا کرو، ویسے بھی جھاڑ پھونک میں تم ماہر ہو۔" اس کے کہنے پر وہ بس مسکراتے ہوئے اسے دیکھتی رہی تھی، جو بچے کے نرم گرم رخساروں کو چوم رہا تھا۔

"یہ آنکھیں کیوں نہیں کھولتا ہے، میں ترس رہا ہوں اس کی آنکھوں کا رنگ دیکھنے کے لیے۔"

"ابھی یہ تین دن کا ہی تو ہے، اسے ابھی روشنی کی عادت نہیں ہوئی ہے۔" خرمین نے اس کی الجھن دور کی تھی۔ "یہ اس وقت سو نہیں رہا مگر آنکھیں کھولنے سے ڈر رہا ہے، تم اس کی آنکھوں کو روشنی سے بچاؤ پھر یہ آنکھیں کھول سکے گا۔"

"واقعی؟" عارش نے کچھ حیرت سے کہتے ہوئے اپنے ہاتھ کی چوڑی ہتھیلی کو بچے کی آنکھوں کے اوپر اس طرح لگایا کہ روشنی ان تک نہ پہنچ سکے، چند لمحوں میں ہی بچے کی بند آنکھوں میں حرکت ہوئی تھی، عارش کا دل خوشی سے چھپا اٹھا تھا جب بچے نے پلکیں جھپکاتے ہوئے اسے اپنی آنکھوں کا دیدار کروا دیا تھا۔

"خرمین! اس کی آنکھیں تو بالکل تمہاری طرح ہیں۔" نہال ہو کر عارش نے بچے کی آنکھوں کو چوم لیا تھا۔

"مگر سب تو کہہ رہے ہیں یہ بالکل تمہاری طرح ہے اور عثمان تو شکر ادا کر رہا تھا کہ یہ مجھ پر نہیں تم پر گیا ہے۔" وہ دم مسکراہٹ کے ساتھ بتا رہی تھی۔

"یہ تم پر جائے یا مجھ پر کوئی فرق نہیں پڑتا، یہ ہے ہماری اولاد۔"

"جہیں بیٹی چاہے تھی۔" خرمین نے یاد دلایا تھا۔

"ہاں، یہ تو ہے، مگر کوئی بات نہیں میں اس کے لیے کچھ انتظار تو کر ہی سکتا ہوں۔" اس کی مسکراتی معنی خیز نظروں پر وہ کچھ جھینپ سی گئی تھی۔



”پتہ ہے میں جب جب اس کے رونے کی آواز سنتا ہوں، میرا خون سیروں بڑھتا ہے اور جب میں اسے تمہاری گود میں دیکھتا ہوں تو لگتا ہے سب کچھ مکمل ہے، کہیں کوئی کمی نہیں ہے، اپنے بیٹے کو دیکھنے کے بعد میرے دل میں اپنے ماں باپ کے لیے محبت مزید بڑھ گئی ہے، وہ بھی تو میرے لیے اپنے دل میں وہی محبت اور احساسات رکھتے ہوں گے جو کہ میرے دل میں اپنے بچے کے لیے ہیں۔“ وہ عجیب سی کیفیت میں بول رہا تھا جبکہ خرمین بس خاموشی سے اس کے چہرے پر پھیلنے والوں کو دیکھتی رہی تھی۔ ”وہ بھی میری طرح اپنی اولاد کے لیے بہت حساس ہوں گے، وہ بھی مجھ سے جدا ہونا نہیں چاہتے ہوں گے، مگر پھر بھی اللہ کی رضا میں راضی ہو کر وہ دونوں مجھ سے جدا ہو گئے، میری نظر میں تم بہت قابل رشک ہو خرمین! تمہارے پاس ایسے والدین ہیں جن سے تمہارا تعلق زندگی اور سانس جیسا ہے اور وہ ماں باپ بھی اب تمہاری زندگی میں ہیں، جن سے تمہارا تعلق روح اور جسم کا سا ہے، انسان ترستا ہے ان عظیم رشتوں کے لیے مگر اللہ تم پر بہت مہربان ہے۔“ گہرے لہجے میں بولتا وہ بغور اس کے تنے تاثرات کو دیکھ رہا تھا۔

”بات کا رخ اس جانب نہ لے جاؤ جہاں میں نظر بھی نہیں ڈالنا چاہتی۔“ وہ سرد لہجے میں بولی تھی۔ ”تم ہمہ وقت ان سب کی دعاؤں کے حصار میں رہ رہی ہو، ان کو اور اذیت میں مت ڈالو، مت تڑپاؤ ان کو، مجھے خدشہ ہے کہ ان کے دل سے نکلی آہ آسمان تک پہنچ گئی تو.....“

”ان سے پہلے میری آپہنچ آسمان تک پہنچتی رہی ہیں، کسی کا کیا گیا میری تو اب بھی میں ہی ہوں۔ محروم تو آج بھی مجھے ہی کیا گیا ہے، اللہ کی ناراضی کا خدشہ کسی اور کے دل میں کیوں بیدار نہیں ہوا۔“ وہ یکدم ہتھے سے اکڑی تھی۔

”تمہارا بس ایک عمل تمام محرومیوں کو ختم کر سکتا ہے خرمین! اور ان محرومیوں کو بھی جو تمہارے بیٹے کے حصے میں بھی آرہی ہیں۔“ بالآخر وہ یہ کہہ گیا تھا۔

”اگر تمہیں لگتا ہے کہ میری وجہ سے تمہاری اولاد محروم ہو رہی ہے، میری وجہ سے اللہ کا قہر تمہارے گھر پر نازل ہو سکتا ہے تو نکال دو مجھے اپنی زندگی سے، ختم کر دو مجھ سے ہر تعلق۔“ اس کے پھرے لہجے پر وہ ساکت نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔

”جن سے توقع نہیں تھی جب وہ مجھے چھوڑ سکتے ہیں تو تم سے کیا توقع رکھ سکتی ہوں۔“

”بالکل ٹھیک کہا تم نے، میں وہ انسان ہی نہیں جس سے تم توقعات وابستہ رکھ سکو، تمہیں مجھ سے یہ توقع نہیں کہ میں ساری زندگی تمہارا وقادار بن کر رہوں، تمہیں مجھ سے یہ توقع بھی نہیں کہ دنیا ایک طرف ہو جائے مگر میں تمہارا ساتھ دیتا رہوں گا، تمہیں تو یہ توقع بھی نہیں کہ کبھی تمہارے دل میں میری محبت اور ضرورت گھر کر سکتی ہے، یہ سب تم مجھے پہلے ہی بتا چکی ہو، بار بار میری گردن پر کند چھری مت پھیرا کرو۔“

سرد لہجے میں بول کر اس نے بچے کو خرمین کے قریب لٹایا تھا اور خود کسی بھی جانب دیکھے بغیر کمرے سے نکل گیا تھا۔ دوسری جانب خرمین ناگواری سے سر جھٹکتی بچے کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔

☆.....☆

رسٹ وایچ میں وقت دیکھا ہو بیزاری سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

”بیلا اور کتنا وقت لگے گا، ایک گھنٹے سے تیار بیٹھا ہوں، مگر تمہاری تپاریاں مکمل نہیں ہو رہیں۔“

کمرے کی سمت آواز اس نے لگائی تھی مگر جواب ندارد، بیزاری سے وہ دوبارہ لی وی اسکرین کی طرف متوجہ



ہوا تھا، جہاں ہیڈ لائنز چل رہی تھیں، آج اسے بیلا کے ہمراہ اپنے کزن کی شادی میں شرکت کرنی تھی، اپنی مصروفیات کے پیش نظر وہ دیگر تقریبات میں شرکت نہ کر سکا تھا، مگر ویسے کی اہم تقریب تھی اس میں تو بہر حال اس نے جانا ہی تھا، بہت آہستہ آہستہ ہی کہی مگر اپنے چند قریبی ریلیٹوز سے اس کے تعلقات پہلے جیسے ہو گئے تھے۔ پہلے ظاہر ہے کہ عثمان کی طرف سے نہیں ہوئی تھی، اس کے خاندان کا کوئی فرد گھر آتا تو بیلا بہت خوش اخلاقی اور گرمجوشی سے استقبال کرتی تھی، لہذا عثمان کے رشتہ داروں کو اس کی غیر موجودگی اور مصروفیات کی وجہ سے کوئی شکایت نہیں ہوتی تھی، آج کے لیے بیلا نے پہلے ہی سے اسے ہدایت دے دی تھی کہ آج کے دن وہ کوئی مصروفیت نہ رکھے، شادی میں اسے لازمی جانا ہے، کیونکہ اس کے جس کزن کا ولیمہ تھا، وہ عثمان کا نہ صرف اچھا دوست تھا بلکہ وہ انوشیشن لے کر خود عثمان کی موجودگی میں گھر آیا تھا۔

ایک ہاتھ میں سینڈلز اور دوسرے ہاتھ میں جیولری ہاگس پکڑے وہ کمرے سے نکلی تھی، مگر پھر دیوار گیر آئینے کے سامنے رک کر اپنے میک اپ اور لباس کا جائزہ لینے لگی تھی۔

”اس آئینے کو اکھاڑ کر ساتھ لے چلو۔“ عثمان کی جھلائی آواز پر وہ ہڑبڑاتی ہوئی حیرتی سے اس کی طرف آئی تھی اور سینڈلز اسے تھما کر خود ٹیبل کے کنارے بیٹھ گئی تھی۔

”ان کا کیا کروں، اپنے سر پر ہارلوں؟“ وہ مزید جھلایا تھا۔

”یہ کام کسی دن میں خود کر دوں گی، ابھی یہ پہنا دو، پہلے ہی اتنی دیر ہو چکی ہے۔“ اس کی عجلت بھری ہدایت پر وہ کوفت سے اسے دیکھتا ہنچوں کے بل بیٹھا تھا اور سینڈلز پہنانے شروع کر دیے تھے۔

”ذرا پیار سے پہنا دو، ابھی میری جگہ تمہاری کوئی پرستار ہوئی تو یہ کام کرتے ہوئے چہرہ کھلا پڑ رہا ہوتا تمہارا۔“ کالوں میں آویڑے پہنتے ہوئے بیلا نے اسے لتاڑا تھا۔

”اب میں سینڈل کو چوم کر تو پہنانے سے رہا، مجھے کیا معلوم تھا، شوہر بننے کا یہ خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔“ ہاتھ جھاڑتا وہ ہنسی سے اٹھا تھا۔

”زیادہ مت بولو، باہر کی دنیا میں تم جتنی بھی شہرت اور نام کمالو، گھر میں تم شوہر ہی ہو اور تمہیں شوہر بن کر ہی رہنا پڑے گا، اب پچھتانے سے کچھ حاصل نہیں ہونے والا، سمجھے۔“ بیلا کے جتانے والے انداز پر اسے زیادہ حیران ہونے کا موقع نہیں ملا تھا، کیونکہ سیل فون چیخ اٹھا تھا۔

”جب تک ہم واپس نہیں آجائیں گے استانی کو چین نہیں ملنے والا۔“ خشمکین لہجے میں بولتے ہوئے اس نے خرمن کی کال ریسیو کی تھی، جبکہ بیلا مسکراتے ہوئے اپنا دوپٹہ سیٹ کرنے لگی تھی۔

”تم دونوں ابھی تک گھر سے نکلے بھی نہیں اتنا وقت لگا کر جاؤ گے تو آؤ گے کب؟“ خرمن نے گھر کا تھا۔

”اگر ایسا ہوا تو تمہاری بیسٹ فرینڈ کی وجہ سے ہوگا۔“ عثمان نے قریب ہی موجود بیلا کے بال منگھی میں جکڑے تھے جبکہ وہ صدمے سے چیختی تھی۔

”کیا ہوا ہے بیلا کو؟“ خرمن نے دہل کر پوچھا تھا۔

”کیا ہوا ہے بھئی، کیوں چیخ رہی ہو؟“ مسکراتی نظروں سے عثمان نے اسے دیکھا تھا جو اس کا ہاتھ جھکتی بال ٹھیک کرنے آئینے کی جانب دوڑی تھی۔

”میں آخری بار کہہ رہی ہوں عثمان! زیادہ رات تک وہاں نہ رکنا، مجھے تم سے زیادہ بیلا کی فکر ہے۔“

”بیلا اپنے سرتھ ایک ہاڈی گارڈ لے جا رہی ہے، تم اس کی امی نہ بنو۔“



”اس کی نہ سہی، تمہاری تو روحانی ماں ہو، ویسے بھی تمہاری والدہ محترمہ تمہاری بائیں میرے ہاتھوں میں دے چکی ہیں۔“

”ہاں جانتا ہوں، ایک تم ہو اور تمہارا شوہر ہے، تم دونوں کی وجہ سے میں آزادی کے ساتھ اپنی بیوی کو باہر تک نہیں لے جا سکتا۔“ وہ جل کر بولا تھا۔

”جاؤ پھر آزادی کے ساتھ، دوبارہ تمہارے ساتھ بیلا کی تصویریں چھپیں تو اس کے بھائی کے ہاتھوں تمہارے قتل کی تصویر بھی اخباروں میں چھپ جائی گی یاد رکھنا۔“

”کبھی اچھی بات منہ سے نہ نکالنا، ہمیشہ کنویں میں دھکیلنے والے کام کرنا۔“ عثمان نے مزید جل کر کہا تھا جبکہ وہ بے ساختہ ہنسی تھی۔

”میرا چھوٹو کیا کر رہا ہے؟“

”وہ ٹھیک ہے میری نیندیں اڑا کر۔“ وہ بولی تھی۔

”اس سے کہو اپنے باپ کی نیندیں اڑائے، ویسے ہیں کہاں حضرت؟“

”اے انٹیلیٹیوٹ سے میزہ کی طرف جانا تھا، وہیں گیا ہوا ہے اسے منانے۔“

”ابھی تک عارش سے ناراضی چل رہی ہے اس کی مجھے اجازت دے دو، دو منٹ میں ہنستی مسکراتی تمہارے گھر آ جائے گی۔“

”اسی لیے اجازت نہیں دے رہی۔“ خرمین کے خشمگین لہجے پر وہ ہنسا تھا۔

”اچھا سنو! تقریب میں ظاہر ہے کہ عروسہ آپنی اور فاروق بھائی بھی ہوں گے، تم کوشش کرنا کہ بیلا کسی طرح عروسہ آپنی کے پاس جا کر سلام دعا کر لے۔“

”ہاں، میں بھی یہی سوچ رہا تھا، مگر میں صرف کوشش ہی کر سکتا ہوں، بیلا کو ان کے پاس جانے کے لیے مجبور نہیں کر سکتا۔“ آئینے کے سامنے کھڑی بیلا کو دیکھتا ہوا بولا تھا۔

یہ اتفاق ہی تھا کہ ان دونوں کانگریڈیشن پر ہی عروسہ اور فاروق سے ہو گیا تھا، بیلا نے دوبارہ ان دونوں کی جانب نگاہ نہیں ڈالی تھی، چہرے کے بدلے تاثرات کے ساتھ وہ عثمان سے پہلے ہی آگے بڑھ گئی تھی کہ فاروق کی کڑی نظروں نے اس کے خون کو رگوں میں کھولا دیا تھا، دوسری جانب عروسہ کو دیکھنے کے

بعد عثمان کے لیے ناممکن تھا کہ ان کو نظر انداز کر سکتا، اپنے شوہر کی موجودگی میں وہ اک نگاہ بھی اس پر بیلا پر نہیں ڈالیں گی، عثمان کو اندازہ ہو گیا تھا اور یہی چیز غم سے زیادہ اسے غصے میں مبتلا کر رہی تھی۔ ارد گرد پھیلی

رونقوں، چہل پہل اور کزنز کے درمیان مصروف ہونے کے باوجود عروسہ اس کی نظروں میں تھیں، زیادہ دیر تک وہ اپنے دل و دماغ میں ابھرتی خواہش کو رد نہیں کر سکا تھا، لہذا ایک فیصلہ کرنا وہ بیلا کی جانب بڑھ گیا تھا۔

”میں چاہتا ہوں تم ان کے پاس جاؤ، میری خاطر، اتنے لوگوں کی موجودگی میں وہ زیادہ ناراضی کا اظہار نہیں کر پائیں گی۔“ اس کے سنجیدہ لہجے پر بیلا نے دنگ نظروں سے اسے یوں دیکھا جیسے اس کی دماغی

حالت پر شبہ ہوا ہو۔

”مجھے ان کے پاس جا کر مزید ذلت نہیں اٹھانی، اتنے لوگوں میں ان کے شوہر بھی ہیں، تم یہ بھول سکتے ہو مگر ان کو یہ یاد ہوگا، تم کیا چاہتے ہو یہ مجھے مت بتاؤ، میں ان کے قدموں میں بیٹھنے کے لیے یہاں تک

نہیں آئی۔“ غصیلے لہجے میں بیلا نے کہا تھا۔



www.Paksociety.com  
”ٹھیک ہے پھر میں ہی ان کے پاس چلا جاتا ہوں۔“  
”عثمان! اگر تم اس عورت کے پاس گئے تو میں تمہیں بخشوں گی نہیں۔“

”وہ عورت میری بہن ہے۔“ وہ اس پر غرایا تھا۔

”اگر مجھے ذرا بھی خبر ہوتی کہ تم یہاں ان کو دیکھ کر ہی پاگل ہو جاؤ گے تو میں یہاں تماشا بننے کے لیے نہیں آتی۔“ اس کے تیور دیکھتے ہوئے بیلا کو اپنا غصہ ضبط کرنا پڑا تھا، مگر وہ مزید اس کی کوئی بات سنے بغیر اس جانب بڑھ گیا تھا، جہاں عروسہ اسے دکھائی دے رہی تھی، فاروق کہاں تھے، اس نے نہ دیکھنے کی کوشش کی تھی نہ ہی اسے ان کی پرواہ تھی۔

وہ اچانک ہی ان کے سامنے آتا اس طرح راستہ روک گیا تھا کہ عروسہ فوری طور پر کسی رد عمل کا اظہار نہیں کر سکی تھیں، مگر اگلے ہی پل ان کے چہرے کا رنگ بدلنے لگا تھا، کچھ ہی قاصلے پر ان کو فاروق دکھائی دے رہے تھے جو اسی جانب متوجہ تھے۔ وہ کترا کر کھل جانا چاہتی تھیں کہ عثمان دوبارہ ان کے سامنے آ گیا تھا۔  
”آئی! آپ بے شک مجھے معاف نہ کریں مگر مجھ سے بات تو کریں، آپ کی اجازت کے بغیر تو میں نے وہ قدم نہیں اٹھایا تھا۔“

”اس اجازت کی سزا کسی کو تو جھیلنی تھی، جھیلنے دو مجھے، ہٹو میرے راستے سے۔“ لرزتے لہجے میں بولتے ہوئے انہوں نے پھر کترا کر کھلنا چاہا تھا مگر۔  
”یہ سزا آپ صرف اپنے شوہر کی خاطر جھیل رہی ہیں اور مجھے بھی دے رہی ہیں۔“ وہ مشتعل ہونے لگا تھا۔  
”میں ان کے خلاف ایک لفظ نہیں سنوں گی۔“

”میں بولوں گا، ان کی وجہ سے آپ میرے لیے اجنبی بن گئی ہیں، آپ کے شوہر نے نہیں، آپ نے مجھے مار دیا ہے۔“

”جب یہ جانتے ہو تو دور کیوں نہیں ہو جاتے میری نظروں سے۔“ غصیلے لہجے میں بول کر وہ آگے نکل جانا چاہتی تھیں کہ عثمان نے سختی سے ان کا بازو تھام کر روکا تھا۔

”بہت برداشت کر چکا ہوں، اب اور نہیں۔“ ارد گرد کی پروا کیے بغیر وہ غرایا تھا، عروسہ کا چہرہ بس ایک پل کے لیے فٹق ہوا تھا، مگر اگلے ہی پل شدید غصے میں ان کا زناٹے دار ٹھپڑ عثمان کے چہرے سے ٹکرا گیا تھا، سناٹے میں گھرا وہ ان کو دور جاتا دیکھا رہا تھا، کس کس نے یہ منظر دیکھا وہ جانتا نہیں چاہتا تھا مگر اس کے بعد وہ رکائیں تھا، سرخ چہرے کے ساتھ جارحانہ قدموں سے وہاں سے جاتے ہوئے اس نے رکے بغیر ساکت کھڑی بیلا کا ہاتھ گرفت میں لیا تھا اور اسے ساتھ ہی لیتا سب کی نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا۔

☆.....☆

لاؤنج میں وہ ساکت بیٹھی اب تک صدے میں تھی، بار بار اس کی آنکھوں کے سامنے وہ ایک ہی منظر آ رہا تھا، دل میں دھواں سا بھرنے لگا تھا، عروسہ نے وہ ٹھپڑ عثمان کے چہرے پر نہیں اس کے دل پر مارا تھا، عثمان کی جامد خاموشی اور سیاٹ چہرے نے اس کی اپنی زبان بھی بند کر ڈالی تھی، فی الوقت ان دونوں کے لیے ہی ایک دوسرے سے کہنے کے لیے کچھ نہیں بچتا تھا۔ مگر عثمان کی گم صمم کیفیت اسے ہولائے جا رہی تھی، واپسی کے دوران ہی اس نے اپنے ہواسوں پر قابو پاتے ہوئے چپکے سے مارش کو میسج send کر دیا تھا، عثمان کو اس وقت وہی سنبھال سکتا تھا، مارش کو اپنے گھر کے باہر ہی خطر دیکھ کر اس نے سکون کی سانس لی تھی،



عثمان کے کارپارکنگ سے واپس لوٹنے تک اس نے باہر کھڑے کھڑے ہی ساری بات مختصر آعارش کے گوش گزار کر دی تھی، اس کے بعد وہ تو گھر کے اندر چلی گئی تھی، مگر عثمان کو عارش نے باہر ہی روک لیا تھا تب سے اب تک وہ عثمان کے آنے کا انتظار ہی کر رہی تھی، مگر اب اتنی دیر گزر جانے کے بعد اس کا اضطراب حد سے بڑھنے لگا تھا، صبر ترک کر کے بالآخر وہ گھر سے باہر آئی تھی۔ گریز کے قریب ہی وہ کرسی پر موجود تھا، سگریٹ کے کئی ٹکڑے فرش پر بکھرے ہوئے تھے، آگے بڑھ کر بیلا نے اس سے جلتی سگریٹ لے کر دور پھینک دی تھی، وہ چونکا تھا مگر کچھ بولا نہیں تھا۔

”بہت رات ہو چکی ہے اب اندر چلو۔“ اس کے نرم لہجے پر وہ خاموشی سے اٹھا تھا اور اندر چلا گیا تھا، گیٹ لاک کرنے کے بعد تمام لائٹس آف کرتی وہ کمرے میں داخل ہوئی تھی، تکیے میں چہرہ چھپائے وہ جوتوں سمیت بیڈ پر دراز تھا، خاموشی سے اس کے جوتے اتارتے ہوئے بیلا کی تشویش بڑھنے لگی تھی کیونکہ عثمان نے اسے نہیں روکا تھا اور اس کا مطلب یہی تھا کہ عارش بھی اس کے صدمے کی شدت کو کم نہیں کر سکا ہے، لائٹ آف کرتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی کہ فی الحال وہ اسے اس کے حال پر چھوڑ دے مگر اس کا دل راضی نہیں ہوا تھا۔

”مائی! مجھ سے بات کرو، مجھے گھبراہٹ محسوس ہو رہی ہے۔“ اس کے شانے کو چھوتے ہوئے بیلا کی آواز بھرانے لگی تھی، وہ اٹھا نہیں تھا مگر اپنے چہرے کا رخ اس کی جانب کر لیا تھا، اس کی سرخ آنکھوں اور چہرے پر پھیلے کرب نے بیلا کو تڑپا دیا تھا، خاموشی سے وہ اسے دیکھ رہا تھا، جو اس کے ہاتھ کو چوم رہی تھی۔

”مجھے اس بات کا دکھ نہیں کہ بھری محفل میں انہوں نے مجھ پر ہاتھ اٹھایا، ان کو حق ہے، عم تو صرف اس بات کا ہے کہ انہوں نے اپنے شوہر کی وجہ سے ان کے ہی سامنے مجھے تھپڑ مارا، دنیا کی مجھے پرواہ نہیں، مگر انہوں نے اپنے شوہر کے سامنے کیوں؟“ مدغم مگر کرہٹاک ٹوٹے لہجے میں وہ بات ادھوری چھوڑ کر اس کی گود میں چہرہ چھپا گیا تھا، اس کے بالوں کو نرمی سے سہلائی وہ خاموش ہی رہی تھی، جانتی تھی کہ اگر عروسہ کے خلاف اپنے دل کا غبار اس وقت وہ زبان پر لے آئی تو اس کا ایک لفظ ہی عثمان کو ہتھے سے اکھاڑنے کے لیے کافی ہوگا، وہ اپنی ماں کے لیے جذباتی تھا، بیوی کے لیے بھی اتنا ہی جذباتی تھا، مگر اپنی بہن کے لیے وہ ان دونوں سے زیادہ جذباتی تھا، یہ سچ بیلا جانتی تھی، عثمان کے سامنے عروسہ کے خلاف وہ کہہ تو جاتی تھی مگر کہیں نہ کہیں دل میں یہ خدشہ ضرور رہتا تھا کہ کہیں وہ اسے اپنی طرف سے بدظن تو نہیں کر رہی۔

☆.....☆

اسٹڈی میں جس وقت وہ داخل ہو رات کے ۱۲ بج چکے تھے۔ کچھ دیر پہلے ہی وہ ریڈیو سے واپس آیا تھا اور ہشام قزلباش نے اسے طلب کر لیا تھا، اسے بہت زیادہ حیرت نہیں ہوئی تھی کہ ہشام قزلباش نے اسے اس وقت کیوں بلا یا ہے، معاملے کی نوعیت سے وہ کافی حد تک آگاہ تھا، آج شام ہی ہشام اور صبیحہ احمد مدعو تھے، وہاں میزہ کے گھر والوں نے بھی آنا تھا۔

”بیٹھو ہارون! کیسا رہا آج کا پروگرام؟“ ہشام قزلباش اس سے مخاطب ہوئے تھے۔

”آپ نے نہیں سنا؟“ اس نے کچھ شکایتی نظروں سے ان کو دیکھا تھا۔

”کیسے سنتے، ہم جس وقت گھر واپس آئے انج چکا تھا۔“ صبیحہ کے فوراً ہی کہنے پر ہارون نے چونک کر اٹھیں دیکھا تھا، معمول سے ہٹ کر آج ان کے لہجے اور چہرے پر ہارون کو خوشی کے تاثرات دکھائی دے



”وہاں میزہ کے ماں باپ اور اس کے بھائی، بھابھی بھی تھے، باتوں کے درمیان وقت کا پتہ ہی نہیں چلا۔“ صبیحہ مسکراتے ہوئے بولی تھیں۔

”آپ کے چہرے سے اندازہ ہو رہا ہے کہ آپ کا وقت وہاں سب کے ساتھ بہت اچھا گزرا ہے۔“  
ہارون نے مسکراتی نظروں سے ان کو دیکھا تھا۔

”ہاں، سب کے ساتھ بہت اچھا وقت گزرا، مگر میں تمہارے لیے بہت خوش ہوں، کیونکہ آج میں نے صاف طور پر میزہ اور تمہارے لیے بات کر لی ہے۔“ صبیحہ کی اطلاع نے ہارون کی مسکراہٹ غائب کر دی تھی۔

”کیا مطلب ہے آپ کا؟“ وہ دنگ تھا۔

”مطلب تم اچھی طرح جانتے ہو۔“ ہشام قزلباش نے سنجیدہ نظروں سے اس کے تاثرات کو جانچا تھا۔  
”مگر۔۔۔ مگر ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا، ماما! آپ نے مجھ سے پوچھے بغیر ایسا کیوں کیا؟“ کچھ بے چین ہو کر وہ اپنی جگہ سے اٹھ گیا تھا جبکہ حیران نظروں سے اسے دیکھتیں صبیحہ فوراً اس کی طرف آئی تھیں۔  
”مجھے تم سے پوچھنے کی ضرورت ہی کہاں تھی ہارون! میری نظریں دھوکہ نہیں کھا سکتیں، اگر کوئی اور وجہ ہے تو مجھے بتاؤ مگر یہ مت کہو کہ میں نے ایسا کیوں کیا۔“

”مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا کہ آپ سے کیا کہوں، مگر ابھی ایسا ممکن نہیں ہے۔“ وہ اضطرابی لہجے میں اتنا ہی بول سکا تھا۔

”سب کچھ ممکن ہے، میں اس معاملے میں تمہاری کوئی بات نہیں سنوں گی، خرمین کی خواہش پر عارش پہلے ہی میزہ کے ماں باپ سے بات کر چکا ہے، آج تو میں نے صرف اس بات کو آگے بڑھایا ہے۔“  
”مجھے اس بارے میں کوئی خبر نہیں ہے، میری اجازت کے بغیر میری بے خبری میں، ماما! آپ اس سلسلے کو روک دیں، میں ابھی اس سب کے لیے تیار نہیں ہوں۔“ اس کے قطعی لہجے پر صبیحہ بس پریشان نظروں سے اسے دیکھتی رہی تھیں۔

”میری زندگی کا سب سے پہلا مقصد یہی ہے کہ آپ کو آپ کی خوشیاں واپس مل جائیں اور اس سے پہلے میں اپنے بارے میں ان سب باتوں کا تصور بھی نہیں کر سکتا، ہر گز نہیں۔“ بات مکمل کرنا وہ تیز قدموں کے ساتھ اسٹڈی سے نکل گیا تھا۔

”صبیحہ! پریشان مت ہو، اس نے انکار نہیں کیا ہے لہذا ہمیں کوئی جلدی نہیں کرنی چاہیے، تم جانتی ہو کہ وہ کیا کہہ گیا ہے۔“ صبیحہ کے پریشان تاثرات کو دیکھتے ہوئے ہشام قزلباش نے ان کو تسلی دی تھی۔

☆.....☆

آفس میں داخل ہوتی وہ چونک کر دائیں جانب متوجہ ہوئی تھی، ہارون کی موجودگی نے اسے خوشگوار حیرت میں مبتلا کر دیا تھا، دوسری جانب وہ اخبار واپس ٹیبل پر ڈالتا اپنی جگہ سے اٹھ گیا تھا۔  
”آپ کب آئے؟“

”کچھ دیر پہلے۔“ اس کے بے حد سنجیدہ تاثرات نے میزہ کو زورس سا کر دیا تھا۔







”عارش سے ناراض گھوم رہی ہیں محترمہ! اس کی منت سماجت کے باوجود اس کے گھر بھی نہیں جا رہیں۔“

”میں اس سے ناراض نہیں ہوں، ابھی میں یہاں سے اس کے گھر ہی جاؤں گی۔“ منیزہ نے ناگواری سے اس کی بات کاٹی تھی۔

”یہ تمہارے ہاتھ پر چوٹ کیسے لگی؟“ کچھ چونک کر پوچھتے ہوئے عثمان نے اس کا ہاتھ پکڑ کے اپنے سامنے کیا تھا، جبکہ ہارون کے چہرے کے تاثرات یک لخت تن سے گئے تھے، کوئی اور وقت ہوتا تو عثمان کی جان بوجھ کر ہارون کے سامنے کی جانے والی اس حرکت پر منیزہ بھی گڑبڑا جاتی، مگر اس وقت بیزاری سے اس کی مسکراتی نظروں میں دیکھتی ہاتھ چھڑا گئی تھی۔ حالانکہ وہ پہلے ہی عثمان کو بتا چکی تھی کہ کچن میں کام کرتے ہوئے اسے یہ چوٹ لگی تھی۔

”معمولی چوٹ ہے، ٹھیک ہو جائے گی۔“ جان چھڑانے کے لیے بولتی وہ وہاں سے جانے کے لیے پر تونے لگی تھی۔

”ہارون! اگر آپ گھر کی طرف جا رہے ہیں تو منیزہ کو عارش کی طرف ڈراپ کر دیجیے گا۔“ عثمان کی بات سن کر وہ جاتے جاتے رکی تھی۔

”جیسے یہاں ٹائم لگ جائے گا، اس لیے ابھی میں تمہیں ساتھ نہیں لے جا سکتا۔“ وہ اب منیزہ سے مخاطب تھا۔

”میں تمہارا انتظار کر لوں گی، اگر جان چھڑانا چاہتے ہو تو ویسے ہی کہہ دو، کسی اور کو زحمت کیوں دے رہے ہو؟“ منیزہ کچھنا گواری سے بولی تھی۔

”مجھے زحمت نہیں ہوگی لیکن یہ اگر تمہارے ساتھ ہی جانا چاہتی ہیں تو یہ اور بات ہے۔“ ہارون کا لہجہ خشک تھا، مگر منیزہ کو چبھتا ہوا بھی محسوس ہوا تھا۔

”نہیں یہ صرف نخرے دکھانے کے موڈ میں ہے، آپ کی مہربانی ہوگی اگر آپ یہ ذمہ داری پوری کر دیں گے۔“ مسکراہٹ چھپانے وہ کچھ اس طرح بولا تھا کہ منیزہ کھول کر ہی رہ گئی تھی۔

بیک ویو مرٹھیک کرتے ہوئے وہ جلتی نگاہوں سے اس کے سپاٹ چہرے کے عکس کو اک بار پھر جھلسا گیا تھا۔

”مجھے اپنی چوٹ کی بابت کچھ بتانا تمہیں گوارا نہ ہوا، مجھے کوئی شکایت نہیں تم سے کیونکہ میں جانتا ہوں اپنی حد، مگر مجھے یہ نہیں معلوم کہ کسی کا ہاتھ پکڑ کر ہمدردی کا مظاہرہ کرنے کے لیے کس کا حق ہونا ضروری ہے؟“ اس کے تلخ لہجے کو سنتے ہوئے وہ سپاٹ چہرے کے ساتھ وٹا اسکرین کے پار دیکھتی رہی تھی۔

”مجھے افسوس ہے کہ مجبوراً تمہیں میرے ساتھ آنا پڑا ہے، میری جگہ اگر عثمان ہوتا تو تمہارا یہ سفر خوشگوار ہو سکتا تھا۔“ اس کے طنزیہ لہجے نے اس بار منیزہ کا ضبط ختم کیا تھا۔

”آپ گاڑی روکیں، مجھے یہیں اترنا ہے۔“ اس کی کرزنی آواز ہارون نے جیسے سنی ہی نہیں تھی۔

”میں نے کہا گاڑی روکیں ورنہ میں چلتی گاڑی سے بھی اتر سکتی ہوں۔“ سرخ چہرے کے ساتھ وہ تقریباً چیختی تھی۔

”میں تمہارا یہ ایکشن دیکھنا پسند کروں گا۔“ اس کے طنزیہ لہجے نے منیزہ کو غصے سے بے حال کیا تھا،



ہارون کو اس سے ایسی کسی بے وقوفی کی توقع نہیں تھی مگر وہ تو تیار تھی، بروقت اسے واپس پیچھے کرتے ہوئے صحیح معنوں میں ہارون کے ہوش اڑے تھے، گاڑی کے توازن کو برقرار رکھتے ہوئے وہ تجلی کی سی سرعت سے ڈور کو ایک جھٹکے سے بند کر چکا تھا۔

”یہ کیا حرکت کی ہے تم نے؟“ غصے میں وہ اپنی آواز ہلکی نہیں رکھ سکا تھا۔

”میرا ہاتھ چھوڑیں۔“ بینڈج والا ہاتھ اس کی انتہائی سخت گرفت سے نکالنے کی کوشش کرتی وہ غرائی تھی۔

”مجھے تمہارا ہاتھ پکڑنے کا ارمان نہیں تھا، مگر میں اس وقت تم پر بھروسہ نہیں کر سکتا۔“

”میں بھی اب اپنے لیے ایسی شرمناک باتیں نہیں سن سکتی۔“ غصے میں بے حال ہوتی میزہ کی سانسیں پھولنے لگی تھیں، اپنی گرفت میں اس کے ہاتھ کی لرزش کو محسوس کرتے ہوئے وہ پریشان ہوا تھا، اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ میزہ کے تورا تے خطرناک بھی ہو سکتے ہیں، اس نے تو اب تک اسے ٹھنڈی پرسکون چھاؤں جیسا ہی پایا تھا۔

”ایم سوری، میں تم سے اب کچھ نہیں کہہ رہا، میں اب بالکل خاموش رہوں گا۔“ خود پر قابو کرتے ہوئے اس نے میزہ کو شانت کرنا چاہا تھا جبکہ اس کی نرم پڑتی گرفت سے وہ ہاتھ نکال گئی تھی، بینڈج کو درست کرتے ہوئے وہ ہارون سے شدید متنفر ہو چکی تھی، شرمندگی تھی یا کچھ اور کہ ہارون دوبارہ اس سے نہ کچھ کہہ سکا تھا، نہ اس سے نظر ملانے کے قابل رہا تھا۔

فرنٹ سیٹ سے اترنے سے پہلے وہ رک کر اس کی جانب متوجہ ہوئی تھی۔

”آپ کہہ چکے ہیں کہ آپ کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں بن سکتا تو براہ مہربانی مجھے اپنی تنگ نظری کا شکار دوبارہ مت بنائیے گا، آپ کو یہ حق نہیں کہ کسی پر بھی لوز کیریئر ہونے کا ٹیک لگا دیں، آپ مجھے اب یہ کہنے پر مجبور کر چکے ہیں کہ جس مقصد کو لے کر آپ میرے پاس آئے تھے، اسے لے کر اس انسان تک جائیں، جو آپ کی بے خبری میں معاملے کو کہاں سے کہاں لے گیا، میں نے سب کے مسائل حل کرنے یا ضرورتیں پوری کرنے کا ٹھیکہ نہیں لے رکھا۔“ سرخ چہرے کے ساتھ وہ بھڑکتے لہجے میں بولی تھی اور اگلے ہی پل فرنٹ سیٹ سے اترتی تیز قدموں کے ساتھ گیٹ کی طرف بڑھ گئی تھی، جبکہ ہارون سپاٹ نکا ہوں سے اسے دیکھتا رہ گیا تھا۔

☆.....☆

کمرے میں داخل ہوتے ہوئے اس نے رک کر بیڈ کی جانب دیکھا تھا، جہاں بچہ پارک ہلکی آواز میں رونا اسے اپنی طرف متوجہ کرنے میں ناکام تھا، جو وارڈروب میں جانے کیا تلاش کر رہی تھی۔

”میرے پاس آنے کا وقت تو کبھی تمہیں ملے گا نہیں، کم از کم اس محصوم کو تو نہ ترساؤ۔“ دروازہ بند کرتا وہ خشمگین لہجے میں بولا تھا، چونکہ اس کی طرف متوجہ ہوتی وہ ایک پل کو رکھتی تھی، مگر اگلے ہی پل ایک جھٹکے سے وارڈروب بند کرتی اس تیزی سے اس کی جانب بڑھی تھی کہ عارش اس کے تیروں پر دنگ ہوتا بے اختیار پیچھے ہوا تھا۔

”لو آگئی پاس، اور بھی پاس آ سکتی ہوں۔“ ر کے بغیر مزید اس کے قریب ہوتی وہ اس کی پشت دروازے سے لگا گئی تھی، جس کی آنکھیں حیرت سے پوری کھل گئی تھیں۔



”سونے اور رونے کے علاوہ تمہارا معصوم بیٹا اور کرتا ہی کیا ہے، جیسا باپ ویسا بیٹا۔“ اس کے جتانے والے انداز پر وہ جو حیرت سے اس کے گہرے سرخ دوپٹے میں قید چہرے کو تنک رہا تھا، بے ساختہ مسکرایا تھا جبکہ وہ جسمکین نظروں سے اسے دیکھتی واپس پیچھے ہتی وراڈروب کی طرف چلی گئی تھی۔

”ویسے یہ بے ایمانی ہے، آئندہ اگر اس طرح پاس آنا تو پہلے مجھے خبردار کر دینا تاکہ مقابلہ برابری کا ہو۔“ مسکراہٹ چھپائے وہ تاکید کر رہا تھا۔

”اب میرا دماغ اتنا بھی خراب نہیں کہ تمہیں پہلے خبردار کروں، تمہارا کیا بھروسہ۔“ خرمن نے ہنستے ہوئے اسے دیکھا تھا، جو بچے کے قریب نیم دراز ہوتا اس پر جھک گیا تھا۔

”عارش! اب جب تک میں نہ کہوں تم اس کے لیے کوئی چیز نہیں لاؤ گے، تم اس کے لیے اتنی اندھا دھند شاپنگ کر چکے ہو کہ میرے لیے اس کی چیزیں سنبھال سنبھال کر رکھنا مشکل ہو رہا ہے، ایسا لگ رہا ہے کہ یہ میرا گھر نہیں بلکہ اسکول ہے جہاں کڈز پیکیج شروع ہو چکا ہے۔“ کپڑے ہنگ کرتی وہ کچھ جھلائے انداز میں اس سے مخاطب تھی، جو کان بند کیے اپنے بچے میں کم تھا۔

”خرمن! سب اسے کب تک چکن کہہ کر مخاطب کرتے رہیں گے؟“ کچھ دیر بعد اسے عارش کی آواز سنائی دی تھی۔

”تم سوچو، تم ہر بار یہی کہتے رہے تھے کہ بچے کا نام تم رکھو گے، میں بھی چاہتی ہوں۔“ مگر میں نے ہاسپٹل میں ہی یہ حق تمہیں دے دیا تھا، میں چاہتا ہوں اس کا نام تم رکھو، اب اس میں مزید دیر نہیں ہونی چاہیے۔“

”ٹھیک ہے، ایک دو نام میں نے سوچ رکھے ہیں کل بیلا اور منیزہ سے ڈسکس کر کے تمہیں بتاتی ہوں۔“

”تم مجھے بتا دینا مگر بہر حال اس کا نام فائل تو ماموں جان ہی کریں گے۔“ سنجیدہ نظروں سے عارش نے بغورا سے دیکھا تھا، جو اس کی بات ان سنی کرتی خاموشی سے اپنے کام میں مصروف رہی تھی۔

☆.....☆

”آپ ان کے ساتھ کچھ اچھا نہیں کر سکتیں تو برا کرنے کا بھی آپ کو حق نہیں، آپ کو تو جو کرنا تھا وہ آپ کر چکی ہیں، مگر مجھے تو شرمندگی اٹھانی پڑی ہے ماموں اور آپ کے سامنے۔“ کمرے میں داخل ہوتے فاروق نے ایک نظر حیران نظروں سے بیٹے کو دیکھا تھا جو بلند آواز میں عروسہ سے ہی مخاطب تھا۔

”کیوں چیخ رہے ہو اپنی ماں پر، تہذیب کے دائرے میں رہو، یہ تمہاری کلاس فیلو یا فرینڈ نہیں ہیں، ابھی یہ حال ہے تمہارا آگے جا کر تم تو میرا بھی کوئی لحاظ نہیں رکھو گے۔“ فاران پریس کر انہوں نے خاموش بیٹھیں عروسہ کو دیکھا تھا۔

”اور تم کیوں زبان بند رکھ کر اس کی باتیں سن رہی ہو، اٹھ کر لگاؤ دو تھپڑ، بھائی پر ہاتھ اٹھ سکتا ہے تو بیٹے پر کیوں نہیں۔“ وہ عروسہ پر برسرے تھے۔

”پاپا میں اپنے لیے نہیں، ماموں کے لیے چیخ رہا ہوں، می نے اتنے سارے لوگوں کے سامنے کتنا برا سلوک کیا ہے، اگر آپ مجھے نہ بتاتیں تو میں انجان ہی رہتا۔“

”کوئی قیامت نہیں آگئی، یہ بہن ہے اس کی، ہزاروں لوگوں کے مجھے میں اس کو مار سکتی ہے، تمہیں بھی



جوتے لگانے کا حق رکھتی ہے، کے اعتراض ہوا ہے، میرے سامنے لاؤ اس کو۔“ غصیلے لہجے میں وہ بولے تھے۔

Downloaded from paksociety.com

”پاپا! بات اعتراض کی نہیں ہے، مانی ماموں کا چہرہ باہر کی دنیا میں سب کے لیے مانوس ہے، مہی نے ان کے ساتھ جو کیا، وہ غلط معنوں میں بھی مشہور ہو سکتا ہے، ان کے خلاف کوئی متقی پلیٹی کے لیے اس بات کو استعمال کر سکتا ہے، ان کے امیج پر کوئی دھبہ بھی لگ سکتا ہے۔“ فاران زچ ہو کر بولا تھا۔

”ماموں سے زیادہ یہ آپ کا امیج لوگوں کی نظروں میں خراب کر گئی ہیں پاپا! میں نہیں چاہتا کہ اب مزید کسی چیز کے لیے آپ کو ذمہ دار ٹھہرایا جائے، مہی اپنے بھائی کے ساتھ اس سے بھی زیادہ سنگدل ہو جائیں، مگر ان کے ہر فعل کے پیچھے سب کو آپ نظر آتے ہیں، یہاں تک کہ آپ کو بھی، میرے لیے اس دنیا میں آپ سے بڑھ کر کوئی اچھا نہیں ہے، میں نہیں برداشت کر سکتا کہ کوئی آپ کو برا کہے، آپ کے متعلق کوئی غلط بات زبان پر لائے۔“ فاران کے جذباتی انداز پر فاروق بس دنگ نظروں سے اسے دیکھتے رہے تھے۔ فاران نے کبھی اس طرح ان کو نہیں بتایا تھا کہ وہ ان کے لیے کتنا حساس ہو چکا ہے۔

”پلانے تم سے کچھ کہا؟“ عروسہ نے بیٹے سے پوچھا تھا۔  
”کیا کریں گی جان کر، تھپڑ مار کر ان کی زبان بھی بند کر دیں گی؟“ شدید ناراضی سے ان کو دیکھتا فاران کمرے سے نکل گیا تھا۔

”میری وجہ سے اس کی اتنی ہمت ہوئی تھی کہ آپ کو ذلت سے دوچار ہونا پڑا تھا، کسی نہ کسی طرح اس ذلت کا سامنا سے بھی تو کرنا ہی تھا۔“ سر جھکائے وہ نم لہجے میں بولی تھیں۔  
”دنیا کے سامنے تمہیں اپنے طرف کو برقرار رکھنا چاہیے تھا مگر تمہیں اس وقت صرف یہ یاد رہا کہ شوہر کو اپنی وقاداری اور قربانی کے ثبوت دینے ہیں۔“ فاروق سنجیدہ لہجے میں بولے تھے اور پھر گہری سانس لے کر عروسہ کو دیکھا تھا۔ ”دنیا کو ہر غلط فعل کے پیچھے میں نظر آتا ہوں، تو یہی میری سزا ہے کیونکہ میں نے تمہارے ساتھ غلط کیا، تم سے کچھ چھیننا چاہتا تھا میں نے جو میرے پاس کبھی تھا ہی نہیں۔“ کچھ تھا ان کے لہجے میں کہ عروسہ ان کی جانب دیکھنے پر مجبور ہوئی تھیں۔

”عثمان قابل رشک ہے کہ اس کے پاس تمہاری جیسی بہن ہے، جو بھائی کی محبت میں ایک پل کے لیے اپنے شوہر کو بھلا سکتی ہے، جو اپنے بھائی کی خوشیوں کے لیے اپنا ہنسا بستا گھر بھی داؤ پر لگانے سے گریز نہیں کر سکتی، تم نے ہمیشہ اپنے بھائی پر فخر کیا، آج بھی تم یہ تصور بھی نہیں کر سکتیں کہ اس سے اپنے رشتے پر تمہیں کوئی شرمندگی ہو، میرے کہنے پر تم اس سے تعلق تو ختم کر سکتی ہو، مگر اسے اپنے لیے نامحرم نہیں بنا سکتیں۔“ لرزتے لہجے میں بولتے ہوئے ان کے چہرے پر اذیت پھیلتی جا رہی تھی۔

”ایک بہن جب اپنے بھائی سے کہتی ہے کہ وہ اس کے لیے نامحرم ہے تو اس اذیت کے سامنے موت کی اذیت کی بھی کوئی اہمیت نہیں رہتی۔ میں اس اذیت سے آخری سانس تک گزرتا رہوں گا، مگر کبھی نہیں چاہوں گا کہ اس اذیت کا سامنا ایک اور بھائی کرے۔“ خاموش ہو کر انہوں نے سرخ ہوتی آنکھوں سے عروسہ کو دیکھا تھا، جو سانس رو کے ان کو ایک ٹک دیکھ رہی تھیں، مگر شوہر کے دل کا درد ان کی آنکھوں سے



”اس کے پاس چلی جاؤ، میری زندگی میں اذیتوں کی انتہا بھی ہو جائے، تو بھی مجھے تمہارے لیے اور اپنی اولاد کے لیے جینا ہے، مگر تم پر کوئی ظلم کر کے میں اپنی عاقبت کو اذیت سے دوچار نہیں کرنا چاہتا، جب تک تم نہ چاہو دنیا کی کوئی طاقت تمہیں تمہارے بھائی سے نہ الگ کر سکتی ہے نہ تمہارے لیے اس کو زندہ درگور کر سکتی ہے، میری طرف سے تمہیں اجازت ہے، میری وجہ سے ہمتا عرصہ تم نے اپنے دل کو اپنے بھائی کے لیے مارا ہے، اس کے لیے تم مجھے معاف کر دو۔“

”میں آپ کا یہ احسان.....“ دل کی اذیت نے عروسہ کی زبان بند کر دی تھی، ان کے سینے سے سر نکالتے ہوئے عروسہ کی سسکیاں بلند ہونے لگی تھیں۔

”یہ احسان نہیں، تمہارا حق ہے، بس اتنا یاد رکھنا کہ اپنے بھائی کے پاس تم صرف اسی کے لیے جا رہی ہو، اس کی بہوی کے لیے نہیں۔“ ان کے سنجیدہ لہجے میں ایک تسبیہ چھپی تھی۔

☆.....☆

”مینزہ مصطفیٰ! تم نے میرے سلام کا جواب نہ دے کر اچھا نہیں کیا۔“ عثمان کی بڑبڑاہٹ بیلا کے کانوں تک پہنچی تھی، جو ڈرائنگ کے سامنے بیٹھی بالوں میں ہنس پھیر رہی تھی۔

”ہارون کے سامنے اس کا ہاتھ پکڑنے کے بعد وہ اب تمہاری طرف دیکھ لے تو یہ بھی بڑی بات ہے۔“ بیلانے ناگواری سے اسے دیکھا تھا جو لیپ ٹاپ میں، مصروف بیڈ پر ہی نیم دراز تھا۔

”وہ آن لائن ہے تو سوچا اس کی طبیعت کے بارے میں پوچھ لوں، اسٹی ٹیوٹ سے غائب ہونے کے لیے بہانے بہت ہوتے ہیں اس کے پاس۔“ وہ مصروف انداز میں بولا تھا۔

”ایک بات بتاؤں تمہیں۔“ بالوں کو ہیکر بیڈ میں قید کرتی وہ ڈرائنگ کے سامنے سے ہنسی تھی۔

”جب تم میرے علاوہ کسی اور کے لیے اتنی توجہ کا اظہار کرتے ہو تو یقین کرو میری نظر میں تم سے زیادہ کوئی چیز زہریلی نہیں ہوتی۔“ اس کے چہرے لہجے پر عثمان نے مسکراتی نظروں سے اس کے صبح چہرے پر ناگواری کے تاثرات کو دیکھا تھا۔

”جیلیسی میں بھی تم قیامت لگتی ہو۔“

”عثمان میں سنجیدہ ہوں۔“

”میں تم سے زیادہ سنجیدہ ہوں، مگر صرف تمہارے لیے۔“ وہ آنکھوں میں شرارت سجائے بولا تھا جبکہ کال بیل کی وجہ سے وہ بحث ترک کرتی کمرے سے نکل گئی تھی، جبکہ عثمان دوبارہ لیپ ٹاپ کی طرف متوجہ ہو گیا تھا، چند لمحے گزرے تھے جب باہر سے آتی آوازوں پر وہ چونکا تھا، اسی لمحے اس نے قارآن کو جلت میں اندر آتے دیکھا تھا۔

”باہر آ کر دیکھیں کون آیا ہے۔“ قارآن کے خوشی سے بھرپور لہجے پر وہ ایک پل کے لیے حیران ہوا تھا۔

(جاری ہے)



# سفر سے سفر تک

”ڈینگی مچھرنے کا کیا تھا۔“ وہ جل کر بولا۔  
”اشعر کے بچے! بہار۔ پیسے پانی میں ڈال کر

”یہ اتنا کمزور کیوں ہے؟“ اس نے منہ بسور کر  
اشعر کو دیکھا۔



READING  
Section



آگے۔ فیضی دکھ میں مراحار ہاتھا۔  
”یار! بارہ ہزار میں تو ایسا بکرا ہی ملے گا نا؟“ اس نے باری باری سب کی اتری شکلوں کو دیکھا۔  
”ٹھیک ہی کہہ رہے ہو، دیکھو یہ تو وائٹ کلر کا بکرا ہے اور چہل کا بکرا تو کالا تھا۔“ بسمہ اب نرمی سے بکرے کی پیٹھ پر ہاتھ پھیر رہی تھی۔  
”کلر سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ فرق تو ہیلتھ سے پڑتا ہے۔“ ایمل ناخن چباتے ہوئے بولی۔  
”عید تک ہم اس کی خوب خوراک کریں گے تب تک یہ چہل کے بکرے سے بھی زیادہ پیلیتھی ہو۔“  
جائے گا۔ شہر و زپر جوش ہوا۔  
”کم آن! گھر آئے مہمان کو یوں دیکھ کر منہ نہیں بسورتے۔“ منابل نے بڑی بہن ایمل کو پچکارتے ہوئے کہا۔ وہ ابھی تنکھے تاثر لیے اشعر کو گھور رہی تھی۔  
دبلا پتلا اور بے چاری سی شکل بنائے کھڑا بکرا اسے ہنسم نہیں ہو رہا تھا۔  
”اب کچھ بولو بھی۔“ اشعر اس کے کچھ بولنے کا منتظر تھا۔

”اشعر! یہ چہل کے بکرے جتنا ہیلتھی تو ہو جائے گا نا؟“ اس نے ضمانت مانگی۔





# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✦ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسجے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

# WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on  
Facebook

[fb.com/paksociety](https://fb.com/paksociety)



[twitter.com/paksociety](https://twitter.com/paksociety)



”ہاں بھئی! اب اس کا گارٹی کارڈ بنوادوں۔“ وہ

چڑ کر بولا۔  
دو دن قبل چہل یعنی ان سب کی پھپھو کی بیٹی  
سب کزنز کو جلا بھنا گئی تھی۔

”چالیس ہزار کا بکرا۔ سونے کا ہے کیا؟“ شیری  
چیخ کر بولی۔

”کس زمانے میں جی رہے ہو۔ یہ 2015ء  
ہے مسٹر شہروز۔“ چہل تخت پر شہزادی کی طرح بیٹھی تھی  
اور وہ سب کزنز اس کے آس پاس۔

پھپھو کی شادی اپر کلاس میں ہوئی تھی۔ ان کے دو  
بچے تھے۔ چہل اور ہادی، جب بھی وہ ننھیال آتے تو  
ان کزنز کو چڑا کر رکھ دیتے تھے۔

”ہم نے دو گائے اور دو بکرے خریدے ہیں۔“  
ہادی نے معلومات میں اضافہ کیا۔

”تو ان سب کو بھی یہاں لے آتے۔“ فیضان نے  
شرارتی مسکراہٹ دباتے ہوئے کہا۔

”اس بکرے سے مجھے زیادہ لگاؤ ہو گیا ہے۔“ چہل بہانیت  
ہی صحت مند سپاہ بکرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔

”آپ لوگ تو چاندرات کو بکرے خریدتے ہیں  
ناں۔“ ہادی نے اپنے تمام کزنز کی بے چاری شکلوں  
کو دیکھ کر تپایا۔

”ہاں جی! بابا کہتے ہیں کہ بکروں کی بے جانمائش  
نہیں کرنی چاہیے۔“ مناہل موٹے موٹے چشمے  
درست کرتے ہوئے بولی۔

”بھئی یہ تو بچوں کو بہلانے کے بہانے ہیں۔ و۔  
اصل میں اپنا فائدہ دیکھتے ہیں۔ چاندرات کو بکرے  
ستے جو ملتے ہیں۔“ چہل استہزائیہ بولی۔

”کل ہم بھی بکرے لے کر آئیں گے۔ میں بابا سے  
بات کروں گی۔“ ایمیل نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

سب نے اسے حیرانگی سے دیکھا۔ کیوں کہ سب  
جانتے تھے کہ اس کی یہ خواہش پوری نہیں ہونے والی۔

اور ہوا بھی ویسا ہی وہ بابا کے پاس بات کرنے گئی

تو انہوں نے ڈپٹ دیا کہ مجھے چاندرات کو ہی پیسے  
ملیں گے اور بکرا بھی چاندرات کو ہی آئے گا۔

وہ جذباتی ہو کر چہل اور باقی سب کو چیخ تو کر چکی تھی  
مگر اب بابا نے اس کی ناک ہی کاٹ کر رکھ دی تھی۔

”بابا! نہیں مان رہے تو کیا ہوا۔ ہم خود ہی بکرا  
خرید لیں گے۔“ وہ آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی تھی۔

”تم پاگل ہو گئی ہو، ہم میں سے کسی کے پاس نہ  
اتنی رقم اور نہ ہی ہم میں سے کوئی جا ب کرتا ہے۔“

اشعر نے صاف صاف ہاتھ جھاڑے۔  
”ویسے مرتضیٰ بھائی جا ب کرتے ہیں اگر ایمیل آپ کی

ان سے درخواست کر دیں۔“ بسمہ شرارت سے بولی۔  
”ٹھٹ اپ! ہم سب ملا کر تو لے سکتے ہیں۔ مجھے

چہل کے آگے جھکنا نہیں، میں اسے بکرے لے کر جواب  
دینا چاہتی ہوں۔“ وہ بغض ہوئی۔

اور اس نے ضد میں جیسے تیسے سب کو راضی کر ہی  
لیا۔ سب کے پیسے ملا کر بارہ ہزار بنے تھے۔ اشعر

منڈی جا کر بکرے لے آیا تھا۔ بکرے کو دیکھ کر ایمیل کا  
خون جل گیا تھا۔

بکرا تو آ گیا تھا مگر اتنا کمزور، ہاتھ مارو تو گر  
جائے، چہل دیکھتی تو مذاق اڑاتی۔

”ٹھپک ہے، لیکن تم سب اپنی جی توڑ کوشش کرو  
گے اسے تھپی بنانے میں۔“ ایمیل نے اشعر کے

ہاتھ سے رسی لیتے ہوئے سب سے تائید مانگی۔ سب  
نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس نے بکرے کی رسی

درخت کے ساتھ باندھی۔  
بکرا تھوڑی دیر بعد اجنبی جگہ اور خود کو تنہا پا کر میں،

میں کرنے لگا تھا۔ گھر کے اندر سے تائی امی، ایمیل کی  
امی برآمد ہوئی تھیں۔

”یہ بکرا کہاں سے آیا؟“ امی کا حیرت سے منہ کھل گیا۔  
”میں لے کر آیا ہوں امی!“ اشعر اداکاری سے

بولا۔ باقی سب نے اسے کھا جانے والی نظروں سے  
دیکھا۔



بکرے کو تلاش کیا کہ اسی دوران بیرونی گیٹ کھول کر اشعر اندر داخل ہوا۔

”کہاں گئے تھے صبح صبح اسے لے کر؟“ اس نے تن کر پوچھا۔

”یار! سیر کروانے گیا تھا۔ یونو سیر اچھی ہوتی ہے صحت کے لیے۔“ اس نے بکرے کی پیٹھ سہلاتے ہوئے کہا۔

”اسے اچھی طرح کھلاؤ پلاؤ، دودن کے اندر یہ صحت مند ہونا چاہیے۔“ وہ رعب سے بولی۔ جب سے وہ کمزور بکرالایا تھا تب سے وہ اسے ہر بات میں آڑے ہاتھوں لے رہی تھی۔

”دودن میں کیا کوئی جادو گر ہوں۔ یا یہ بکرا کوئی بے جان پرزہ ہے۔“ اسے دودن والی بات ہنس نہیں ہوئی تو فوراً اگل دیا۔

”عید تک ہو جائے گا۔“ وہ بکرے کی رسی کو درخت سے باندھتے ہوئے بولا۔ وہ سر سے پاؤں تک جل گئی۔

”کیا؟ اور اگر چہل آگنی تو ہم کیا منہ دکھائیں گے۔“ وہ جڑ کر بولی۔

”دیکھ لیں گے چہل کی بچی کو۔“ وہ بے فکری سے بولتا ہوا اپنے پورشن کی طرف چل دیا۔ وہ وہیں درخت کے ساتھ بنی کیاری پر بیٹھ گئی۔ نیند تو ویسے بھی اب اڑ گئی تھی۔ اس نے پورے گھر کو بغور دیکھا۔ ابھی تک اندر سے کوئی برآمد نہیں ہوا تھا۔

کہنے میں تو یہ ایک گھر تھا مگر یہ گھر دو پورشن پر مشتمل تھا۔ ایک پورشن تایا ابو کا اور ایک پورشن ایمل کے بابا کا۔

تایا ابو کے تین بچے مرتضیٰ، فیضان اور بسمہ تھے جب کہ وہ چار بہن بھائی تھے۔ ایمل، اشعر، مناہل اور شہروز۔

فرسٹ کزنز ہونے کے ناتے دادی اور باقی سب کی خواہش پر مرتضیٰ اور ایمل کا نام جڑ گیا تھا۔

”نہیں جی! یہ ہم سب نے مل کر خریدا ہے۔“ بسمہ کو اپنے خرچے کی قربانی یاد آئی تو پھٹ پڑی۔

”میرے بچوں۔“ تائی امی جذباتی ہوئیں۔

”یہ کوئی طریقہ ہے، اس طرح قربانی کی جاتی ہے۔ قربانی کا مطلب بھی پتا ہے؟“ تائی امی کے پیچھے سے مرتضیٰ برآمد ہوا۔ اسے دیکھ کر سب کی ہوائیاں اڑ گئیں۔

وہ سب کزنز سے بڑا تھا۔ اس کا رویہ خاصا نپا تلا ہوتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی وہ ایمل کا منگیتر بھی تھا۔ ”یہ پوری فلم اس ایمل کی بنائی ہوئی ہے۔“ اشعر نے پوری کارکردگی کا سہرا ایمل کے سر سجایا۔ ایمل فیضان کے پیچھے جا چھپی۔

”کیوں بھئی؟“ اس نے ایمل کو گھورا۔

”میری خواہش تھی عید سے پہلے بکرا گھر آجائے اور تو کوئی خواہش پوری کرتا نہیں، ہم نے خود ہی کر لی۔“ وہ فیضی کے پیچھے سے جھانک کر بولی۔

”اوہ..... قربانی کے نام پر خواہش پوری کی جا رہی ہے۔“ وہ ابرو اچکا کر طنزیہ بولا۔ اس کا رویہ ایسا ہی ہوتا تھا۔ طنزیہ اور جتانے والا۔ ایمل کو وہ اچھا تو لگتا تھا مگر اس کا ایسا رویہ اسے بالکل بھی پسند نہیں تھا۔

پہلے تو وہ ٹھیک ہوتا تھا مگر جب دادی کی خواہش پر ان دونوں کی منتنی ہو گئی تھی اس کے بعد وہ کچھ زیادہ ہی کڑوا ہو گیا تھا۔

”مرتضیٰ چھوڑو بھی اب، بچوں کو خوش ہونے دو، خبردار جواب کچھ کہا تو۔“ تائی امی نے اسے ڈانٹا۔ وہ سب پر عیسیٰ نگاہ ڈالتا ہوا اندر کی جانب بڑھ گیا۔

☆.....☆

اس کی صبح سویرے آنکھ کھلی تو وہ بستر چھوڑ کر سیدھا صحن میں بکرے کو دیکھنے کے لیے چلی آئی کہ اسے بکرے کی بہت فکر تھی۔

اس کی لمبی آتی جمائی رک گئی۔ بکرا اپنی مخصوص جگہ پر نہیں تھا۔ اس نے اپنے چاروں اطراف گھور کر



”کیٹ واک.....! وہ بھی بکروں کی؟“ مناہل نے حیرانگی سے منہ پر ہاتھ رکھا۔

”جی ہاں! ہر سال ہوتا ہے کس زمانے میں جی رہی ہو؟“ وہ کندھے اچکا کر بولی۔

”پھر تو ہم بھی جائیں گے۔ ابھی سے ہم بکرے کو پریکٹس کرواتے ہیں۔“ فیضان پر جوش ہوا۔

”ہا ہا! بہت انجوائے کریں گے لوگ تمہارے بکرے کو۔“ وہ استہزائیہ بولی۔

”ہمارا بکرا کسی سے تم نہیں ہے۔“ چہل کی باتیں ایمل کو زہر لگ رہی تھیں۔

”کوئی ضرورت نہیں ایسی فضول حرکتیں کرنے کی۔“ مرتضیٰ گھمبیر آواز میں گویا ہوا۔ سب نے گردن موڑ کر عقب میں دیکھا۔

وہ براؤن ٹراؤزر، ٹی شرٹ میں ملبوس خطرناک تاثرات کے ساتھ کھڑا تھا۔

”اس میں فضول کیا ہے مرتضیٰ بھائی؟“ چہل نے بلا کی حیرانگی دکھائی۔

”قربانی کرنا ایک اعلیٰ مرتبے کا کام ہے۔ قربانی کے کچھ اصول ہیں ضابطے ہیں۔ یہاں تو قربانی کے نام پر خواہشیں پوری کی جا رہی ہیں۔ کیا ہم مسلمانوں کو زیب دیتا ہے قربانی کے جانوروں کو کیٹ واک کروائیں، پھر تالیاں بجائیں۔“ وہ ماتھے پر تیوریاں چڑھائے بول رہا تھا۔ تمام افراد خاموش ہو گئے تھے۔

”یہ تو تھوڑا انجوائے منٹ ہوتا ہے۔ ہمارے لیے بھی اور جانوروں کے لیے بھی۔“ چہل دو ٹوک انداز میں بولی۔

”تمہارے لیے یہ فضول کام انجوائے منٹ ہوتا ہوگا۔ ویسے بھی جانوروں کو عقل نہیں ہوتی، تم تو انسان ہو۔“

”ہاں! میں انسان ہی ہوں۔“ چہل نے بدتمیزی سے اس کی بات کانی۔

”مجھے تو جانور ہی لگتی ہو۔“ مرتضیٰ نے بھی اسی

مرتضیٰ اس سے پانچ برس بڑا تھا۔ وہ سمجھ دار اور سلجھا ہوا تھا۔ لیکن ایمل اس کے برعکس تھی۔ وہ شوخ، ہنس مکھ ان میچور تھی۔

اس کی ہر وقت الٹی سیدھی حرکتیں اسے بالکل بھی پسند نہیں تھیں۔ وہ چاہتا تھا ایمل میچور ہو جائے۔ ڈینٹ ہو جائے۔ مگر وہ بھی کہ اپنی ہی دھن میں مگن رہتی۔

☆.....☆

”ہا ہا ہا..... ہی ہی ہی۔“ جب سے چہل نے بکرا دیکھا تھا اس کی ہنسی رکنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ ایمل کھا جانے والی نظروں سے اشعر کو دیکھ رہی تھی۔

”کسی مرض میں مبتلا ہے کیا یہ؟“ وہ پیٹ پر ہاتھ رکھ کر ہنسی روک کر بولی۔

”آپی! کسی کا اتنا مذاق اڑانا ٹھیک بات نہیں ہے۔“ شیریں نے منہ بسور کر کہا۔

”ویسے بھی یہ عید تک آپ کے بکرے جیسا ہو جائے گا۔“ بسمہ پر یقین لہجے میں بولی۔

”اوہ..... اچھا! جادو کی گھٹی سے۔“ چہل استہزائیہ بولی۔

”آپ کے والا تو سیاہ ہے۔ یہ تو سفید ہے اور دیکھو کتنا معصوم ہے۔“ مناہل نے ایک دم بچوں والی بات کہی۔

”بالکل ہماری ایمل جیسا معصوم۔“ فیضی نے لقمہ لگایا۔ ایمل نے اسے غصے میں دیکھا۔

”ایمل اور معصوم۔“ چہل ناک چڑا کر بولی۔

”تم جلتی ہی رہو گی ایمل سے۔“ ایمل کی برداشت جواب دے رہی تھی اس نے بھی مسکراتے ہوئے چہل کا تن من جلا یا۔

”ویل، کل شام گلشن میں ایک پروگرام رکھا گیا ہے۔ جہاں پر بکروں کے لیے خصوصی انتظامات ہیں اور وہاں بہت سارے لوگ اپنے بکرے لے کر آئیں گے اور زبردست کیٹ واک ہوگی۔“ وہ کزنز کے گھیرے میں بیٹھی تھی۔



تیزی میں کہا۔ چہل کا منہ کھل گیا۔ سب کے چہروں پر زریب مسکراہٹ پھیل گئی۔

”کیا ضرورت ہے آپ کو کپڑے دھونے کی، کوئی یاسی رکھ لیں۔“ وہ فکر مندی سے بولی۔

”بھی تو کہتی ہوں، بہو گھر آجائے تو میرا بوجھ کم ہو جائے۔“ وہ معنی خیزی سے بولیں۔ ایمیل جل ہو گئی۔ مرتضیٰ کا حرکت کرتا ہاتھ رک گیا۔

”اب جب تک آپ ٹھیک نہیں ہو جاتیں۔ میں سارا کام کروں گی۔“ اس نے نارمل لہجے میں سکوت توڑا۔

مرتضیٰ نے انہیں دوائی دی تو وہ کچن میں چلی آئی۔ بسمہ اور فیضان اکیڈمی گئے ہوئے تھے۔ تایا ابو بھی آنے والے تھے۔ اس نے ڈنر کی تیاری شروع کر دی۔

چکن کڑائی تیار کر کے اس نے سلا دکانی، مرتضیٰ کو کسی بھی کھانے کے ساتھ سلا د کھانا پسند تھا۔ اس نے سلا کو پلیٹ پر پرکشش انداز سے سجایا تھا۔

گرم گرم روٹیاں تیار تھیں۔ فیضان، مرتضیٰ اور بسمہ کھانے کی ٹیبل پر آ چکے تھے۔ تانی امی کے لیے اس کی امی نے پرہیزی کھانا بنا کر بھیجا تھا۔

”تمہیں کھانا بھی بنانا آتا ہے کیا اور روٹیاں بھی۔“ وہ سب کے آگے کھانا رکھ رہی تھی۔ مرتضیٰ حیرانگی سے پوچھ رہا تھا۔

”جی ہاں۔“ وہ طنزیہ بولی۔ ”آپ کبھی غور کرو تو پتا چلے نا، ہر وقت اکڑو بنے رہتے ہیں۔ جانے کیسا بیرہے مجھ سے۔“ وہ دل میں کڑھتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

”چاچی نے انہیں اسپیشلی سکھایا ہے۔ کہہ رہی تھیں اب شادی ہونے والی ہے تو سیکھ لو۔ ورنہ ناک کٹواؤ گی۔“ بسمہ نے چاچی والے انداز میں بتایا۔ مرتضیٰ زریب ہنس رہا تھا۔

”کھانا تو بہت اچھا بنا ہے۔ چلو چاچی کی ناک بیچ گئی۔“ فیضی آنکھ دبا کر بولا۔ ایمیل نے اسے آنکھیں دکھائیں۔

”اور خبردار جو تم میں سے کوئی بھی اس تقریب میں گیا تو۔“ مرتضیٰ نے سب کو غصیلی نگاہ سے دیکھا۔ بطور خاص ایمیل کو۔

”کتنے عجیب ہیں یہ مرتضیٰ بھائی۔“ اس کے جانے کے بعد چہل ناراضی سے بولی۔

”پیدائشی ہیں۔“ اشعر زریب مسکرایا۔

”پتا نہیں۔ ایمیل تم پوری زندگی ان کے ساتھ کیسے گزارو گی۔“ اسے اچانک ایمیل سے ہمدردی ہوئی۔

”دیوار سے سر مار مار کر مر جائے گی بے چاری۔“ فیضان نے کھلی اڑائی۔ ایمیل نے اسے مکار سید کر دیا۔

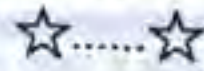
”تو پھر کل کے بارے میں کیا سوچا؟“ اتنی عزت افزائی ہونے کے بعد بھی وہ پوچھ رہی تھی۔

”نہیں ہم نہیں جائیں گے۔ ان کا انداز غلط تھا مگر بات ٹھیک تھی۔“ ایمیل ٹھہر ٹھہر کر بولی۔

”تم لوگ ٹڈل کلاس کے ٹڈل کلاس ہی رہو گے۔“ وہ غصے میں بولتی ہوئی وہاں سے اٹھ گئی۔ وہ سب اسے خاموشی سے جاتا دیکھ رہے تھے۔

”ویسے مرتضیٰ بھائی کو ”ان“ کب سے بولنے لگی ہو؟“ اشعر نے اسے شہو کا مارتے ہوئے معصومیت سے پوچھا۔

”سٹاپ۔“ وہ دھاڑی۔



وہ دوڑتی ہوئی تایا ابو کے پورشن میں آئی تھی۔ تانی امی بیڈ پر دراز تھیں۔ پاؤں میں ڈریسنگ کی ہوئی تھی۔ مرتضیٰ ان کے لیے دوائی نکال رہا تھا۔

”تانی امی، کیا ہوا؟“ وہ مارکیٹ گئی تھی جب انہیں چوٹ لگی تھی۔ واپس آئی جیسے ہی امی نے بتایا وہ دوڑ کر ان کے پاس چلی آئی۔

”بس بیٹا! کپڑے دھو رہی تھی پھسل گئی۔“ ان کی



”بیٹا! تم بھی کھالو۔ کھڑی کیوں ہو۔“ تاپا ابو کرسی گھسیٹتے ہوئے پیار سے بولے۔

”گھر پر کھالوں گی۔“  
”یہ بھی تو گھر ہے نا آپ کا۔“ تاپا ابو نے اس کے لیے کرسی نکالی۔ ناچار اسے بیٹھنا پڑا۔ وہ ڈینٹ طریقے سے کھا رہی تھی۔ نوالہ بڑی مشکل سے گلے سے اتر رہا تھا۔ مرتضیٰ جو سامنے بیٹھا تھا۔ کھانے کے بعد تاپا ابو اٹھ کر چلے گئے۔ اس نے اور بسمہ نے برتن سمیٹے۔

”ایمل ادھر آؤ۔ میں تمہیں چہل اور اس کی تقریب کی تصویریں دکھاتا ہوں۔“ فیضان اپنا ٹیبلٹ لیے اسے بلارہا تھا۔  
ایمل نے پن سے اسے مرتضیٰ کی طرف اشارہ کیا کہیں وہ غصہ نہ ہو جائے۔  
”تم ان فضول حرکتوں سے باز نہیں آؤ گے۔“ مرتضیٰ نے اسے ڈپٹا۔

☆.....☆  
”کیا یہ ایسا ہی کمزور ہے گا؟“ اس نے تھوڑی پر مٹھی رکھ کر اپنے تمام ساتھیوں کو دیکھا۔  
”مجھے تو ایسا ہی لگتا ہے، عید میں صرف چار دن رہ گئے ہیں اور اس کی صحت ویسی کی ویسی ہے۔“ فیضان پر سوچ انداز میں بولا۔

”کھاتا تو اتنا سارا ہے، آخر جاتا کہاں ہے؟“  
شہروز نے بکرے کو مسلسل کھاتے دیکھ کر کہا۔  
”پیٹ میں کیڑے تو نہیں؟“ بسمہ پریشان ہوئی۔

”شٹ اپ یار!“ ایمل چڑ کر بولی۔  
”اب تو چہل آپ نے بھی دیکھ لیا ہے۔ وہ خاصا مذاق بھی اڑا چکی ہیں۔“ منائل نے کہا۔

”تم اسے کہاں لے جا رہے ہو؟“ اشعر باہر سے عجلت میں اندر آیا اور بکرے کی رسی کھول کر باہر لے جا رہا تھا۔

”شیخ صاحب کے گھر لے کر جا رہا ہوں، ان کے

ہاں مہمان آئے ہیں۔ وہ دیکھنا چاہتے ہیں۔“ اشعر نے ان کی جانب گردن گھما کر جواب دیا۔ بکرا مسلسل اس کے گھٹنوں پر سر رکھ رہا تھا۔

”شیخ صاحب کے مہمان ہمارا بکرا کیوں دیکھنا چاہتے ہیں؟“ بسمہ نے تپے کی بات کی۔  
شیخ صاحب اس محلے کے امیر آدمی مانے جاتے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ نہایت ہی کنجوس قسم کے آدمی بھی تھے۔

”ان کا بیٹا میرا دوست ہے اس لیے۔“ وہ مختصر کہہ کر جانے کو مڑا۔

”خود تو شیخ صاحب عید سے کافی دن پہلے ہی بکرا لے آتے ہیں اور بکرا بھی ایسا کہ انگلی رکھو تو دور جا کرے۔“

”جلدی لے کر آ جانا۔“ ایمل نے اسے پیچھے سے آواز دی۔

”ویسے ایمل آپ! ہمارا بکرا تو شیخ صاحب کے بکروں سے اچھی حالت میں ہے۔“ منائل کو فضول میں خوشی ہوئی۔

”جب آیا تھا تو شیخ صاحب کے بکروں والی حالت ہی تھی۔ اب ہمارے ہاں اتنا کھا کھا کر صحت مند ہوا ہے۔“ شیری آنکھ دبا کر بولا۔ سب کو ہنسی آگئی۔

”کتنی بکو اس کرتے ہو تم لوگ۔“ ایمل ہنسی دبا کر بولی۔  
”بکرا کہاں ہے؟“ اشعر کو واپس گھر آتے دیکھ کر سب نے بیک وقت پوچھا۔

”وہ تھوڑی دیر بعد آئے گا ابھی دوستوں کے ساتھ گھل مل گیا ہے۔“ اشعر بال کھجا کر بولا۔  
”اشعر تم مار کھاؤ گے۔ مجھے ابھی جا کر لا کر دو۔“

ایمل نے باقاعدہ اس کا گریبان پکڑ کر کہا۔  
”بکرا کل۔“ اشعر شرارت سے ہنستے ہوئے گریبان چھڑا کر بولا۔ وہ اسے دوبارہ پکڑتی وہ دوڑ کر اندر چلا گیا۔



”اشعر میں تمہارا جینا حرام کر دوں گی۔“ وہ پوری قوت سے چلائی۔

”چپ ہو جاؤ۔“ شیریں نے اسے ٹھوکا مارا۔

”کیوں چپ ہو جاؤں۔“ وہ اس پر دباڑی۔

”اس لیے کہ تمہارے پیچھے مرتضیٰ بھائی کھڑے ہیں۔“ بسمہ جھٹ سے بولی۔

مرتضیٰ کھا جانے والے تاثرات لیے کھڑا تھا۔ وہ سر جھکا کر آگے بڑھ گئی۔

☆.....☆

”بیٹا آپ کا جتنا شکریہ ادا کیا جائے کم ہے۔“ وہ تینوں بیرونی گیٹ سے کان لگائے کھڑی تھیں۔ دروازے کے دوسری جانب فیضان، شیریں اور اشعر ایک آدمی کے ساتھ کھڑے تھے۔

”انکل یہ تو انسانیت کے نائے میرا فرض تھا۔“ اشعر نے جانا مانا ڈائیلاگ مارا۔

”بہت خوشی ہوئی کہ ابھی بھی نوجوان نسل میں ایسے خیالات موجود ہیں۔“ وہ کان لگائے سن رہی تھیں مگر سمجھ میں کچھ بھی نہیں آ رہا تھا اور گائے بگائے ایک دوسرے سے اشارہ کر کے پوچھ رہی تھیں۔

”میں تمہارے پیسے تھوڑے تھوڑے کر کے واپس لوٹا دوں گا۔“ وہ آدمی شکر بھرے لہجے میں بولا۔

”نہیں انکل واپس کرنے کی ضرورت نہیں۔“ اشعر ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

”میں تمہارے احسان کو ہمیشہ یاد رکھوں گا۔ اپنا خیال رکھنا۔“ وہ بول کر شاید چلے گئے تھے بھی بیرونی دروازہ کھلا اور بسمہ کے ماتھے پر زور کا لگا۔

”کون سے پیسوں کی بات ہو رہی تھی۔“ ایمل نے تن کر اشعر سے پوچھا۔

”کسی کی بات کان لگا کر سننا بہت بری بات ہے۔“ اشعر برا منہ بنا کر بولا۔

”اشعر بھائی! جاؤ پہلے ہمارا بکرا لے کر آؤ شیخ صاحب کے گھر سے۔“ منابل نے اپنی ہی ضد کی۔

اشعر نے چورنگا ہوں سے ان سب کو دیکھا۔

”اشعر پہلے تم میرے سوال کا جواب دو۔ بعد میں، میں تم سے بکرے کا احوال بھی لیتی ہوں۔“

ایمل مصنوعی کف اوپر چڑھا کر رعب سے بولی۔

”وہ جو آدمی آئے تھے میں نے کچھ دن پہلے ان کے فادر کی ہیلپ کی تھی۔“

”کیسی ہیلپ؟“

”رات کا ٹائم تھا۔ فٹ پاتھ پر وہ بزرگ گھٹنوں کے بل بیٹھے درد سے کرا رہے تھے۔ میں نے ان کی ہیلپ کی۔ اسپتال لے گیا۔ ٹریٹمنٹ کروایا، انہیں سانس کی تکلیف تھی۔ پھر میں نے ان کے فون سے ان کے گھر والوں کو اطلاع دی تب ان کے بیٹے نے مجھ سے کھڑکا ایڈریس مانگا اور آج خصوصی شکریہ کے لیے چلے آئے۔“ اس نے تفصیل سے بتایا۔ سب کے منہ کھلے رہ گئے۔

اشعر کے جیسا لالہ ابالی ولا پرواہ لڑکا کسی کے کام آئے ایسا کسی نے سوچا نہیں تھا۔

”تم نے کتنے پیسے خرچ کیے؟“ ایمل نے نرمی سے پوچھا۔

”گیارہ ہزار۔“ وہ اس سے چار قدم دور جا کر بولا۔

”کیا اتنے پیسے کہاں سے آئے؟“

”جو تم لوگوں نے بکرا خریدنے کے لیے دیئے تھے۔ وہ پیسے میں نے ان انکل پر خرچ کر دیئے۔“ اس نے ہونٹ بھیج کر کہا۔

کچھ دیر پہلے جہاں سب کو اشعر پر پیار آ رہا تھا اب سب نے آگے بڑھ کر اسے مارنا چاہا۔

”اور وہ بکرا؟“

”بکرا تو شیخ صاحب کا ہے، میں تو کرائے پر پورے دن کے لیے لے کر آتا تھا۔ رات کو سب کے سوتے ہی انہیں دے کر آتا تھا اور پھر دوبارہ صبح کو لے کر آتا تھا۔ شیخ صاحب کا بیٹا ہی میرا یہ کام کرتا تھا۔ بد قسمتی سے کل شیخ صاحب کو پتا چل گیا۔ انہوں



وہ خاموش کھڑا اس کی حرکات و سکنات دیکھ رہا تھا۔ ایمیل کی اس پر نگاہ پڑی تو بوکھلا گئی۔ خود تو مرتضیٰ کے اوپر نہیں گری مگر ہاتھ میں پکڑا برش ضرور مرتضیٰ کے سر پر زور سے جا لگا۔

وہ سر تھام کر چکرا کر رہ گیا۔ وہ گڑبڑا کر نیچے اتری۔ ”سوری۔“ اسے مرتضیٰ سے ڈر لگ رہا تھا۔

”کون سی دشمنی نکال رہی ہو؟ کل پیٹ پر بال اور اب سر پر ڈنڈا۔“ وہ منہ خراب کر کے بولا۔

”اتفاق۔“ اس کے منہ سے پھسلا۔

”واہ بھئی واہ۔“ وہ ہنسا۔ اس کا ہنسا ایمیل کو پریشان کر گیا۔

”منہ پر کل سے باہر کیوں بچ رہے ہیں؟“ اس کے صبح چہرے کو سنجیدگی سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”اشعر نے جھوٹ بولا۔ دھوکا دیا۔“ وہ سر جھکا کر خفگی سے بولی۔

”اس کے جھوٹ بولنے کے پیچھے ایک وجہ تھی۔ تم سب نے پیسے کسی اچھے کام کے لیے اکٹھے کیے تھے اور دیکھو ایک غریب مجبور بزرگ کے کام آگئے۔ یہ کتنی خوش نصیبی کی بات ہے۔ بکرے تو ویسے بھی آجانے ہیں۔“ اس نے پیار و نرمی سے سمجھایا۔

اس کا طریقہ اتنا اچھا تھا کہ ایمیل کو اشعر پر پیار آنے لگا۔ اس نے ایسا سوچا ہی نہیں۔ وہ بس اپنے مفاد کا سوچے جا رہی تھی۔

”چلو تمہیں کچھ دکھانا ہے۔“ وہ باہر کی جانب گیا۔ ایمیل اس کی تقلید میں صحن تک آئی۔ اس کی آنکھیں پوری کھل گئیں سہانے کا منظر دیکھ کر۔

صحن میں تین تھیلے تھے، قد آور بکرے کھڑے تھے۔ سفید، کالے اور براؤن رنگ کے بکروں کو دیکھ کر اس کی خوشی دیدنی تھی۔

”یہ ہمارے بکرے ہیں۔ دیر سویر تو خریدنے ہی تھے۔ تو آج میں نے بابا اور چاچو سے ضد کی۔ تمہاری

ایمل کا جی چاہا اسے کچا چبا جائے۔

”اشعر کے بچے۔“ وہ تایا ابو کے پورشن کی جانب بھاگا۔ ایمیل نے نیچے پڑی بال اٹھا کر کھینچ کر اسے ماری مگر ہائے ری قسمت وہ بال سیدھا جا کر گھر سے نکلے مرتضیٰ کے پیٹ پر جا لگی۔

”آہ.....!“ اچانک آنے والی افتاد پر اس نے پیٹ پر ہاتھ رکھ کر آہ بھری۔

ایمل ہونق بنی کھڑی تھی۔ اشعر نے مرتضیٰ کے پیچھے سے اسے منہ چڑایا۔ باقی سب ہنسی چھپانے کے لیے رخ بدل رہے تھے۔

☆.....☆

جب سے بکرا ہمیشہ کے لیے شیخ صاحب کے ہاں چلا گیا تھا وہ افسردہ ہو گئی تھی۔ نہ وہ اشعر سے بات کر رہی تھی اور نہ سیدھے منہ کسی اور سے۔

تائی امی کا پاؤں ابھی تک مکمل طور پر ٹھیک نہیں ہوا تھا۔ وہ ابھی بھی چل پھر نہیں پار رہی تھیں۔

عید میں دو دن رہ گئے تھے۔ اس نے صبح ہی تائی امی کے ہاں واشنگ مشین لگا دی تھی۔ کپڑے دھل گئے تو اس نے پورے گھر کے جالے اتارنا شروع کیے۔ تمام کمروں اور ہال کے جالے اتارے اور صفائی کرنے کے بعد وہ چن میں چلی آئی۔

ناشتہ کے تمام برتن دھو کر اس نے برش اٹھالیا۔ کچن کی چھت کافی اونچی تھی۔ برش پکڑ کر وہ سلیب پر چڑھ گئی۔

وہ اپنے کام میں مگن رہی۔ مرتضیٰ کچن میں داخل ہوا۔ اسے سلیب پر چڑھے دیکھ کر وہ زیر لب مسکرایا۔

ایمل کی گھر داری، سلجھی طبیعت، ذمہ دارانہ رویہ، ان کچھ دنوں میں اسے بہت کچھ رکھا گیا تھا۔ وہ ہمیشہ اس سے اسی وجہ سے چڑتا تھا کہ وہ ذمہ دار نہیں تھی۔ ہر وقت ہنسی مذاق، لاپرواہی ایمیل اسے غصہ دلا دیتی



خوشی کے لیے۔“ وہ اس کے چہرے پر چھائی خوشی دیکھ کر دھیرے دھیرے بول رہا تھا۔ ایمیل سے کچھ بولا نہیں جا رہا تھا۔

”ایک چاچا کا ہے، ایک بابا کا ہے اور ایک تمہارا۔ آئی مین ہمارا۔“

”ہمارا کون سا ہے؟“ اس نے جھٹ سے پوچھا۔

”وہ سفید والا۔“ اس نے اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔ وہ خوش ہوتے ہوئے سب کو پکار رہی تھی اور وہ اس کی معصوم سی خوشی سے محظوظ ہو رہا تھا۔

☆.....☆

”تمہاری مہندی بالکل بھی اچھی نہیں لگی۔“ اشعر صوفی پر لیٹا انگور کا گھنچا کھاتے ہوئے بولا۔ ایمیل نے اسے گھورا۔

”نہیں اشعر! ایمیل آپ کی مہندی تو بہت اچھی لگی ہے۔ میں نے جو لگائی ہے۔“ مناہل اکڑ کر بولی۔

”خواب ہے یہ تمہارا۔“ اشعر نے شہروز کی طرف آنکھ دبا کر کہا۔

”مار کھاؤ گے۔“ اس نے ہتھیلی پر پھونک مار کر مصروف انداز میں کہا۔

اشعر نے انگور کا خالی گھنچا اس کی جانب اچھالا جو سیدھا جا کر اس کی ہتھیلی پر گرا۔ ایمیل اٹھ کر اس کے پیچھے بھاگی۔ باقی سب بھی ہنستے ہوئے ان دونوں کے پیچھے پیچھے تھے۔

مرتضی نے صحن میں ایمیل کو اشعر کے پیچھے بھاگتے دیکھا تو زیر لب مسکراتا ہوا ستون سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔

”اب کیسا لگا؟“ ایمیل نے اپنی ہتھیلی پر بھی مہندی اشعر کے گال پر لگا دی۔

”امی..... امی.....“ اشعر غصے سے چلا رہا تھا۔ مروتضی کی ہنسی نہیں رک رہی تھی۔

”کیا بدلا لیا ہے۔“ فیضان نے شان میں ہاتھ لہرایا۔

”آئی میری محنت۔“ مناہل کو غصہ آیا۔

”سوری اسے سبق جو سکھانا تھا۔“ وہ مزے سے بولی۔

”اشعر جلدی جا کر منہ دھولو، کل عید ہے اگر رنگ آگیا تو کسی کو منہ دکھانے لائق نہ رہو گے۔“ فیضان پھرتی سے بولا۔

ہنستے ہنستے ایمیل کی نگاہ مرتضیٰ پر گئی۔ وہ جھینپ گئی۔

☆.....☆

سیاہ آسمان پر چاند کی باریک لکیر اس چنچل لڑکی کی شوخی سے ڈوبتی ابھرتی ہنسی۔ چند بکھری زلفیں اور مہندی سے سجے ہاتھ اسے وہ لمحے بہت اچھے لگ رہے تھے۔

مصروف کن رات گزری تو اگلے دن عید کی تیاریوں میں مصروف ہو گئیں۔ وہ سب صبح ہی صبح تیار ہو جایا کرتے تھے۔

ایمیل اور مناہل، بسمہ کو دیکھتے تاپا ابو کے پورشن آئی تھیں۔

تاپا ابو نے سر پر ہاتھ رکھا۔ تائی امی نے بلائیں لیں۔ وہ بسمہ کو لیے صحن میں بکروں کی جانب جا رہی تھیں۔ مرتضیٰ عید کی نماز پڑھ کر واپس لوٹ رہا تھا۔ ایمیل کو دیکھ کر ٹھٹھک گیا۔

”عید مبارک۔“ اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

”آپ سب کو بھی عید مبارک۔“ وہ خوشگوار موڈ میں بولا۔

”چلو! ہم بکروں کو دیکھ کر آتے ہیں۔ ویسے بھی آج ان کا آخری دن ہے۔“ وہ نگاہیں چراتے ہوئے آگے بڑھ گئی۔ صحن میں تینوں بکرے فخر سے کھڑے تھے۔ اس نے انہیں خوشی و مسرت سے دیکھا۔

”یا اللہ! ہماری اس قربانی کو اپنی بارگاہ میں قبول فرماتا۔“ ایمیل نے بکرے کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے دل سے دعا مانگی۔

☆.....☆



افسانہ

## ”یہ اور“

فوراً ”یہ“ کا ناشتہ ٹرے میں منتقل کیا اور بھاگم بھاگم اُن کے پاس جا پہنچے۔ فرط جوش میں آ کر ہم نے ٹرے ان کے سامنے دھری تو انہوں نے ہمیں پہلی بار جی ہاں پہلی بار جی جی جی ہاں زندگی میں پہلی بار بھر پور گھوری سے نوازا۔ ہم تو شرم سے لال سیلے نیلے سب کے سب ہو گئے۔ لبوں پر بے ساختہ ”پہلی بار محبت کی ہے۔ کچھ نہ سمجھ میں آئے میں کیا کروں“ چلا۔ اور فوراً ہی ”آہم آہم“ نے مزہ کر کر کر دیا۔ یہ نہ کبھی نچلے بیٹھتے ہیں اور نہ ہی ہمیں سکون سے بیٹھنے دیتے ہیں۔ ہم نے جلتی کلتی نظروں سے یہ کو باور کرانے کی کوشش کی۔ ہم ان سے نہیں ڈرتے نہ ہمیں ان کی پروا ہے۔ مگر یہ کیا؟ یہ کی آنکھوں کی کٹوریاں تو لبالب سمندر سے بھری ہوئی تھیں۔ ہمیں خود پہ بے تحاشہ غصہ آیا۔ یہ تو ہمارا ان سے التفات دیکھ کر فوراً ہی واک آؤٹ کر گئے مگر جاتے جاتے ہم پر گھڑوں پانی پھیر گئے۔ ہم شرمندگی کے اتھاہ سمندر میں غوطے ڈبکیاں لگاتے اپنی ان کے یہاں موجودگی عذر، بہانہ جواز سب تلاشنے لگے مگر بے سود ہائے رے قسمت ہم بھاگتے دوڑتے گھر پہنچے تو یہ ناراض صورت سامنے بیٹھے تھے۔ دور کہیں سے ”جا بے وفا جا ہمیں پیار نہیں کرنا“ بج رہا تھا۔

ابھی ہم ٹھیک سے خود کو چھوڑیشن میں ڈھال بھی نہ سکے تھے کہ فوراً یہ آہم آہم کرنا شروع ہو گئے۔ مجھے کبھی کبھی شک ہوتا ہے کہ یہ مولوی ہیں مگر کبھی نماز نہیں پڑھتے پھر نہ جانے کیوں گانوں سے خدا واسطے

جب سے ”وہ“ ہمارے پڑوس میں آ کر آباد ہوئے ہیں تب سے ”یہ“ ہم سے روٹھے روٹھے سے ہیں۔ میں بھی کیا کروں میرا ان پر دل آ گیا اور پھر سے کہتا..... میرا ”ان“ پر دل آ گیا۔ ابھی ہم یہ گانا گنگنا ہی رہے تھے کہ یہ آگئے اور آہم آہم کر کے سارا مزا کر کر کر دیا۔ خیر ہم بھی ہم ہی ہیں۔ ایک دن جب بھری دوپہر کو ”یہ“ گھوڑے گدھے سب بیچے سو رہے تھے تب ہم چکے چکے اُن کے دیدار کی خاطر پڑوس کی جانب ٹھکنے لگے۔ کھسک کر اس لیے جا رہے تھے کہ مبادا یہ جاگ نہ جائیں اور ہم ان کے دیدار سے محروم نہ رہ جائیں۔ جیسے ہی ہم نے ان کی جھلک دیکھی ہم خوشی سے دیوانے ہی تو ہو گئے اور جھوم جھوم کر بھنگڑا ڈالنے لگے یا شاید لڈی ڈال رہے تھے یا پھر شاید ہپ ہاپ او ہو دیکھی ہماری دیوانگی؟ ہمیں تو ٹھیک سے اپنا ڈانس فارم بھی یاد نہیں بس یاد ہے تو وہ بول جو ہم گنگنا رہے تھے۔ ایسی دیوانگی دیکھی نہیں کہیں میں نے میں نے..... دیوانہ اپنا نام رکھ لیا.....

”آہم آہم لو جی پہنچ گئے سر پہ..... پھر سے سارا مزہ کر کر ہو گیا۔ پتہ نہیں یہ سمجھتا کیوں نہیں کہ دل پہ کسی کا زور نہیں چلتا بلکہ دل تو بے بس ہوتا ہے۔ کسی کو دیکھ کر آہیں بھرتا ہے کسی کی شان میں دن رات مدح سرا رہتا ہے۔ اب آپ لاکھ سمجھائیں مگر سنتا کہاں ہے بھئی مگر یہ کب سمجھیں گے اس بات کو؟ ایک دن یہ اپنا پسندیدہ ناشتہ تناول فرما رہے تھے کہ ان کی آواز سن کر ہم پر ایک بار پھر سے دیوانگی کا غلبہ چڑھا۔ ہم نے





READING  
Section





کابیر رکھتے ہیں۔ ابھی ہم یہ کو منانے کی کوئی ترکیب دماغ کے گھوڑے سرپٹ دوڑا کر معلوم کیا ہی چاہتے تھے کہ یہ نے ہم سے منہ پھیر لیا۔ یہ کے اس انداز پر ہمارا تو دل ہی کٹ کر رہ گیا۔ ہم نے یہ کے لیے دوبارہ ناشتہ بنایا اور وہ مزے سے سب بھول بھال کر ناشتے میں مصروف ہو گئے مگر ہمارا ننھا سا، نازک سا، نفیس سا اور آگینہ سا دل یہ کے اس درجے بے رخی برتنے پر ٹوٹ سا گیا اور دل بے اختیار پکار اٹھا۔ ”دل کا کھلونا ہائے ٹوٹ گیا۔ کوئی لٹیرا آ کے لوٹ گیا۔ دل کا کھلونا ہائے ٹوٹ گیا۔“

”آہم آہم۔“ جی ہاں ہماری توجہ مانگی جا رہی تھی مگر اب ہم نے بھی سوچ لیا تھا کہ ہم یہ کو گھاس بھی نہ ڈالیں گے۔ جب ہم نے روتے منہ بسورتے اپنا حتمی اور فائنل فیصلہ اماں کے گوش گزار کیا تو وہ کھی کھی منہ میں دوپٹے ٹھونس کر بہنے لگیں۔

ہم ہونقوں کی طرح منہ کھولے ٹکر ٹکران کی سن موٹی صورت دیکھنے لگے مگر مجال ہے جو کھی کھی کو بریک لگا ہو یا توجہ کے ارتکاز میں رتی برابر بھی کمی واقع ہوتی ہو۔ ہمارے تو گویا تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔ کانوں سے غصہ کے مارے دھواں برآمد ہونے لگا۔ (میرے خیال سے دھواں درآمد ہونے لگا) خیر جو بھی ہوا مٹی پاؤ جی..... ہم غصے سے پیر پٹختے واک آؤٹ کر گئے۔

ابھی ہم نے اپنے کمرے کی دہلیز پر قدم دھرے ہی تھے کہ ”آہم آہم“ کی مخصوص آواز سنائی دی۔ ہم نے جلے دل کے پھیپھولے پھوڑتے ہوئے کہا کہ ہم کچھ نہیں گنگنا رہے۔ سبھی کہیں سے ہمارے آج کل کے فیورٹ گانے کی صدا سنائی دی۔ ”من جاوے مینوں شاپنگ کرادے۔ من جاوے مینوں پکچر دکھا دے، ریکویسٹاں پائیاں وے۔“ ہم نے دیدے گھما کر دیکھا تو یہ ٹیبلٹ پکڑنے بیسی کی نمائش کرتے نظر آئے مگر اتنی آسانی سے ہم بھی نہیں ماننے والے۔ سو

ہم بھی سوخڑے دکھاتے کمرہ بند کر کے منہ لپیٹے سو گئے۔ دو گھنٹے بعد ہمارے چھوٹے بھائی عرف بی بی سی نیوز ہمیں جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر اٹھانے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ ہم حواسوں میں لوٹے بھی نہیں تھے کہ بی بی سی نیوز نے ہمیں ایک دل دہلا دینے والی خبر سنانے کا آغاز کر دیا۔

”باجی..... باجی.....“

”آگے بھی پھوٹ بی بی سی کے بچے۔“ ہماری جھلاہٹ نیند خراب ہونے پر عروج پر تھی۔

”باجی باجی وہ ناں.....“

”اب میرے ہاتھوں قتل ہو جائے گا، پھر دیتے رہنا اپنی موت کی خبر سب کو۔“ میرے دھمکانے کا خاطر خواہ اثر ہوا اور وہ ایک ہی سانس میں بولتا چلا گیا۔

”باجی! اپنا D. J. بھاگ گیا۔“

”کیا؟“ ہم نے دل پر ہاتھ رکھ کر دھڑکنوں کو کنٹرول کرنے کی کوشش کی۔

”ہاں باجی! وہ ناں، D. J. ناں۔“

ہم نے اس کی کمر پر کس کے دھموکا جڑا تو وہ دزدیدہ نظروں سے ہمیں گھورتے ہوئے سرپٹ بولنے لگا۔

”D. J. ناں اپنا رسہ تڑوا کر بھاگ گیا۔ بڑے بھائی جان نے ان کے آگے گھاس رکھی تھی۔ اماں کہہ رہی تھیں کہ عروسہ تو اب D. J. کو گھاس نہیں ڈالے گی اسی لیے بھائی جان نے اسے گھاس ڈالی پھر مجھے کہا کہ D. J. کو شہلا لاؤ۔ میں نے جیسے ہی رسہ کھولا وہ سرپٹ دوڑتا چلا گیا۔ بھائی جان اس کے پیچھے پیچھے گئے ہیں۔“ بی بی سی اپنا نیوز بلٹن ختم کرتا چلا بنا اور ہم اپنا دل تھام کر بیٹھ گئے۔

”یا اللہ! رقابت کی آگ نے یہ کیا گل کھلایا۔ ہمیں D. J. سے بے رخی نہیں برتنی چاہیے تھی اور ان سے تو باقاعدہ پردہ کرنا چاہیے تھا۔ یا اللہ ہمارا D. J. ہمارا قربانی کا بکرا ہمیں لوٹا دیجیے۔ مولا! ہم وعدہ کرتے



رواڈ انجسٹ میں شائع ہونے والے مقبول ناول  
کتابی شکل میں شائع ہو گئے ہیں

تم میرے ہو کے رہو

صالح محمود

قیمت 600/- روپے

کچی کلیاں آنکھن کی

صالح محمود

قیمت 600/- روپے

کبھی عشق ہو تو پتہ چلے

مصطفیٰ عمران  
شازیہ

قیمت 550/- روپے

کچھ عشق میں رنگ جنوں بھی تھا

نائلہ طارق

قیمت 500/- روپے

القریش پبلی کیشنز

سرکلر روڈ چوکے اردو بازار لاہور

فون: 042-37652546, 37668958

ویلم بک پورٹ اردو بازار کراچی

فون: 021-32633151

ہیں اس بار انہیں شکایت کا کوئی موقع نہیں دیں گے۔  
آنسو بے اختیار ہمارے گال بھگو رہے تھے۔ کافی  
وقت گزر گیا تھا اور ہمارا دل گنگنا نے کو چل رہا تھا۔  
”انتہا ہو گئی انتظار کی۔ آئی ناں کچھ خبر میرے  
D.J کی۔“

”آہم، آہم..... آہم۔“ مخصوص آواز پر ہم چونک کر  
اچھل پڑے تبھی بی بی بی نے آ کر بتایا۔  
”D.J آ گیا۔ D.J مل گیا۔“

بے اختیار ہم لہرا کر گنگنا نے لگے۔ ”D.J مل  
گیا۔ D.J مل گیا۔ مجھ کو کیا ہوا ہے کیوں میں کھو گئی  
ہوں۔ پاگل ہی میں پہلے یا اب ہو گئی ہوں۔“  
”آہم، آہم۔“ مولوی بکرے کی گونج دار آواز نے  
ہماری گنگنا ہٹ کو فوراً سے پیشتر خاموش کر دیا۔

ہم تابعدارانہ انداز میں پھر سے D.J کی خدمت  
گزار رہی میں بخت گئے۔ اب ہم پڑوسیوں کے بکرے  
کی طرف نظر اٹھا کر دیکھتے بھی نہیں ہیں۔ اگر ان کا  
بکرا خوب صورت ہے تو کیا ہوا؟ ہمارا بکرا ہمارا D.J  
بھی کوئی کم خوب صورت نہیں ہے اور ویسے بھی D.J  
اللہ کی راہ میں قربان ہونے چاہا ہے اسی ایک وصف  
کی بنا پر D.J کی خوب صورتی چاند کو مات دینے والی  
ہے۔ ویسے D.J کی جدائی کا سوچ سوچ کر ہمارے  
ذہن کی اسکرین پر ایک ہی نغمہ سر بکھیرتا ہے۔

پچھڑے ابھی تو ہم بس کل پرسوں  
جیبوں کی میں کیسے اس حال میں برسوں  
ہائے بسی جدائی

چار دنوں کا ساتھ اور با بڑی بسی جدائی  
بسی جدائی

”آہم، آہم۔“ اف نہ جانے D.J میری سوچ  
کیسے پڑھ لیتا ہے۔ ہم ہمیشہ یہ کتھی سلجھاتے سلجھاتے  
خود ہی الجھ جاتے ہیں۔ ”بسی جدائی۔“  
”آہم، آہم۔“ اف مزہ کر کر کر دیا۔

.....☆.....

READING  
Section



افسانہ

# انجمن



READING  
Section



قاسم ملک تخت پر بچھے لال قالین پر کسی بادشاہ کی طرح براجمان تھا۔ میڈیا والے اس کے گرد گھیرا ڈالے اس کی شان میں سوالات کرتے اس کے فخر و غرور کو اور بھی ہوا دے رہے تھے۔ لوگوں کا ہجوم اس قدر تھا کہ کندھے سے کندھا ٹکرا رہا تھا۔ برقی قمقموں سے سجاٹینٹ اس کے لائے گئے قربانی کے جانور کی شان بڑھا تھا۔ سفید چاندنی نیل جو دراز قد و قامت اور صحت مندی کے باعث ہر ایک کو حیران کیے دے رہا تھا۔ اس پر گوٹے سے مزین لال چادر اور لال چمکتا تاج اسے سب میں شہزادے کا روپ دے گیا۔ اس کی شہرت کے چرچوں سے لوگ دور دراز سے دیکھنے کے لیے کھینچے چلے آ رہے تھے۔ اس کی لاکھوں کی قیمت سن کر لوگوں نے منہ میں انگلیاں داب لی تھیں۔ چاندنی نیل ادھر ادھر گردن گھماتا اپنی شان و شوکت سے قطعاً بے نیاز تھا لیکن اس کا مالک فخر و غرور سے یوں بیٹھا تھا جیسے اصل شہزادہ وہی ہو۔ میڈیا والوں اور لوگوں نے کھچا کھچ بیل کی تصویریں اتارنا شروع کر دیں، جس پر حسرتوں سے بھرے دل صرف اسے دیکھ کر ہی اپنی حسرتوں کو تسکین کر پائے تھے اور ہر سال کی طرح پورے علاقے میں قاسم ملک کا جانور سب پر سبقت لے گیا تھا اور قاسم ملک کا سہرا ایک بار پھر فخر سے اونچا ہو گیا تھا۔

☆.....☆

”فیروز!“ قاسم ملک نے شیر کی سی دھاڑ سے اسے پکارا تھا اور وہ چونک کر پلٹا تھا۔

”جی تایا ابا!“ وہ فوراً تیزی سے آیا تھا اور مودب لہجے میں بولا تھا۔

”ہاں بھئی پھر کیا جانور لیا تو نے اس بار؟“ وہ مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے طنزیہ زیر لب مسکراتے ہوئے بولا۔ کم مائیگی کے احساس سے اس نے کچھ نہ بولا۔

”ابو! یہ جانور لاتا تھوڑی ہے پالتا ہے۔ وہ بھی چھوٹا میمنسا سا بکرا۔۔۔۔۔ ہا ہا ہا۔“ قاسم ملک کا سولہ سالہ بیٹا مسخر اڑاتے ہوئے بولا۔ وہ سب بھی مسکرا دیے۔

”اچھا! جا پھر لے کر آ اسے، میں بھی تو دیکھوں کیسی

کھلائی پلائی کی ہے تو نے اس کی۔“ انہوں نے حکم صادر کر دیا لیکن اس کا مجنم وجود نہ ہلا۔ پتا تھا آگے کیا ہونا تھا۔ ”جا بھی۔“ اسے یونہی کھڑا دیکھ کر انہوں نے اس کے کندھے پر دھمو کہ لگاتے ہوئے بے رحمی سے کہا۔ چار و ناچار تھوڑی دیر میں وہ جھکے سر کے ساتھ اپنے دل جان کے ٹکڑے کو لے آیا۔ قاسم ملک نے عمیق نگاہوں سے اس پست قامت کے کمزور سے بکرے پر نظر ڈالی تھی۔ جس پر فوراً ہی ان کا قبہ قبہ چھوٹ گیا تھا۔

”اوائے بے چارے کو کچھ تو ڈھنگ سے کھلائی پلائی تو کراتا، یہ تو تجھ سے بھی گیا گزرا ہے۔۔۔۔۔ بدو۔“ ان کے تمسخر اڑاتے انداز پر ارد گرد جمع بچے بھی ہنسنے لگے تھے۔ اس کی آنکھیں فوراً پانی سے بھیک گئیں تھیں۔

”بدو۔۔۔۔۔ بدو۔۔۔۔۔ فیروز کا بکرا بدو۔۔۔۔۔“ بچے اس کے گرد منڈلاتے اسے چرانے لگے۔ اس سے وہاں کھڑا ہونا دو بھر ہو گیا تھا۔ اس سے پہلے آنکھوں کی پتلیوں میں سیر تاپانی سب کے سامنے بہہ جاتا، وہ وہاں سے دوڑا چلا گیا۔ پیچھے سے تمسخر اڑاتے قبہ قبہ اس کے دل کو چھلنی کر گئے۔

☆.....☆

وہ چھت پر بیٹھ رات کے پہر دور آسمان پر نظریں جمائے خلاؤں کو گھورتا غم سے نڈھال لگ رہا تھا۔ چاند رات کی بہاریں یوں تو آج عرش پر اتری ہوئی تھیں لیکن وہ سب سے بے نیاز زندگی کی تلخیوں کو چننے میں لگا ہوا تھا۔ پندرہ برس کی عمر میں زمانے کی اس میں اترتی کڑواہٹ نے اسے کچھ جلد ہی بڑا کر دیا تھا جس عمر میں بچے کھیلتے کودتے تھے، اس عمر میں وہ بیٹھا تلخ حقیقتوں سے لڑ رہا تھا۔ جب تک ابا زندہ تھے تو مجال تھی کوئی اس پر انگلی بھی اٹھا پاتا لیکن تھمی کے سائے نے جو حقیقت کی بینائی عطا کی اسے اتنی کم عمری میں قربانی بڑی جوش و خروش سے منائی جاتی تھی لیکن ان کے بعد بیوہ ماں جو سلاسیاں کر کے مشکل سے اسے پال پوس رہی تھی، وہ اسے بڑا جانور کہاں سے لا کر دیتیں اور اسے بڑا جانور چاہیے بھی نہیں تھا۔ اسے تو بس خواہش ہوتی تو اس بات کی کہ عید کے روز اس کے گھر بھی



قربانی ہو اور بیوہ ماں نے اس کی یہ خواہش ادھوری کبھی نہ چھوڑی تھی۔ جیسے تیسے کر کے وہ سال بھر پہلے ہی چھوٹا سا بکرا لے آتی۔ جس کی سالہا سال خدمت کر کے وہ قربان کرتے اور وہ اس میں بھی بڑا خوش تھا اور ایسے میں اپنوں کی مذاق اڑاتی نظریں اس کے حوصلوں کو پست کر دیتے۔ آج اس کا دل بڑی شدت سے چاہتا تھا کہ ابا کہیں سے آجائیں اور وہ ان کے گلے لگ کر سارے غم مٹا دے۔ شدت غم سے اس کی آنکھوں سے تو اتر سے آنسو بہہ گئے جنہیں اس نے بڑی بے رحمی سے پونچھ ڈالا تھا۔

☆.....☆

عید کی جگمگاتی صبح کا سورج جونہی طلوع ہوا ہر طرف خوشیوں کی نورانی بارش برسنے لگی تھی۔ گائیں بیل آخری لمحوں کی کیفیت میں ڈکارنے لگے تھے اور بچے اس لمحے کو ضائع کیے بنا ان کی خدمت میں جتے ہوئے تھے۔ جب کہ بڑوں نے عید گاہ کی جانب نماز کی ادا کی کے لیے رخ باندھا۔ وہ بھی نہاد ہو کر نماز کے لیے چل دیا تھا۔ عید کی پر نور صبح نے اس کے بھی غموں کو سلب کر لیا تھا۔ خوشی کی چمک آج اس کے چہرے پر بھی نمایاں تھی۔ شاید یہی زندگی تھی جو دکھوں کے بعد خوشی سے جینے کا گر بھی سکھا دیتی ہے۔ نماز کے بعد قربانوں کا فریضہ دیئے جانے لگا تھا۔ وہ بھی اپنے ناز سے پلے بکرے کو اللہ کی راہ میں قربان کرنے کے لیے باخوشی تیار تھا۔

پھر قربانی کے بعد ماں گوشت کے حصے بناتی۔ اسے پیکٹ تھماتی جا رہی تھی اور وہ بھی جوش و خروش سے سارے کام انجام دے رہا تھا۔ ہر کام خیر و عافیت سے انجام پا گیا تھا لیکن تایا ابا کے گھر کی طرف بڑھتے قدم ایک بار پھر کمزور ہو گئے۔ پر آخر کو چلا ہی گیا۔ تایا ابا کے گھر کے باہر لوگوں کا ہجوم قابل دید تھا۔ وہ سمجھ گیا چاندنی بیل کی قربانی نے لوگوں کو اپنی جانب متوجہ کروا لیا تھا۔ وہ بھی بھیڑ کو چیرتا اندر گھسنے میں کامیاب ہو ہی گیا لیکن دوسرے ہی پل سامنے کے منظر نے اسے سکتے میں مبتلا کر دیا تھا۔ چاندنی بیل قربان ہونے سے پہلے ہی مر گیا۔ اس کا زمین پر پڑا مردہ وجود ہر ایک کو حیران کر گیا تھا۔ اچھا خاصا اڑیل صحت مند بیل

کیسے ختم ہو گیا۔ یہ بات سب کی سمجھ سے باہر تھی۔ اس نے تایا ابا کو دیکھا جو سر تھامے بیٹھے تھے اور ان کے سولہ سال بٹے کارور کر برا حال تھا۔ اسے وہ پل یاد آیا تھا جب اس کے بھی آنسو اپنے جانور کے لیے یونہی درد سے بہے تھے لیکن بس فرق اتنا تھا وہ اپنا درد چھپا گیا تھا۔ جب کہ وہ بے چین ہو کر چھپانہ پایا تھا۔ لوگوں کی چہ میگوئیوں نے تایا ابا کے بلڈ پریش کو اور بھی اوپر چڑھا دیا تھا۔ وہ مزید وہاں ٹھہر نہ پایا۔ سیدھا گھر پلٹ گیا اور آ کر چپ چاپ ایک کونے میں خاموش سا بیٹھ گیا۔ آگہی کا لمحہ تھا کہ معصوم عقل دنگ تھی۔ خدا کی محبت اور جلال کو آج اس نے بڑے قریب سے محسوس کیا تھا۔ اللہ سے ڈرنے والے یقیناً گمراہ نہیں ہوتے اور نہ ڈرنے والے ہمیشہ رسوا ہوتے ہیں۔ یہ بات سمجھنے کو اس کی عمر کم تھی لیکن زندگی نے اسے کچھ اس طرح دکھایا تھا کہ اس کے لیے کچھ سمجھنا مشکل نہ رہا تھا۔

سکینہ سے یوں گم صدمہ دیکھ کر چونکی تھیں اور پھر پوچھے بنا نہ رہ پانی تھیں۔

”امی! تایا ابا کا جانور قربان ہونے سے پہلے ہی مر گیا ہے۔“ جس کا جواب اس نے بہت ٹھہرے لہجے میں دیا تھا۔ آگے سے وہ حق دق سی رہ گئی تھیں۔

”امی! کیا اللہ تعالیٰ نے تایا ابا کی قربانی قبول نہیں کی؟“  
”ایسا نہیں کہتے فیروز۔ ہم نہیں جانتے کیا سچ ہے اس لیے کسی کی آزمائش کے وقت تنقید کرنے کا حق انسان کے پاس نہیں ہے۔“ آگے سے اس نے فوراً ٹوک دیا۔

”امی! یہ میں نہیں وہاں کھڑے لوگ بول رہے تھے۔“  
اس نے بھی فوراً وضاحت دی۔

”جو بھی ہو بس تم کچھ مت کہنا۔ یہ قدرت کے کام ہیں وہی بہتر جانتا ہے۔“ آگے سے وہ اثبات میں گردن ہلا گیا۔

”کچھ گوشت باقی رہ گیا ہے بانٹنے والا جلدی آؤ تاکہ یہ کام ختم کر سیں۔“ وہ اسے بوٹی ہوئی باہر نکل گئیں اسے سب سمجھ آ گیا تھا لیکن وہ انجان بن گئیں۔ بس پتا تھا تو اتنا اللہ جسے چاہے جیسا صلہ دے پر یقین رکھتے ہوئے یہ ضرور

معلوم تھا، اللہ تکبر کرنے والوں کو کبھی پسند نہیں کرتا۔ ☆



# افسانہ یہ وطن سارا ہے

”عبدالباری یہ کیا کر رہے ہو تم؟“ وہ سہ پہر دروازے سے اندر گھسا تھا اور چھوٹے سے کچے کچن میں بھی رنگ برنگی جھنڈیوں کو نوچ کر پھینک رہا تھا۔ جب کچن سے نکلی مریم مڑ کر اس کے پاس آئی تھی اور اس کا کالر کھینچتے تیز لہجے میں بولی تھی۔

”شٹ اپ۔“ عبدالباری اس کے ہاتھوں سے

اپنی شرٹ کا کالر نکالتے اس پر غرایا تھا۔

”اتنی محنت سے میں نے اتنی تیز گرمی میں سارا دن لگا کر جھنڈیاں لگائی تھیں اور تم نے لمحے میں میری سارے دن کی محنت پر پانی پھیر دیا۔“ وہ زمین پر پڑھی جھنڈیوں کو دیکھتے نم آنکھوں سے ماتھے پر ڈھیروں شکنیں لیے سرخ ڈوروں والی اس کی آنکھوں



READING  
Section



”ہاں آزادی کا دن بہت سکھ دیا ہے اس آزاد وطن نے ہمیں جو تم اس کی آزادی کا جشن منانے کو اتا ولی ہو رہی ہو۔“ وہ طنز یہ ہنسا تھا۔

”آج انٹرویو کیسا رہا؟“ مریم نے اس کے طنز کو نظر انداز کر دیا تھا۔

”انٹرویو تو ہر دفعہ ہی بہت اچھا ہوتا ہے مگر اس کے آگے کچھ اچھا نہیں ہوتا۔“

میری طرح آج بھی اور بہت سے مفلسی کے مارے غربت کے ستارے نہ جانے کتنے بڑھے لکھے

پوزیشن ہولڈرنو جوان موجود تھے جن کی آنکھوں میں اس جا ب کو حاصل کر لینے کی خواہش چھپی تھی مگر پھر

ہر دفعہ کی طرح انٹرویو کی فارمیٹی پوری کی گئی اور پھر اناؤنس منٹ کہ اسٹنٹ میجر کی پوسٹ کے لیے

انتخاب ہو چکا ہے۔ آپ لوگ جا سکتے ہیں اور مفلسی و غربت کے ستارے بے چارے وہاں جا ب کی

خواہش لیے نا امید ہو کر چلے گئے۔ یہ حال ہے ہمارے اس ملک کا ہر جگہ بد حالی و غربت و افلاس کے

ستارے لوگ ہر پرومیشنل میں کرپشن جہاں لوگ پیسے کے پجاری ہیں۔ جن کی بدولت قابل پوزیشن ہولڈر

لوگ سڑک پر مزدوری کرتے ہیں اور انکوٹھا چھاپ اے سی میں بیٹھ کر حکم چلاتے ہیں۔ میرا تو دل اچاٹ

ہو گیا ہے اس ملک میں بد حالی و کرپشن کو دیکھ دیکھ کر اور ویسے کبھی کیا فائدہ ایسے علیحدہ وطن کا جو ہمیں کچھ نہ

دے سکے۔“ اس کے لہجے میں مٹی کے ساتھ ساتھ آرزوگی بھی موجود تھی۔

”اور ہاں آج کے بعد اس طرح کا کوئی تماشا مت لگانا۔ ویسے بھی جو ملک ہمیں کچھ نہ دے سکے، اس کی آزادی منانے کا بھی کوئی فائدہ نہیں۔“ وہ حد

درجہ لہجے میں بولا تھا۔

”بدگمان ہونے کی بھی کوئی حد ہوتی ہے عبدالباری! یہ ہمارا وطن ہے ہمارا اسلامی ملک ہمارا

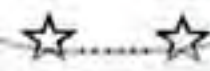
”مجھے یہ دیکھا واپس نہیں ہے اور آج کے بعد اس طرح بچوں والے شوق میرے سامنے میرے گھر میں مت پالنا، کوئی ضرورت نہیں ہے میرے گھر کو ان

جھنڈیوں سے سجانے کی۔“ وہ آگ اگلتے لہجے میں کہتا لہے لہے ڈگ بھرتا جیسے گھر میں آیا تھا۔ ویسے ہی

باہر نکل گیا تھا۔ پیچھے وہ بند دروازے کو دیکھتی رہ گئی تھی۔ پھر آنکھیں صاف کرتی زمین پر پڑی پھٹی ہوئی

جھنڈیوں کو اٹھا کر اس نے آنکھوں سے لگا کر چوما تھا۔ بے اختیار ہی اس کی آنکھوں سے دو موتی نکل کر

جھنڈیوں میں گم ہو گئے تھے۔ عبدالباری جتنا بدگمان تھا مریم اتنی محبت وطن تھی۔



وہ رات تقریباً ڈیڑھ بجے کے قریب دوبارہ گھر آیا تھا۔ مگر گھر میں داخل ہوتے ہی اس کے ماتھے پر

لا تعداد بل نمودار ہوئے تھے۔ چھوٹا سا صحن ایک مرتبہ پھر رنگ برنگی جھنڈیوں سے سجا تھا۔ اس کا دل جل کر

خاک ہوا تھا۔ دل میں بدگمانی کچھ اور بڑھی تھی۔ وہ صبح مریم کی خبر لینے کا سوچتا ایک نظر صحن میں بے خبر سوئی

اپنی بیمار ماں پر ڈالتا اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا تھا۔ وہ بیڈ پر بیٹھا شوز کے کیس کھول رہا تھا کہ جیسی

مریم کھانے کی ٹرے ہاتھوں میں تھامے اس کے کمرے میں آئی تھی۔

”میرے منع کرنے کے باوجود تم نے یہ جھنڈیاں دوبارہ کیوں لگائیں۔“ وہ جوں ہی چھوٹی ٹیبل پر

ٹرے رکھ کر گھومی پیچھے کھڑے عبدالباری نے اس کا بازو بوج کر خونخوار لہجے میں بولا تھا۔

”میرا بازو چھوڑو باری! مجھے درد ہو رہا ہے۔“ وہ نم ہوتے لہجے میں بولی تھی۔

”سہلے مجھے جواب دو۔“ وہ بھی اسی سرد لہجے میں بولا تھا۔

”کل چودہ اگست ہے ہماری آزادی کا دن ہے تو اس لیے میں نے جھنڈیاں لگائیں۔“ وہ جلدی سے



پاکستان ہے، جہاں ہم آزادی کے ساتھ اس کی فضا میں کھلی سانس لے سکتے ہیں۔ آزادی سے اپنی مرضی سے اپنے اللہ اور اس کے رسول کا نام لے سکتے ہیں۔ جہاں ہم خوشی خوشی پوری آزادی اور مرضی سے اپنا ہر تہوار منا سکتے ہیں۔ آزادانہ اسلامی تعلیم حاصل کر سکتے ہیں۔ جہاں مسجدوں میں بنا کسی خوف کے لاؤڈ اسپیکر میں اذان دی جاتی ہے، اس ملک نے ہمیں ہماری پہچان دی ہے دنیا بھر میں لوگ ہمیں پاکستانی کہہ کر پکارتے ہیں۔ ہم پاکستانی ہیں ایک آزاد ملک کے شہری، ہمارے لیے تو یہی بڑے فخر کی بات ہے، آزادی ایک بہت بڑی نعمت ہے آزادی کی اس روشن صبح کے لیے ان گنت قیمتی جانوں کی شام ہوئی ہے۔ ہجرت کے باب میں مصائب و قربانیوں کی دھراں داستانیں رقم ہیں۔ لاکھوں لوگوں کا لہو اس سر زمین کی آزادی کے لیے پانی کی طرح بہایا گیا ہے۔ لوگوں نے اپنے بے حد پیارے عزیز رشتوں کو خون میں لت پت تڑپتے دیکھا ہے۔ ہزاروں لوگوں کے قیمتی خون کی دردناک داستانیں رقم ہوئی ہیں جب کہیں جا کر ہمیں ایک آزاد اسلامی ملک پاکستان کی صورت ملا ہے۔ آزادی ایک بہت بڑی نعمت ہے۔ جس کے لیے ہمارے آباؤ اجداد نے اپنی جانوں کی بہت بڑی قیمت ادا کی ہے۔ یہ تو ہم لوگ ہی اس قابل نہیں تھے کہ ہمیں ایک آزاد اسلامی ریاست پاکستان کی صورت ملتی، ہمارے بزرگوں نے اور ہمارے پیارے قائد محمد علی جناح نے تو بڑے پیار خلوص اور نیک نیتی سے پاکستان کی بنیاد رکھی تھی، پھولوں کی طرح مہکتا گلشن دیا تھا اس میں رشوت، سفارش، لوٹ مار، خون خرابہ، کرپشن کا گہن تو ہم جیسے بے ضمیر لوگوں نے لگایا ہے آزادی ایک نعمت ہے اور یہ ہمارے لیے خدا کی رحمت ہے، جس کی حفاظت کرنا ہم سب کا اولین فرض ہے۔ گو کہ تحریک پاکستان کے دوران جو خواب دیکھے تھے۔ وہ ابھی پورے ہونا باقی ہیں اگر 1947ء کا

جذبہ ایک بار پھر ہم لوگوں میں بیدار ہو جائے تو ہم اپنے بازوؤں کی طاقت سے کھنور میں پھنسی کشتی کو نکال سکتے ہیں۔ اتنا کچھ دیا ہے آپ کو اس ملک سے ایک دولت کی فراوانی نہیں ملی تو اس ملک کی دی ہوئی ہر نعمت سے منکر ہو گئے اور بہت خودار بنتے ہیں ناں تو آپ کیوں نہیں کچھ کرتے اس ملک کے لیے، یہ وطن آپ کا اپنا ہے آپ کا بھی فرض بنتا ہے کہ اپنے طور پر اس کی بہتری اور ترقی کے لیے کچھ کریں، زیادہ نہ سہی کوئی ایک چھوٹا سا کام ہی کر لیں جو وطن کے لیے آپ کا حق ادا ہو جائے۔“ وہ بولی تو ایک تو اتر سے بولتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ اس کا گلارندھ گیا تھا اس کی اتنی لمبی تقریر کے جواب میں عبدالباری سر جھکائے زمین کو گھورتا رہا تھا۔ ایک لفظ بھی نہ بولا تھا۔

”میں بھی پاگل ہوں جو ایک پتھر سے سر پھوڑ رہی ہوں۔“ وہ بے حس کھڑے عبدالباری پر ایک نظر ڈالتے تیزی سے جانے کو پلٹی تھی کہ اس کی نازک کلانی عبدالباری کی گرفت میں مقید ہوئی تھی۔

”سوری آئندہ خیال رکھوں گا، بے روزگاری نے کچھ زیادہ ہی بدگمان کر دیا اپنے اس پیارے وطن سے تم ٹھیک کہتی ہو مریم! آزادی ایک بہت بڑی نعمت ہے اور انشاء اللہ پوری کوشش کروں گا کہ اپنے اس پیارے وطن کے لیے اپنے طور پر ہم کچھ کر سکیں لیکن تمہیں میرا ساتھ دینا ہوگا۔“ وہ اس کی روئی روئی آنکھوں میں دیکھتا دھیرے سے دلکشی سے مسکرایا تھا۔

”میں ہمیشہ تمہارے ساتھ ہوں عبدالباری۔“ وہ بھی دھیرے سے مسکرائی تھی۔

دیے سے دیا جلتا ہے اور پھر سارے دیے روشن ہو جاتے ہیں۔ مریم نے اپنے حصے کا حق ادا کر دیا تھا۔ اس نے ایک دیا روشن کر دیا تھا اور انشاء اللہ ایک ایک کر کے سارے دیے روشن ہو جائیں گے اور ہمارا یہ پیارا ملک ایک دن ضرور امن و امان اور خوش حالی و ترقی کی طرف گامزن ہوگا۔ ☆



افسانہ

## دل کی رکیں

جس میں آپ کو باندھا جاتا ہے۔“ رہبان کی برداشت جواب دے گئی تھی۔  
”ہاں تو کیا ہوا کسی کے کام آرہی ہوں۔ آپ کی طرح چوری نہیں کرتی۔“ اتبغ کے خاک پہلے نہیں پڑا تھا اور ہادی ہنس پڑا تھا۔ اب رہبان کی ہنسی بھی لازمی تھی۔  
”بھائی ابو سے شکایت کروں گی آپ کی اور آپ کے دوست کی۔“ وہ بکرے کی رسی تھامے مڑ گئی تھی جو بڑے مزے سے ان کی بحث کا فائدہ اٹھا کر لان کی گھاس کھا رہا تھا۔

”اتبغ! یہ بکرا رہبان کا ہی ہے۔ اصل میں ہم دونوں نے ایک ساتھ بکرے لیے تھے، جو جڑواں تھے مگر تم غور سے دیکھو ہمارے بکرے کے سیدھی طرف کالا نشان ہے اور اس کے الٹی طرف اور ہمارا بکرا صبح مل گیا تھا۔“ واقعی یہ ان کا بکرا نہیں تھا۔  
”اوہ..... میں سمجھی یہ ہمارا ہے خیر مجھے دیر ہو رہی ہے آئی ہیو ٹو گو۔“

”رکیں.....! اسے واپس باندھیں جہاں سے کھولا ہے۔“ رہبان کو آگ لگ گئی تھی اس کی شان بے نیازی پر۔  
”کیوں آپ ڈرتے ہیں خود باندھ لیں میرے پاس فالٹو ٹائم نہیں ہے۔“

”اللہ کی بندی جاؤ یہاں سے۔“ اس کے آگے ہاتھ جوڑے تھے ہادی نے، کیوں کہ رہبان کے تیور اچھے نہیں تھے۔ شام تک پورے گھر میں اس کا نامہ

وہ گھر کے دروازے پر پہنچی تھی کہ سامنے والوں کے گارڈن پر نظر پڑی تھی۔ اپنے گھر جانے کے بجائے وہ اندھا دھند ان کے گارڈن میں گئی تھی۔ کین چیئر پر ہادی کے ساتھ بیٹھا شخص اس کی دیدہ دلیری پر حیران تھا۔  
”ایکسکوز می میں! آپ کا دماغ ٹھیک ہے۔ کس طرح آپ میرا بکرالے کے جا رہی ہیں۔“ اس نے روکا تھا۔

”میرا دماغ خراب کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ ہمارا بکرا ہے ہم سمجھ رہے تھے کم ہو گیا ہے مگر یہ تو آپ نے چوری کیا اور ڈھٹائی سے سامنے باندھ بھی دیا۔  
”اتبغ! کیا بول رہی ہو۔“

”ہادی بھائی! آپ تو رہنے دیں۔ دوست کی ہمدردی میں خاموش ہو کے بیٹھ گئے۔ حالانکہ بکرا تو آپ خود خرید کر لائے تھے۔ آپ کے دوست کی اصل جگہ تھانے میں بنتی ہے۔“

”انیف ہادی! یہ تمہاری بہن ہے تو برداشت کر رہا ہوں۔ ورنہ تم جانتے ہو۔“

”رہبان یار! سوری اتبغ کو کہیں معلوم۔“  
”بھائی ابھی ابھی آپ سوری کر رہے ہیں۔ اتنا ڈرتے کیوں ہیں۔ ویسے آپ مسٹر رہبان مجھ سے سوری کریں، ورنہ آپ کی جگہ بنتی تو تھانے میں ہی ہے۔“  
”ہاں جیسے آپ کی جگہ اسی گاڑی کے آگے بنتی ہے





پھیل چکا تھا۔  
 ”اتبیح حیرت ہے تم نے رہبان بھائی کو چھوڑ دیا۔  
 انہوں نے تمہیں ایسے کہا پھر بھی؟“  
 ”کیا کہا انہوں نے تو مجھے کچھ بھی نہیں کہا؟“ وہ  
 حیران تھی فزا کی بات پر۔

”ایڈیٹ جو گاڑی کے آگے ہوتا ہے وہ گدھا ہوتا  
 ہے اور تم ایک گدھی ہو ٹھیک کہا تھا۔ انہوں نے۔“ فزا  
 نے اپنا سر پیٹ لیا تھا۔

”کیا ان کا یہ مطلب تھا۔ میں جواب ضرور دوں  
 گی۔“ وہ بچھرا تھی کہ ہادی نے روک لیا۔

”بس ختم کرو، پہلے ہی اتنا تماشا کر چکی ہو۔“ امی  
 نے ڈپٹا تھا۔ وہ خاموش تو ہو گئی تھی مگر قوتی طور پر۔

”اگر آج مجھے کام نہ ہوتا تو میں چھٹی کرنی۔ عید  
 سے پہلے کے یہ آخری دن سب جگہ گندگی اور جانور

کھڑے ہوتے ہیں خیر میں ڈرتی نہیں ہوں بس  
 ایسے ہی کہہ رہی ہوں۔“ فزا تک اپنی معلومات پہنچا

رہی تھی واپسی میں گلی میں قدم رکھا تھا کہ رہبان  
 گیٹ کے باہر نظر آ گیا۔ اسے جانے کیا سوچھی کہ

برابر والوں کی گائے جو پہلے ہی مولا جٹ مشہور تھی  
 اس کا چارا اٹھا کر رہبان کے پاس پھینکا اور اس کی

رسی کھول دی۔ تاکہ وہ رہبان پر چڑھانی کر سکے مگر اپنا  
 ہی کھونٹا مضبوط نہ ہو تو کیا کریں۔ اس گائے محترمہ

نے اتبیح سے ہی دشمنی کا آغاز کیا کہ چارہ تو اسی نے  
 اٹھایا تھا۔ پھر اتبیح تھی اور اس کی چھینیں رہبان اس کی

کارروائی دیکھ چکا تھا۔ اس کا ہاتھ کھینچ کر اپنے گھر  
 میں دھکیلا تھا اور بمشکل اس گائے کو قابو کیا۔ جس کا

سینگ ہلکا سا اس کے ہاتھ میں لگ گیا تھا۔ جس سے  
 اب خون بہہ رہا تھا۔ گائے چوکیدار کے حوالے کر کے

وہ اندر گیا تھا جہاں اتبیح شرمندہ سی کھڑی تھی۔  
 ”سوری..... وہ میں.....“

”آپ جاسکتی ہیں آؤٹ۔“ رہبان نے سختی سے  
 کہہ کر ہاتھ پکڑ کر باہر نکالا تھا۔

READING  
 Section



دیر قبل ہونے والا انجام سب کو بتا دیا تھا۔  
 ”اتبیع اگر رہبان چھپا رہا تھا تو تم نے کیوں بتایا  
 ہو سکتا ہے اب میں یہ رشتہ ختم کر دوں۔“ رہبان کی  
 امی نے سنجیدگی سے کہا تھا۔

”اچھا ہے ختم کر دیں ورنہ یہ ابھی خاموش ہیں۔  
 بعد میں بدلہ لیں گے اور میں جو کرتی ہوں چھپ کے  
 نہیں کرتی ان کی طرح جھوٹ بھی نہیں بولتی۔“ وہ  
 فخر یہ بتا رہی تھی۔

”کیوں رہبان! بدلہ لو گے تم پہ“ اتباع کے ابو نے  
 پوچھا تھا۔

”ہاں مگر بعد میں نہیں ابھی وہ گائے کسی کے قابو  
 میں نہیں آتی خود اسے واپس باندھ کے آئیں۔ یا پھر  
 میرے ہاتھ پر بینڈیج کریں چوائس ان کی ہے کیا  
 کرنا چاہتی ہیں۔“ اتباع سمیت تمام لوگ اس کی  
 شرارت سمجھ گئے تھے۔ اتباع اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

”کہاں جا رہی ہو۔“ فزانے روکا تھا۔

”اس گائے کو واپس باندھنے۔“ اس نے چوائس  
 کر لی تھی۔

”اور ہاں آپ بھی تیار ہو جائیں ہم دونوں ایک  
 ہی گاڑی کے آگے فٹ آسکتے ہیں۔“ وہ اتباع ہی کیا جو  
 بخش دے۔ سب کے قبضہ بنے ساختہ تھے۔ رہبان  
 سمجھ گیا تھا اسے اب سمجھ آیا ہے۔

”اچھا مستقبل کی ڈاکٹر صاحبہ میرا بیٹا زخمی ہے  
 فرسٹ ایڈ تو دے دیں۔“ آنٹی نے کہا تو اسے بادل  
 ناخواستہ اس کے سامنے بیٹھنا پڑا تھا صد شکر رہبان کا  
 دھیان ہادی پر تھا۔ بینڈیج کر کے وہ کمرے میں آئی  
 تو خوب صورت بو کے اور کارڈ اس کے منتظر تھے۔  
 پھولوں کی خوشبو اور کارڈ کی منفرد تحریر بتا رہی تھی کہ وہ  
 رہبان کے دل کی مکین ہے اور بھی اس کی خطائیں  
 رہبان کے سر آنکھوں پر ہیں۔

☆.....

”اتبیع شاکڈ تھی۔ اتنے روڈ بیوی پر ابھی وہ خود کو  
 سنبھالتی گھر میں داخل ہوئی تھی کہ فزانے اس کے منہ  
 میں مٹھائی رکھی تھی۔

”مبارک ہو رہبان بھائی کا ایک سال پرانا  
 پرپوزل ابو نے منظور کر لیا اندران کے پیرنٹس بیٹھے  
 ہیں۔ تیار ہو کے آنا۔“

”مگر امی نے مجھ سے پوچھا بھی نہیں۔“ دوسرا  
 شاکڈ تھا اس کے لیے۔

”بیٹا! کیا تمہیں ہم پر بھروسا نہیں ہے۔“ امی نے  
 حیرت سے دیکھا۔

”نہیں وہ بات نہیں ہے مگر وہ بہت بدتمیز غصے  
 والے ہیں۔“ وہ رو دی تھی۔ ہادی کا دوست ہے ہم  
 سب جانتے ہیں۔ بہت کاسٹڈیچر ہے اس کی بیٹا۔  
 امی نے سمجھایا تھا۔ ہاں کاسٹڈیچر ہے بھی ذرا سے  
 مذاق پر مجھے ہاتھ پکڑ کر گھر سے نکال دیا۔“

”ہیں یہ کب ہوا؟“ فزانے ان تھی اور اس کا مذاق سن  
 کے امی کے ساتھ ہادی اور فزانے بھی سرپیٹ لیا تھا۔  
 ”وہ زخمی ہو گیا اور تمہارا مذاق ٹھہرا وہ کب سدھرو گی  
 تم۔“

”السلام علیکم!“ ہادی برس رہا تھا۔ تبھی رہبان اندر  
 آیا تھا۔

”سوری میں لیٹ ہو گیا۔“  
 ”چلو بیٹا! تم اندر چلو۔“ امی اسے فوراً اندر لے گئی  
 تھیں مبادا اتباع کو دیکھ کر پھر بگڑ جائے۔

”رہبان! یہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہوا؟“ چائے  
 پیتے ہوئے سب کی نظر اس تک گئی تھی۔  
 ”کچھ نہیں امی! سائیڈ دراز میں آ گیا تھا۔“

گہری نظر اتباع پر ڈال کر جواب دیا تھا جو شاید رو کر  
 بیٹھی تھی۔

”آنٹی! یہ جھوٹ بول رہے ہیں۔“ اچانک اتباع  
 نے رہبان کی امی کو مخاطب کیا تھا اور وہ پہلو بدزل کر رہ  
 گیا تھا۔ اتباع نے غلط فہمی سے شروع جنگ کا تھوڑی



# عید الاضاح اور گھنٹی

”شرم نہیں آتی تم لوگوں کو اس طرح کرتے ہوئے؟“ وہ جیسے ہی گیٹ سے اندر داخل ہوئے ثمرین نے غصے سے کہا۔

☆.....☆  
آج پھر وہ صبح صبح تیار ہو کے بکرا منڈی جانے لگے۔ وہ جیسے ہی لاؤنج میں آئے کیا دیکھتے ہیں کہ محترمہ ثمر صاحبہ تک سبک سے تیار بڑی ادا سے صوفے پر بیٹھی بار بار ٹائم دیکھ رہی ہے۔

”ہم نے کیا کیا ہے؟“ عدیل اور رامش نے حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ ان سے آخر کیا بد تمیزی سرزد ہوئی ہے جو وہ انہیں جارحانہ تیور لیے غصے سے دیکھ رہی ہے۔

”کہاں جانے کی تیاری ہے محترمہ عزت مآب ثمرین صاحبہ؟“ رامش نے ادب سے اسے مخاطب کیا جب کہ ثمر ادا کے بے نیازی سے بیٹھی رہی پھر ٹکر ٹکر دونوں کو دیکھنے لگی۔

”حالت دیکھی ہے تم لوگوں نے اپنی ابھی اتنی محنت سے میں نے صفائی کی اور تم لوگوں کی وجہ سے مٹی دوبارہ اندر آگئی ہے۔“ دونوں نے جلدی سے اپنے حلیے کا جائزہ لینا مناسب سمجھا۔ بجائے اسے جواب دینے کے۔

”ٹائم دیکھا ہے اتنی دیر ہوگئی ہے۔ اب جلدی چلو کہیں زیادہ دیر نہ ہو جائے۔ ایک نمبر کے نکلے ہو تم لوگ آج میں بابا جان سے شکایت لگاؤں گی۔ رامش تمہیں تو تہذیب چھو کر بھی نہیں گزری۔“ اس نے خاص رامش کی طرف دیکھ کر اشارہ کیا۔

صبح سے منڈی میں بکرا تلاش کرتے اتنا وقت ہو گیا تھا ایسی حالت تو پچھلے دو دن میں بھی نہیں ہوئی تھی جو آج ہوئی۔

”اوبی بی! میں بڑا شریف سا بندہ ہوں اور تہذیب کو بھلا ضرورت ہی کیا ہے جو مجھے چھو کر گزرا کرے۔“ رامش نے لڑکا عورتوں کی طرح ہاتھ ہلا کر دو بدوا سے جواب دیا۔

”پلیز ثمر! یہ لڑائی، غصہ بعد میں کر لینا، ابھی اندر جانے دو تھکاوٹ سے برا حال ہے اور بکرے آج بھی نہیں ملے۔“ عدیل نے معصومیت سے کہا جب کہ رامش نے جلدی سے اندر کی طرف دوڑ لگائی اس سے پہلے کہ ثمرین سارے صحن کی دھلائی دوبارہ ان سے گروائی، عدیل نے بھی رامش کے پیچھے جانے کی جلدی کی، وہ نہیں چاہتا تھا کہ ثمر اکیلے صرف اس کی درگت بنائے، رامش کوہ صرف غصہ دکھاتی مگر اپنے معصوم بھائی کو تھپڑ بھی ساتھ لگاتی، ثمر نے غصے سے

”میں نے تمیز والی تہذیب کا کہا، تمہاری اس ہمسائی تہذیب کا نہیں جو تمہیں روزانہ صبح شام اپنے ٹیسرے پر کھڑے ہو کر سلام دعا کرتی ہے، خوش فہمیاں تو ملاحظہ فرمائیں جناب کی۔ کتنا ہی اچھا ہوا اگر یہ لڑکا خوش فہمیوں کی پوٹلی ایک طرف رکھ کر شرافت سے







اس سے بات مکمل نہ ہو سکی بہتے ہوئے آنسوؤں کو پونچھ کر بھاگتے ہوئے وہ اپنے روم میں گھس گئی۔ وہ گھسی ہی ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں پر رونا سا آ جاتا اور گھنٹوں خود کو کمرے میں بند کر لیتی۔

”شکر جان چھوٹی جلدی چلو یہ نہ ہو بڑی مہتر مہ کو ہمارے ساتھ روانہ ہی کر دیں۔“ رامش، عدیل کا ہاتھ پکڑے باہر کی طرف دوڑا تھا۔

☆.....☆

”میں تو آج بہت تنگ چکا ہوں یار۔“ رامش نے اپنے جگری دوست عدیل سے کہا۔

”عدیل! اب انہیں کہاں باندھیں گے؟ میں تو

کہتا ہوں شمر کے باغیچے میں باندھ دیتے ہیں، وہاں سبزہ بھی ہے یہ بے چارے بھی بھوکے ہوں گے تم جا کر ٹب میں پانی لے آؤ، میں تب تک انہیں باندھتا

ہوں۔“ رامش نے دوسرے بکرے کی رسی بھی ہاتھ

میں پکڑی اور گھر کے پچھلے کھن کی طرف چل پڑا جہاں

شمر نے اپنے شوق سے چھوٹا سا باغیچہ بنا کر کپاریوں

میں طرح طرح کے پودے اور بیلیں لگائی ہوئی

تھیں۔ بقول اس کے جب اس اداس ہوتی ہوں تب

یہاں آ کر بیٹھ جاتی ہوں اور پودوں کو دیکھ کر فریش ہو

جاتی ہوں۔ بکروں کی آواز سن کر شمر اور بڑی مہتر بھی

باہر آ گئی تھیں۔ صبح کی ناراضی کا کہیں نام و نشان بھی

نہیں تھا۔ یقیناً بڑی مہتر اور ممانے مل کر اپنی لاڈلی کو منا

لیا تھا۔

”رامش! تم انہیں یہاں کیوں باندھ رہے ہو۔

اس طرح تو ساری کپاریاں خراب ہو جائیں گی۔“

”کچھ نہیں ہوتا شمر بیٹا! یہاں یہ کچھ دن آرام سے

رہ لیں گے۔ اس طرح ان کی اچھی دیکھ بھال بھی ہو

جائے گی۔ قربانی کے بعد رامش اور عدیل ساری

صفائی کر دیں گے۔“ رامش کے جواب دینے سے

پہلے مہتر بول پڑی تھیں۔

”جی مہتر! ہم دونوں مل کر اچھے سے صفائی کر دیں

ایک آدھ بات کا جواب بھی دے۔“

”اف اب بس بھی کرو کیا مصیبت ہے۔ ایک تو

منڈی میں اتنا خوار ہونا پڑے گا اور اوپر سے تم لوگوں

کی تکرار۔“ عدیل نے کوفت سے کہا۔

”پلیز شمر! تم اپنی فرینڈ کی طرف کسی اور دن چلی

جانا، فی الحال ہمیں بہت دیر ہو رہی ہے اگر قربانی کے

لیے آج بھی بکرے نہ ملے تو بابا جان بہت ناراض

ہوں گے۔ عید میں بہت کم دن رہ گئے ہیں اور ہمیں

ابھی تک ایک بھی ڈھنگ کا بکرہ نہیں ملا۔“ عدیل نے

بڑے پیار سے اسے کہا اور باہر کی طرف جانے لگا۔

”سنو تو۔ میں نے اپنی کسی دوست کی طرف نہیں

جانا۔“ شمر نے بڑی معصومیت سے آنکھیں ٹپٹپاتے

ہوئے کہا۔

”تو پھر؟“

”میں نے تو تم لوگوں کے ساتھ جانا ہے۔ اتنے

دن ہو گئے ہیں ایک بکرہ بھی نہیں ملا۔ آج میں ساتھ

چلتی ہوں۔ دیکھنا اب بکرے لے کر ہی آئیں گے۔“

”نہیں۔“ رامش اور عدیل نے چیختے ہوئے کہا۔

”کیا مصیبت آن پڑی ہے ذرا بھی چین نہیں

ہے تم لوگوں کو۔“ ممان کے چیخنے پر چکن سے لاؤنج

کی طرف آئیں۔

”بڑی مہتر! دیکھیں نا اسے کیا ضد لے کر بیٹھی

ہے؟“

”بڑی مہتر پلیز! مجھے ان کے ساتھ جانے دیں نا،

مجھے پتا ہے یہ سوکھے سڑے بکرے لے کر آئیں گے

میں اگر ان کے ساتھ گئی تو دیکھئے گا پھر ایسے بکرے

لے کر آؤں گی کہ سارا محلہ دیکھے گا۔“ شمر نے

خوشامدانہ لہجے میں کہا۔

”ہرگز نہیں اب تم بکرے لینے جاتی اچھی لگو گی

کیا؟ جاؤ جا کر چکن سنبھالو جو کام کرنے کا ہے وہی

کرو۔“

”بڑی مہتر! آپ..... آپ.....“



ساری تیاریاں مکمل کر لی تھیں۔ شاپنگ بھی کچھ روز پہلے وہ کر چکی تھی۔ بڑی ماما اور ماما کے ساتھ مل کر چکن کے کام بھی تقریباً مکمل کر دیا لیے تھے۔ سب کو اپنی اپنی پسند کی ڈشز بنوانی ہوتی تھیں۔ سو کچھ تیاریاں پہلے سے کر کے رکھ دی جاتی تھیں۔

”بڑی ماما! ایک بات کہوں؟“ وہ بڑی ماما کے ساتھ چیئر پر چکن میں آ کر بیٹھ گئی۔ جہاں وہ کچھ مصالحوں پر ڈبوں میں رکھ رہی تھیں۔

”جی میری جان بولو۔“

”ہم اس بار قربانی کا سارا گوشت فریز کر کے رکھ لیں گے۔ عید کے بعد میں اپنی دوستوں کی شاندار سی دعوت کروں گی۔ آپ سب بھی اپنے جانے والوں کو بلا لیجیے گا اس طرح بہت عزت بڑھے گی۔“

بڑی ماما جو رامش کی امی اور اس کی ہونے والی ساس تھیں۔ وہ اکثر ان سے اپنی باتیں شیئر کرتی تھی۔ اب بھی شہر اپنی بات انہی سے ڈسکس کرنے آئی تھی۔

”بریں بات بیٹے، ایسا نہیں کہتے، آپ جانتی ہونا ہم تو اپنے رکھنے والے حصے میں سے بھی زیادہ گوشت غریبوں میں بانٹ دیتے ہیں اور یہاں تم کہہ رہی ہو سارا گوشت ہی فریز کر لیں۔“

”بڑی ماما! پہلے میری بات تو مکمل ہونے دیں۔ میں یہ کہہ رہی تھی وہ میری دوست بسمہ ہے نا وہ کہہ رہی تھی میری ماما تو ایسے ہی کرتی ہیں۔ کچھ حصے بنا کر جاننے والوں کو دے دیتی ہیں۔ باقی کا سارا قربانی والا گوشت فریز کر لیتی ہیں بعد میں پھر اچھی سی دعوت کا انتظام کر کے جاننے والوں کو بلاتی ہیں۔ اس طرح سب کے سامنے عزت بھی بڑھ جاتی ہے اور قربانی بھی ہو جاتی ہے۔ گوشت پکا کر تو سب کو کھلا دیتی ہیں خود تو نہیں کھاتیں جو گناہ ہو یہ بھی تو قربانی کے زمرے میں آتا ہے۔“

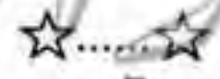
”شہر بیٹا! قربانی کے گوشت کے تین حصے کیے

گے۔ آخر یہ سب کام ہمارے ہی تو کرنے والے ہیں۔ ہم تو اس گھر کے نوکر ہیں۔“ آخری فقرہ عدیل نے منہ میں ہی کہا۔ ساتھ رامش نے بھی تابعداری سے سر ہلایا۔

”مما پلیز! آپ شہر سے کہیں شام تک ان کی اچھی دیکھ بھال کرے۔ ہم تب تک کچھ ریٹ کر لیں پھر انہیں باہر گھمانے بھی لے کر جانا ہے۔ تاکہ یہ فریش ہو جائیں۔ ٹھیک ہے۔“ جواب طلب نظروں سے شہر کی طرف دیکھا جو انتہائی شوق سے بار بار بکروں کو ہاتھ لگا کر دیکھ رہی تھی۔ جیسے پہلی بار دیکھے ہوں۔

”ہاں ہاں تم لوگ جاؤ میں ان کا خیال رکھوں گی۔“

”جیو میری شہزادی۔ بہنا تم بہت اچھی اور رحم دل ہو۔ یہ مجھے آج پتا چلا ہے۔“ عدیل نے جاتے ہوئے شرارت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور سدا سکھی رہنے کی دعادی۔ رامش پہلے ہی کمرے میں جا چکا تھا۔



عید میں کچھ ہی دن باقی تھے۔ عدیل اور رامش روزانہ بکروں کو باہر گھمانے لے کر جاتے تھے جب کہ گھر میں شہر اچھے سے ان بکروں کی دیکھ بھال کر رہی تھی، قربانی کے جانور کی بہت زیادہ خدمت کرنی چاہیے اور ان کا ڈھیر سارا خیال بھی رکھنا چاہیے۔ ثواب ملتا ہے اپنے دادا ابا کی بات اس نے جیسے پلو سے باندھ لی تھی۔ بقول رامش جتنا خیال شہر بکروں کا رکھتی ہے، اتنا خیال ہمارا بھی رکھنے لگے تو زندگی بہت خوب صورت گزرے گی۔

”عدیل! میرے شہزادے، تمہاری تو پھر بھی خیر ہے مگر میرا کیا ہوگا تمہاری بہن ساری زندگی مجھے بھوکا مار دے گی۔“ چونکہ شہر اور رامش کی نسبت طے تھی اسی لیے وہ اکثر ایسی دہائیاں دیتا رہتا تھا۔ شہر نے عید کی



عدیل اور رامش قربانی کا گوشت بنا کر بانٹنے گئے ہوئے تھے اور یہ وہ واحد کام تھا جو وہ خوشی خوشی کرتے تھے۔

”ثمر بچے! آپ کہاں جا رہی ہو؟“ ایک ہاتھ میں ڈش اور دوسرے میں ایک شاپر پکڑے وہ باہر کی طرف جا رہی تھی۔ جب بابا جان نے روک کر پوچھا سب ہی اس وقت لاؤنج میں بیٹھے تھے۔ سوائے عدیل اور رامش کے۔

”بابا جان! میں سیکینہ خالہ کی طرف جا رہی ہوں۔ ان کو عیدی دینے اور یہ سالن میں نے اپنے ہاتھ سے بنایا ہے۔ خالہ کو میرے ہاتھ کا کھانا بہت پسند ہے۔“ سلیقے سے تیار وہ بہت پیاری لگ رہی تھی۔

سیکینہ خالہ ان کی ہمسائی تھیں۔ شوہر کے انتقال کے بعد پانچ چھوٹے بچوں کو جس قدر محنت مزدوری سے وہ پال رہی تھیں۔ لوگ رشک کرتے تھے گھر میں ہانڈی روٹی کے لیے کچھ نہ ہو مگر ان کی غیرت یہ گوارا نہ کرتی کہ کسی کے آگے ہاتھ پھیلا میں۔ ثمر کا ان کی طرف بہت آنا جانا تھا۔ کئی بار ثمر نے ان کی مدد کرنی چاہی مگر انہوں نے خوش اسلوبی سے منع کر دیا۔ آج کا دن وہ خالہ اور ان کے بچوں کے ساتھ گزارنا چاہتی تھی۔ جو وہ شاپنگ اپنے لیے کر کے آئی تھی۔ ان میں سے کافی ساری چیزیں اور کھانے پینے کی اشیاء اس نے اپنے ساتھ اٹھا رکھی تھیں۔ قربانی نام ہے ایثار کا کتنا خوب صورت احساس تھا۔ وہ آج کا دن ان معصوم بچوں کے ساتھ گزارے گی جو ہمیشہ خوشیاں پانے کو ترستے ہیں۔ بابا جان نے اپنے والٹ سے کچھ نوٹ نکال کر اسے دیے کہ وہ اپنی طرف سے بچوں کو عیدی دے دے۔ سیکینہ خالہ آج ہرگز انکار نہ کر سکیں گی۔ خالہ کے گھر کی طرف جاتے ہوئے وہ بہت خوش تھی۔ دوسروں کی خوشی میں خوش رہنے والا ہمیشہ خوش رہتا ہے۔

☆.....☆.....

جاتے ہیں۔ ایک غربا و مساکین کا، دوسرا رشتے داروں کا اور تیسرا حصہ اپنے گھر میں رکھا جاتا ہے۔ جب بسمہ لوگ سارا گوشت گھر میں رکھ لیتے، صرف چند جاننے والوں کو کچھ حصے دے دیتے یہ ان کی قربانی تو نہ ہوئی، جب تک حصے ان کے حقداروں تک نہ پہنچائیں اور جو گوشت وہ دعوت کر کے اپنے جاننے والوں کو کھلاتی ہیں، وہ تو دکھاوا کرتی ہیں صرف اپنی عزت بنانے کے لیے اللہ تعالیٰ کو نمود و نمائش سخت ناپسند ہے، قربانی کا گوشت ان کے حقداروں تک پہنچانے میں ہی بھلائی ہے۔ ہم دنیا دکھاوے، ذرا سی عزت بڑھانے کے لیے اللہ تعالیٰ کو ناراض کر دیں؟ ایسا کام کریں ہی کیوں جو اللہ پاک کی ناراضی کا سبب بنے یہ تو بہت غلط بات ہے۔ تم نے حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل والا واقعہ پڑھا ہوا بھی ہے اور سنا ہوا بھی۔ بہتر ہے اس طرح کی باتوں سے پرہیز کیا کرو۔“

”سوری بڑی ماما! مجھے تو بسمہ نے کہا تھا ایسا کرنے کو ایم ریلی سوری میں آئندہ ایسی باتیں نہیں کروں گی۔ اس نے اپنی دعوت میں بھی مجھے پہلے سے انوائیٹ کر رکھا ہے۔ میں ہرگز وہاں نہیں جاؤں گی اور اسے بھی سمجھاؤں گی قربانی کا حق ادا کریں نہ کہ دکھاوا کریں۔“

☆.....☆.....

”ماشاء اللہ ہماری بیٹی تو بہت عقل مند ہے۔ جلد ہی بات کو سمجھ گئی۔ شاباش اب جلدی سے یہ باقی مصالحوں میں ڈالو تب تک میں نماز پڑھ لوں۔“

وہ صبح سے بہت اداس تھی۔ اتنے خوب صورت بکروں کو ذبح کر دیا جائے گا۔ اسی سوچ نے اسے اداس کر رکھا تھا۔ عدیل جب بکرے کھول کر باہر جانے لگا، تب اس کی آنکھوں میں بے ساختہ آنسو آگئے تھے مگر اس نے خود کو سنبھال لیا تھا۔ اللہ کو ناراض کر کے وہ دل راضی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس نے بکروں کو پیار کیا انہیں پانی پلایا تھا۔



# آذر شاہ اور لائی گئی

واٹ آئی بی مائی  
چھمک چھلو.....

بیت گئیں۔ وہ دو دن پہلے ہی بھیڑیوں کی دنیا میں  
بجی گئی ہے۔“

”سوسوری سر! بٹ یہ سچ ہے وہ اس کلب میں لائی  
گئیں تھیں۔ مجھے ساری انفارمیشن ملی ہے۔“

”او کے آئی فاسٹڈ ہر.....“ آذر شاہ نے غصے میں  
کال کٹ کی تھی۔

☆.....☆

”ایکسکوز می!“ آذر شاہ کو اس نائٹ کلب میں  
آتے ہوئے چار دن ہو چکے تھے مگر اس کو ڈھونڈنے  
میں ناکام رہا تھا۔ آج بالآخر کاؤنٹر بوائے کو مخاطب کر  
بیٹھا تھا۔

”یہاں کوئی نئی کال گرل لائی گئی ہے کیا؟“ اپنی  
محبت اپنی عزت اپنے پیار کو اتنے کرے ہوئے لفظ  
میں مخاطب کرنا پڑے گا بھی آذر نے سوچا بھی نہ تھا۔

”ہاں لائی تو گئی ہے مگر بجی نہیں گئی ہے۔  
پورے پانچ لاکھ میں خریدہ ہے سیٹھا اکبر خان نے۔  
سونے کی چڑیا ہے۔ رنگ روپ تو ایسا ہے جیسے اس  
دھندے کے لیے سیت گر رکھا ہو۔“ کاؤنٹر بوائے

خباث بھرے لہجے میں اس کے پیکر کے پرچے اڑا  
رہا تھا اور آذر شاہ کو لگ رہا تھا کہ جیسے اس کے کان  
میں پگھلا ہوا سیسہ انڈیلا جا رہا ہو مگر مجبوری کہ سن  
رہا تھا۔

”وہ اس وقت کہاں ہوگی؟“ آذر شاہ ضبط سے  
بولتا تھا۔

بے ہنگم سرد ہال بے پناہ کراؤڈ حد سے زیادہ شور و  
غل کانوں کو پھاڑ دینے والا فل لائوڈ میوزک کی  
آوازیں پورے نائٹ کلب میں گونج رہی تھیں۔  
لوگوں کا جھوم تھا کہ پاگلوں کی طرح بھڑک رہا تھا۔  
کچھ لڑکوں کی ہانہوں میں آدمی برہنہ لڑکیاں خود سے  
بے خود ہو کر جھوم رہی تھیں۔ اپنا تقدس خود ہی پامال  
کر رہی تھیں۔

آذر شاہ کوئی تھرڈ کلاس، چھچھورا نہ تھا۔ جو وہ  
آج نائٹ کلب میں موجود تھا۔ وہ تو کسی کا متلاشی  
تھا، کسی کی کھوج میں سرگرداں آج اس جگہ پر  
موجود تھا۔

آذر شاہ کو یہ سب برداشت نہیں ہو پایا تو بالآخر  
تھک ہار کر اس نے ارباز کو کال کی۔

”ارباز! میں یہاں پچھلے بیس منٹس سے ہوں اس  
گندگی کے ڈھیر میں مجھے السا کہیں نظر نہیں آرہی میں  
نکل رہا ہوں یہاں سے میری برداشت جواب دے  
رہی ہے۔“ آذر شاہ کڑھتے ہوئے بولا تھا۔

”یار! میں سو فیصد کانفیڈنس سے کہہ رہا ہوں۔ السا  
اسی نائٹ کلب میں ڈانس کرتی ہے۔“ ارباز روانی  
سے بول رہا تھا کہ آذر شاہ چکاڑا اٹھا۔

”ارباز! ماسٹڈ پور لینگوئج السا کوئی پروفیشنل  
رقاصہ نہیں ہے۔ نہ ہی اسے ڈانس کرتے صدیاں





READING  
Section





دی تھی۔

"السا! پلیز روؤ مت۔ میں آ گیا ہوں ناں، پلیز کول ڈاؤن۔" آذر شاہ نے بہت حوصلے سے السا کو سنبالا اور تسلی دی۔

"مجھے سب بتاؤ، کیا ہوا تمہارے ساتھ تم یہاں کیسے پہنچیں میں تو تمہارے پاپا کے انتقال کی خبر سن کر تمہارے گھر گیا تھا تو وہاں پتہ چلا کہ تم وہ گھر چھوڑ کر جا چکی ہو میں بے حد پریشان ہوا۔ اس ملک میں تو تمہارا اپنا کوئی نہیں اور اپنے باپ کے انتقال کے دوسرے دن ہی تمہیں کہاں جانے کی لگ گئی۔ بڑی مشکلوں سے تم تک رسائی حاصل ہوئی ہے۔"

"آذر! چچا چاہتے تھے کہ میں اپنے چچا زاد سے نکاح کر لوں۔ احمد نے اس کے باپ نے میرے سگے چچا نے پاپا کو جس میں زہر ملا کر دیا تھا۔ پاپا کو اس بات کا علم نہ تھا کہ ان کے بھائی اور چچا کس فیملی میں ہیں۔ خدا بخش ہمارے گھر میں میرے بچپن کے ملازم جو ہیں اس نے باپ بیٹے کی باتیں سن لی تھیں۔ میں پاپا کے غم میں ڈوبی تھی۔ خدا بخش رات کے 3 بجے چپے سے میرے روم میں آیا اور احتیاطاً دروازہ بند کر لیا تھا۔ میں غلط سمجھ کر چلانے ہی والی تھی کہ خدا بخش نے میرے منہ پر اپنا ضعیف ہاتھ رکھ دیا تھا۔ السا میں نے تمہیں گود میں کھلایا ہے تم میری شیو (بیٹی) کی طرح ہو۔ میں تو تمہیں سچ بتانے آیا ہوں۔ بیٹا جلال حسین کو احمد بابا نے جس میں زہر ملا کر دیا تھا۔ صاحب جی کی موت مجھ کی مرضی نہیں۔ احمد بابا اور حسین صاحب کی سوچی سمجھی سازش ہے اب وہ تمہیں بیچنے کی باتیں کر رہے ہیں۔ تم یہاں سے کہیں چلی جاؤ۔ وہ اس گھر کو بھی بیچ دیں گے اور پھر واپس فرانس چلے جائیں گے اور احمد بابا شادی شدہ اور دو بچوں کے باپ ہیں۔ آذر میرے پاپا....." السا آذر کے گلے لگے پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔

"صاحب! وہ اپنے روم میں ہوگی۔" "کہاں ہے اس کا روم؟" آذر شاہ بے چینی سے بولا۔

"صاحب اسٹیج کے سائیڈ پر کارڈور جو ہے اس میں لائن سے روم بنے ہیں روم نمبر 14 میں ہوگی۔" کاؤنٹر بوائے اب ڈرنک لینے جا چکا تھا۔ کاؤنٹر پر کافی رش ہو گیا تھا۔

آذر شاہ فوری طور پر کارڈور میں پہنچا۔ دو لڑکیاں انتہائی خراب لباس میں کھڑی باتیں کر رہی تھیں۔ "ہیلو بیک بوائے، آجاؤ۔" وہ حسین لڑکی بڑی بے باکی سے بول رہی تھی۔ آذر شاہ درمیان میں ہی چلا اٹھا تھا۔

"جسٹ شٹ اپ۔ مزید کچھ مت کہنا۔" "اوہ صاحب بہادر کا غصہ تو دیکھو کیا غلط کہہ دیا۔" دوسری لڑکی طنزیہ بولی تھی۔

آذر شاہ جسٹ سے روم نمبر 14 پر ناک کرنے لگا۔ "مسٹر یہاں تو 5,6 ہزار میں کام چل جائے گا لیکن روم نمبر 14 کی حسینہ تو ایک لاکھ میں بھی راضی نہیں ہوگی۔" پہلی لڑکی پھر تمسخر اڑانے لگی تھی۔

"اسے کہتے ہیں لڑکی جو اپنے تقدس کو سنبالے ہوئے ہے۔ اس جگہ جہاں قدم قدم پر اس کی عزت کو تار تار کرنے والے موجود ہیں اور ایک تم دونوں ہو خود ہی اپنی عزت نفس کو ذریعہ معاش بنا کر شو پیسو کی طرح خود کو ہر غیر مرد کو پیش کرتی ہو۔" شفر سے کہتا آذر شاہ نے دروازے پر پر زور ناک کیا تھا۔

"السا! میں آذر شاہ ہوں پلیز کھولو۔" السا دل ہی دل میں درود شریف کا ورد کر رہی تھی۔ آذر شاہ کی آواز سن کر جلدی سے گیٹ کھولا تھا۔ آذر نے اندر آتے ہی دروازہ بند کر لیا تھا۔ خدشہ تھا کہ کسی کو پتہ نہ لگ جائے کہ وہ انسپکٹر ہے۔

السا آذر شاہ کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو



# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✦ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسجے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

**We Are Anti Waiting WebSite**

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

# WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on  
Facebook

[fb.com/paksociety](https://fb.com/paksociety)



[twitter.com/paksociety](https://twitter.com/paksociety)



آذر کا دل بھی دکھ میں ڈوبا تھا۔  
 ”السا! تم یہاں کیسے پہنچیں؟“ آذر مضطرب

سایا بولا۔

”آذر! خدا بخش مجھے بھگانے میں لگا تھا کہ میرے کمرے کا دروازہ کھلا تھا اور احمد نے میرے بالوں کو جکڑ لیا تھا اور بولا۔ تو تجھے سچ پتہ چل گیا اور خدا بخش کو چچانے لاتوں، گھونسوں سے مار مار کر ادرا کر دیا تھا۔ اس کی پوری فیملی کو ایک کمرے میں قید کر دیا اور مجھے گاڑی میں بٹھا کر یہاں لے آئے۔ میں بہت روئی، چیخی چلائی، کہا کہ میری تمام جائیداد لے لو مجھے چھوڑ دو۔ چچا متظر سے بولے۔ میں تیرے باپ کا سارا پیسہ لے کر ہمیشہ کے لیے چلا جاؤں گا۔ تجھے بھکارن بنا کر لوگوں کے قدموں کی خاک بنا کر آذر وہ مجھے پانچ لاکھ میں یہاں فروخت کر کے چلے گئے۔ آذر یہاں روز رات کو حیوان نما انسان آتے ہیں، سات دن میں میں تمہیں بتا نہیں سکتی کس طرح اپنے آپ کو بچایا ہے۔“

آذر کا دل رور ہا تھا، ٹپ رہا تھا۔

”آذر! مجھے یہاں سے لے جاؤ گے ناں؟“

السا یقین بے یقینی کی کیفیت میں آذر کو دیکھ رہی تھی۔ ان کے درمیان محبت بھری ملاقاتیں، محبت بھرے جذبوں کے عہد و پیمان نہ تھے۔ دونوں یونیورسٹی کلاس فیلو تھے۔ آذر انسپکٹر کی سیٹ سنبھالنے کے بعد کورسز کرنے آیا تھا۔ السا کو نہیں پتا تھا کہ وہ انسپکٹر بھی ہے اور نہ ہی آذر کی خاموش محبت کا علم تھا۔  
 ”السا! میں تمہیں ابھی اسی وقت یہاں سے لے کر جاؤں گا اور تمہاری مرضی ہو تو میں تمہیں اپنا بنانے کے لیے بھی تیار ہوں۔“ السا نے نمناک ٹکا ہوں سے آذر کو دیکھتے ہوئے۔ سر اثبات میں ہلا دیا تھا۔ کیوں کہ وہ سچا چاہنے والا نہ ہوتا تو کبھی بھی السا کو تلاش نہ کرتا اور السا اس ٹائٹ کلب میں خود کو کب تک محفوظ رکھتی۔

”السا! So much I love you، ہم کل ہی نکاح کریں گے، شادی کی رسمیں اہم نہیں ہوتیں نکاح اہم ہوتا ہے۔ نکاح کرنے سے میں تمہیں مکمل تحفظ برودوامیٹ کر سکتا ہوں۔“

السا کا ذہن الجھا ہوا تھا پریشانی سے بولی۔  
 ”آذر! تم مجھے یہاں سے کیسے لے کر جاسکتے ہو، پانچ لاکھ دیئے ہیں۔“ آذر نے مسکراتے ہوئے اپنا سیل فون پاکٹ سے نکالا۔

”ارہاز! مجھے السائل گئی جلدی یہاں آ جاؤ۔ میں اپنی پاسل لے کر نہیں آیا۔ چیکنگ کی وجہ سے، جلدی آ جاؤ مجھے الساکو فوراً اس گندگی کی سے نکالنا ہے۔“

”آذر! تم نے کس کو فون کیا ہے؟ کیا تم کسی پارٹی کے کارکن ہو۔“ ایئر مجھے سچ بتاؤ۔ میری زندگی کس طرف جارہی ہے۔“ السا رور ہی تھی۔

”السا! میں آذر شاہ ایس بی ہوں، تم غلط مت سوچو۔ یہاں اندر آنے سے پہلے چیکنگ ہوتی ہے۔ اسی لیے عام سائبندہ بن کر آیا ہوں وگرنہ تمہیں کیسے تلاش کرتا، تم یہاں سے بہت شان کے جاؤ گی۔ آذر شاہ کی وائف بن کر۔“ آذر شاہ مسکرا رہا تھا۔

”آذر! اتت..... تم پولیس میں ہو تم نے کبھی بتایا نہیں۔“ السا حیران تھی حقیقت پر۔

کچھ ہی دیر میں ارہاز پوری بھاری نفری کے ساتھ ٹائٹ کلب پر چھاپہ مار چکا تھا۔ پورا علاقہ سیل کر کے گرفتاری کا عمل جاری تھا۔ ٹائٹ کلب والے حیران تھے کہ ایک لڑکی کی وجہ سے ان کا پورا دھندا چھوٹ ہو گیا تھا۔ آذر شاہ نے السا کو اپنے گھر اپنے ٹیلی میں چھوڑ کر احمد اور حسنین کو اریسٹ کر لیا تھا اور السا کی تمام جائیداد واپس دلوا دی تھی السا اور آذر کا نکاح ہو چکا تھا۔ دونوں خوش و خرم زندگی بسر کر رہے تھے۔ تاریکی کے سائے ڈھل چکے تھے۔

☆.....



افسانہ



”عینارت، بیٹا اٹھ بھی جاؤ آخر کب تک سوتی رہو گی۔ چھٹی ہونے کا مقصد دیر تک سونا تھوڑی ہوتا ہے۔ بیٹا تمہارے پاپا بھی تمہارا ویٹ کر رہے ہیں۔“  
”اٹھو! شاہاش۔“ آصفہ بیگم نے عینارت کو پیار



READING  
Section



بھرے انداز میں جگاتے ہوئے کہا تھا۔  
 ”کیا ہے ماما! تھوڑی دیر تو اور سونے دیں کہ اتنے دنوں کے بعد تو سکون کی نیند نصیب ہوئی ہے۔“ عینا رت نے منہ پر تکیہ رکھتے ہوئے کہا تھا۔  
 ”آپ کے پاپا ناشتے پر آپ کا ویٹ کر رہے ہیں نا۔“ آصفہ بیگم نے کہا تھا۔  
 ”ہوں آپ چلیں میں فریش ہو کر آتی ہوں۔“ عینا رت نے بیڈ سے اٹھتے ہوئے کہا تھا۔ فریش ہونے کے بعد عینا رت نے اسکاٹی بلوجینز پر ڈارک نیو بلوٹی شرٹ پہن لی اور لاؤنج میں آگئی۔  
 ”السلام علیکم!“ اس نے مسکراتے ہوئے میبل پر موجود نفوس پر سلامتی بھیجی تھی۔  
 ”صبح ہو گئی ڈاکٹر صاحبہ۔“ آذر بھائی نے مسکراتے ہوئے اس کے دیر سے اٹھنے پر اسے تنگ کیا تھا۔  
 ”جی ہاں ہو گئی صبح۔“ عینا رت کہا تھا۔  
 ”بھائی! آپ آج آفس نہیں گئے خیریت؟“ عینا رت نے آزر سے استفسار کیا تھا۔



READING  
Section



صحیح ہے باقی سب غلط ہے وہ تھی بھی تو بلا کی خوب صورت، ذہن ہمیشہ اپنی کلاس میں فرسٹ پوزیشن لیتی، فاروقی صاحب نے بیٹی کی ذہانت کو مد نظر رکھتے ہوئے اس کا ایڈمیشن میڈیکل کالج میں کروا دیا۔ بیٹی کو ڈاکٹر بنانا ان کا خواب تھا۔ کالج میں بھی اس کے ذہانت کے چرچے ہونے لگے تھے۔ مگر جیسے جیسے وہ بڑی ہوتی چلی گئی۔ فاروقی صاحب کے لیے فکر کے نئے دروا کرتی چلی گئی۔ اس کا M.B.B.S کے بعد ہاؤس جاب بھی کھیٹ ہو گیا تھا۔ اس کے سینئر ڈاکٹر نے اسے اپنے ہاسپتال میں ایڈمنٹ کر لیا تھا۔ جہاں وہ ایک ڈاکٹر کی ڈیوٹی پوری دیکھتی تھی۔

☆.....☆

شام کو جب عینارت ہاسپتال سے گھر لوٹی تو فاروقی صاحب کو لاؤنج میں ٹی وی دیکھتے پایا۔ اس نے اپنے باپ پر سلامتی بھیجی تھی۔  
 ”وعلیکم السلام بیٹا! آپ فریش ہو کر میرے پاس آئیں مجھے اپنی ڈاکٹر صاحبہ سے بہت ساری باتیں کرنی ہیں۔“ فاروقی صاحب نے مسکرا کر کہا تو وہ مسکرا کر فریش ہونے چل دی۔ فاروقی صاحب جب بھی موڈ میں ہوتے تھے اسے ڈاکٹر صاحبہ کہہ کر ہی مخاطب کیا کرتے تھے۔

”جی پاپا! کہیں کیا کہنا ہے آپ کو۔“ عینارت نے فاروقی صاحب کے برابر بیٹھتے ہوئے کہا تھا۔  
 ”بیٹا! بات دراصل یہ ہے کہ آپ کے لیے ڈاکٹر عایدی کے بیٹے کا پوزل آیا ہوا ہے۔ آپ دونوں کا پرومیشن بھی سیم ہے مجھے اور آپ کی ماما اور آذر کو بھی اس پوزل پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ ہماری خواہش ہے کہ اب آپ کے فرض سے سبکدوش ہو جائیں میں کافی دنوں سے یہ بات کہنا چاہ رہا تھا۔ اب تم بتاؤ تمہاری کیا رائے ہے؟“ فاروقی صاحب نے اپنی بات ختم کرتے ہوئے اس کی طرف دیکھا تو اس نے

”میں اٹھا تھا یا آفس جانے کے لیے مگر طبیعت کچھ ٹھیک نہیں لگی۔ پھر سوچا فری میں ڈاکٹر صاحبہ سے چیک اپ بھی کروالوں گا مگر ہماری ڈاکٹر صاحبہ کے بھی عجیب نخرے ہیں، مریض ٹریٹمنٹ کروانے کے لیے بیٹھا ہے اور ڈاکٹر صاحبہ کا پتہ ہی نہیں۔“ آذر نے پیار بھرا شکوہ کیا تھا۔

”آپ بھی حد کرتے ہیں بھائی مجھے جگا دیتے، ویسے بھی میں ابھی رعایت کر رہی ہوں۔ بعد میں آپ کو مجھے ہا قاعدہ فیس دینا پڑے گی۔“ عینارت نے پروٹیشنل لہجے میں کہا تھا آذر سے دیکھتا رہ گیا۔

”تم سے میں ٹریٹمنٹ کرواں گا تو کیا تم مجھ سے پیسے لوگی؟“ آذر نے مدغم لہجے میں استفسار کیا تھا۔

”بالکل گھوڑا اگر گھاس سے دوستی کر لے گا تو کھائے گا کیا؟ کل کو خاندان کا کوئی بھی فرد منہ اٹھائے میرے پاس آئے گا تو کیا میں ان سب کا Free of cost ٹریٹمنٹ کروں تو کیا فائدہ میری اتنی Expensive پڑھائی کا۔“ عینارت نے کہا تو ٹیبل پر موجود تمام لوگ ہی خاموش ہو گئے۔

”بیٹا ایسا نہیں کہتے اگر کسی ضرورت مند کا علاج بیٹا پیسوں کے کر دیں گی تو اللہ آپ کو اس کا اجر ضرور دے گا اور آپ اپنی لائف میں اور زیادہ کامیابی حاصل کریں گی۔“ فاروقی صاحب نے اسے سمجھانے والے انداز میں سمجھایا تھا۔

”یو آر روٹنگ پاپا I am not social worker بلکہ میں ایک ڈاکٹر ہوں۔ اگر مجھے سماجی خدمات سرانجام دینا ہوتیں تو میں اتنی محنت کیوں کرتی پھر اتنی لطف پڑھائی کا فائدہ کیا بتائیں؟“ عینارت نے کہا تو آصف بیگم نے فاروقی صاحب کو خاموش ہو جانے کا اشارہ کیا۔ وہ ایسی ہی تھی اپنے ارد گرد کے ماحول سے یکسر لاپرواہ، اپنی لاپرواہ اس کے نزدیک خود اس کی اپنی ذات تھی۔ ایسے لگتا تھا جو وہ بولتی ہے جو سوچتی ہے جو اس کا نظریہ ہے وہی



کہا۔ ”پاپا! میں ابھی شادی نہیں کرنا چاہتی۔ ابھی ابھی تو میرا Career اسٹارٹ ہوا ہے۔ شادی ایک بہت بڑی ذمہ داری ہے میں ابھی صرف اپنے کیریئر پر فوکس کرنا چاہتی ہوں۔ شادی کر لوں گی تو میں آگے نہیں بڑھ سکوں گی۔ مجھے اپنی لائف میں آگے بڑھنا ہے۔ اپنے پروفیشن میں کامیابی کے جھنڈے گاڑنے ہیں۔ خوب سارا نام اور بہت سارا پیسہ کمانا ہے مجھے یاد ہے پاپا کتنی تکلیف سہہ کر آپ نے ہمیں پڑھایا ہے۔ میں آپ سب کے لیے خود کے لیے بہت کچھ کرنا چاہتی ہوں اگر میں شادی کر لوں گی تو میں اپنا مقصد حاصل نہیں کر سکوں گی۔ پاپا میں آزاد رہنا چاہتی ہوں۔ شادی کر کے میرے پرکٹ چائیں گے پاپا، مجھے شادی کی ذمہ داری نبھانا پڑے گی۔ جو ابھی میں نبھانا نہیں چاہتی نہ ہی میں شادی کے لیے تیار ہوں۔ آئندہ آنے والے کئی سالوں تک میرا شادی کا کوئی پلان نہیں ہے۔“ عینارت نے فاروقی صاحب کے سامنے اپنی رائے دی تو وہ جیسے سکتے میں آگئے تھے۔

”بیٹا! زندگی کے طویل سفر میں ایک ہمسفر کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک ایسا ساتھی جو آپ کے دکھ، سکھ میں آپ کا ساتھ دیتا ہے۔ پھر ہمارا کیا بھروسہ کب ہماری آنکھیں بند ہو جائیں، آذر کی بھی شادی ہو چکی ہے۔ اس کی اپنی ایک الگ لائف ہے، اس پر اس کی بیوی بچوں کی ذمہ داری ہے۔ تم میری ذمہ داری ہو اس لیے میں چاہتا ہوں تم بھی اپنی لائف میں سیٹ ہو کر خوش رہو، ریان اچھا ہے ڈینٹ ہے۔ تمہیں سوٹ بھی کرتا ہے۔“ فاروقی صاحب نے قائل کرنے والے انداز میں عینارت کو سمجھانا چاہا تھا۔

”پلیز پاپا! مت فورس کریں مجھے۔ میں نے کب کہا ریان اچھا نہیں ہے۔ میں شادی کر کے غلامی کی

زندگی نہیں گزارنا چاہتی، مجھے آزاد رہنے دیں میں آزاد رہ کر آزادی سے اونچی اڑان اڑنا چاہتی ہوں۔ میں تنہا رہ کر بے حد خوش رہتا چاہتی ہوں پاپا مجھے بے حد سکون ملتا ہے میں اپنی لائف میں بے حد خوش ہوں پاپا، آج آپ مجھ سے ایک وعدہ کریں کہ آئندہ آپ مجھ سے اس ٹاپک پر بات نہیں کریں گے۔ پراس کریں۔“ عینارت نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا تو فاروقی صاحب خاموش نظروں سے اے دیکھنے لگے۔

”بیٹا! میں آپ سے پراس تو نہیں کروں گا لیکن میں یہ دعا ضرور کروں گا کہ آپ کی سوچ بدل جائے۔“ فاروقی صاحب نے اٹھتے ہوئے افسردہ لہجے میں کہا تھا۔

”تھینک یو پاپا۔“ عینارت نے کہا اور اپنے روم کی جانب بڑھ گئی۔

☆.....☆

”ہیلو عینارت بیٹا! کہاں ہو تم ہم سب کھانے پر تمہارا ویٹ کر رہے ہیں۔“ آصفہ بیگم نے اسے کال کر کے اس سے لیٹ ہو جانے کی وجہ پوچھی تھی۔

”مما! میں نے کتنی مرتبہ کہا ہے کہ آپ سب میرا ویٹ مت کیا کریں آج تو ہاسپتال میں کئی ایمرجنسی کیسز آئے ہوئے ہیں۔ میں بہت بڑی ہوں، میں صبح تک گھر آؤں گی اوکے ہائے ممما۔“ عینارت نے جلدی سے اپنی بات پوری کی اور لائن ڈراپ کر کے سیل آف کر دیا تا کہ گھر سے دوبارہ کوئی کال کر کے اسے ڈسٹرب نہ کرے۔

”کس کی کال ہے ڈاکٹر؟“ ڈاکٹر عابدی نے اس سے استفسار کیا تھا۔ ”گھر سے ممما کی کال تھی سر۔“ ڈاکٹر عینارت نے جواب دیا۔

”اگر آپ جانا چاہتی ہیں تو جا سکتی ہیں، ایمرجنسی کے باعث میں نے ڈاکٹر ثروت اور ڈاکٹر فزا کو بھی بلوالیا ہے۔ آپ کے لیے اتنی رعایت تو میں کر ہی سکتا ہوں۔“ ڈاکٹر عابدی نے کہا تھا۔



”نوسر! اپنے سینئرز کے ساتھ رہوں گی تو مجھے بہت کچھ سیکھنے کو ملے گا۔ گھر جا کر اپنا ٹائم میں کیوں ویسٹ کروں۔ میرے لیے گھر جانا اتنا ضروری بھی نہیں ہے۔“ عینارت نے ڈاکٹر عابدی سے کہا تھا۔

”ہوں آئم امپریسڈ آپ اپنے پروفیشن کے ساتھ بے حد مخلص ہیں، ڈاکٹر مجھے یقین ہے آپ بہت آگے جائیں گی اور بہت ترقی کریں گی۔“ ڈاکٹر عابدی نے عینارت کو سراہا تو عینارت خوش ہو کر مسکرانے لگی تھی۔

ہائی بلڈ پریشر کی مریضہ تھیں۔ عینارت کی ٹینشن اندر ہی اندر انہیں گھن کی طرح کھائے جا رہی تھی۔ صبح سات بجے عینارت گھر آگئی اور سو گئی۔ جب سو کر جاگی تو جلدی جلدی ہاسپٹل جانے کے لیے تیار ہونے لگی۔ تیار ہونے کے بعد گاڑی کی چابی اٹھائے وہ لاؤنج سے گزرنے لگی تو فاروقی صاحب نے اسے آواز دی تھی۔

”بیٹا! بات سنو۔“ فاروقی صاحب نے عینارت سے کہا تھا۔

”کیا بات پاپا! میں لیٹ ہو رہی ہوں۔“ عینارت نے عجلت بھرے انداز میں کہا تھا۔

”بیٹا! آپ کی ماما کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ وہ بار بار تمہارے متعلق پوچھ رہی ہیں۔ آج تم ہاسپٹل نہ جاؤ آج کا پورا دن اپنی ماما کے ساتھ رہو۔“ فاروقی صاحب نے عینارت سے کہا تو اس نے کہا۔

”آپ نے میڈیسن تو دے دی ہے نا پھر کیا مسئلہ ہے میں شام کو ان سے مل لوں گی۔ آپ تو ہیں ناں ماما کے پاس ہاسپٹل جانا میرے لیے بے حد ضروری ہے۔ آج بھی میری سینئرز ڈاکٹرز کے ساتھ اہم میٹنگ ہے۔ پلیز آپ میری طرف سے ماما سے سوری کہہ کیجیے گا۔ اللہ حافظ پاپا۔“ عینارت کہتی ہوئی چلی گئی تھی اور فاروقی صاحب کا دماغ صدمے سے ماؤف ہونے لگا تھا۔ جب فاروقی صاحب اپنے روم میں آئے تو آصف بیگم نے انہیں دیکھتے ہی کہا تھا۔

”عینارت کہاں ہے فاروقی صاحب! اسے بلائیے میرے پاس، میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ کیوں نہیں آئی اب تک۔“ آصف بیگم نے کہا تھا۔

”کیوں فضول بولتی ہو بیگم! آجائے گی شام کو۔ اب تم آرام کرو اور تھوڑی دیر سو جاؤ تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔“ فاروقی صاحب نے ان کا بی پی چیک کیا اور آصف بیگم کو سونے کی تاکید کر کے ان کے بڈ کے سامنے چیمز رکھ کر بیٹھ گئے۔ آصف بیگم آنکھیں

☆.....☆

”کیا بات ہوئی آپ کی عینارت سے گھر تک آئے گی وہ۔“ فاروقی صاحب نے آصف بیگم سے استفسار کیا تھا۔

”ہاسپٹل میں ایمر جنسی نافذ ہے وہ نکلنے ہی والی تھی کہ ڈاکٹر عابدی نے اسے روک لیا جا ب تو جا ب ہے نا۔“ آصف بیگم نے نظریں چراتے ہوئے فاروقی صاحب سے کہا تھا۔ فاروقی صاحب نے صرف سر ہلانے پر اکتفا کیا تھا۔ رات آصف بیگم سونے کے لیے لیٹی تو نیند ان کی آنکھوں سے کسوں دور ہو چکی تھی۔ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہونے لگے تھے۔

”یا اللہ! ہم سے کہاں غلطی سرزد ہو گئی اپنی بیٹی کی تربیت میں وہ اتنی بے حس کیوں ہوتی جا رہی ہے۔ اسے اپنے سوا کوئی دوسرا کیوں نظر نہیں آتا۔ حتیٰ کہ اپنے والدین بھی اس کی نظروں میں کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ اسے کیوں احساس نہیں اس کے باعث ہم کتنے اضطراب کا شکار رہتے ہیں، کیوں اس نے پیسہ کمانے کو اپنا مقصد بنا لیا ہے۔ وہ کیوں اندھیری راہوں کی مسافر بنتی جا رہی ہے؟“ آصف بیگم نے روتے ہوئے عینارت کے لیے اللہ سے بہت ساری دعائیں کی تھیں۔ جب وہ روتے روتے تھک گئیں تو ان کی آنکھ لگ گئی تھی۔ صبح ان کی طبیعت بے حد خراب ہو گئی تھی۔ ویسے بھی وہ شوگر اور



موندیں لیٹی ہوئی تھیں۔ وہ غور سے ان کا چہرہ دیکھنے لگے تھے۔ وہ پہلے سے بے حد کمزور اور غمگین لگ رہی تھیں۔ انہوں نے اپنی شریک حیات کی صحت یابی کے لیے دعائیں کیں اور کرسی کی پشت سے سر کو نکال لیا۔ وہ بے حد تھکن محسوس کر رہے تھے تھوڑی ہی دیر میں فاروقی صاحب کی آنکھ لگ گئی۔ جب ان کی آنکھ کھلی تو ظہر کی اذان ہو رہی تھی۔ وہ وضو کرنے کی نیت سے اٹھے تو دیکھا کہ آصف بیگم سو رہی ہیں۔ انہوں نے آصف بیگم کو بلایا تو جیسے ان کے قدموں کے نیچے سے انہیں زمین سرکتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔

”ایسا نہیں ہو سکتا۔“ فاروقی صاحب نے جیسے خود کو تسلی دی تھی۔ پھر انہوں نے آصف بیگم کی نبض چیک کی اور انہیں آصف بیگم کی ڈوٹتی ہوئی نبض کی طرح اپنی زندگی بھی ڈوٹتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔ انہیں ایسا لگا جیسے ان کی دنیا ہی اجڑ گئی ہو۔

”بہو! آذر کو کال کرو۔ کھو تمہاری ماں کو کیا ہو گیا ہے۔“ فاروقی صاحب نے لڑکھڑاتے ہوئے سیرت سے کہا تھا۔

”امی! کو کیا ہوا ہے اب صبح تو خود میں نے ناشتہ کروایا تھا۔ میں نے کال کر دی ہے۔ وہ پہنچے والے ہیں۔“ سیرت نے بھرائے ہوئے لہجے میں کہا تھا۔ ڈورنیل کی آواز پر وہ دروازہ کھولنے چلی گئی تھی۔ آذر کے آجانے کے بعد انہیں قریبی ہسپتال لے جایا گیا تھا۔ چیک اپ کے بعد ڈاکٹر نے کہہ دیا پھیپھٹ کو تو Xpire ہوئے ایک گھنٹہ ہو چکا ہے۔ اس گھمبیر صورت حال میں آذر بار بار عینارت کو کال کر رہا تھا مگر اس کا سلسل آف جا رہا تھا تک آکر اس نے عینارت کے قریبی کولیک کو انفارم کر دیا تھا۔ جب ڈاکٹر ثروت سے آذر کی بات ہوئی تو ڈاکٹر ثروت نے کہا۔

”ڈاکٹر عینارت آپریشن تھیٹر میں ہیں جیسے ہی وہ

فری ہوتی ہیں میں انہیں انفارم کر دوں گا۔“ ”ہوں۔“ آذر نے آنسو صاف کرتے ہوئے ہنکارا بھرا اور لائن ڈراب کر دی۔ فاروقی صاحب آصف بیگم کو گھر لے کر آ گئے تھے۔ قریبی تمام عزیز و اقارب کو بھی اطلاع دے دی گئی تھی۔ گھر میں لوگوں کا ہجوم بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ آصف بیگم بڑی ہی ملتسار خاتون تھیں۔ ان کا اخلاق پورے خاندان میں مشہور تھا۔ سب ہی ان سے بے حد محبت کرتے تھے۔ فاروقی صاحب خاموشی سے ایک کونے میں سکتے کے عالم میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کی آنکھیں بار بار بھیگ رہی تھیں۔ انہیں اپنی شریک سسر سے بے پناہ انسیت تھی۔ ان کا داغ بالکل ہی ماؤف ہو چکا تھا آذر اکیلے ہی اپنے رشتے داروں کے ساتھ مجھڑو گھنٹن کے انتظامات کرنے میں لگا ہوا تھا۔ اسے رہ رہ کر عینارت پر غصہ آ رہا تھا کہ اسے گھر آنے میں دیر کیوں ہو رہی ہے۔ تب ہی روتی بلکتی ہوئی عینارت لاؤنج میں داخل ہوئی تھی۔ اس کی نظر سامنے بیٹھے ہوئے اپنے پاپا پر پڑی وہ ان کے قریب جا کر ان سے لپٹ کر زور زور سے رونے لگی تھی۔

”ایسے کیسے ہو گیا پاپا! کاش آج میں ہسپتال انہیں چھوڑ کر نہ جاتی، مجھے ماما چاہیے پاپا، ماما ہمیں کیوں چھوڑ کر چلی گئیں۔“ عینارت زار و قطار رونے میں مصروف تھی۔ تمام لوگ اس کی حالت دیکھ کر رو پڑے۔ فاروقی صاحب عینارت کو خود سے لگائے اسے تسلی دے رہے تھے۔

”بھائی کہاں ہیں پاپا؟“ اس نے بلکتے ہوئے آذر کے متعلق استفسار کیا تھا۔

”بھائی! ماما ہمیں چھوڑ کر کیوں چلی گئیں۔ بھائی اب ہمارا خیال کون رکھے گا۔ ہم سے اتنا سارا پیار کون کرے گا بھائی بتائیں ناں، آپ چپ کیوں ہیں۔ کچھ بولتے کیوں نہیں ہیں؟“ عینارت نے آذر کو مجھڑتے ہوئے کہا تھا۔ پھر وہ بچوں کی طرح



پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔ اس کے بعد وہ بے ہوش ہو گئی۔ آذر ساری ناراضی بھلائے فکر مندی سے اس کے گال تھپتھانے لگا۔

”عینارت آنکھیں کھولے۔“ آذر نے کہا تھا پھر اس کے چہرے پر پانی کے چھینٹے چھڑکنے لگا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد اسے ہوش آنے لگا اور حواس بحال ہونے لگے تھے۔ ایک بار وہ پھر سے رونے میں مصروف تھی۔ میت کو آخری آرام گاہ کی جانب لے جانے کے لیے تمام انتظامات پایہ تکمیل تک پہنچ چکے تھے۔ نضا میں اللہ اکبر کی صدا میں بلند ہونے لگی تھیں۔ عینارت ایک جھٹکے سے اٹھی اور پاگلوں کی طرح چیخنے چلانے لگی تھی۔

”میں کہیں نہیں جانے دوں گا اپنی ماما کو، پلیز مت لے جائیں میں مر جاؤں گی ماما کے بنا اللہ میں کیا کروں۔“ وہ صدمے سے اپنے ہال نوچنے لگی تھی۔ سیرت آگے بڑھ کر اسے خود سے لگا کر اس کی پیٹھ تھپتھانے لگی تھی۔

”ہمت کرو عینارت! ماما کو تکلیف ہو رہی ہوگی وہ تم سے بہت پیار کرتی ہیں ناں ان ہی کے لیے خاموش ہو جاؤ سنبھالو خود کو پلیز۔“ سیرت نے بمشکل عینارت کو سنبھالا تھا اس کے بعد وہ سیرت کے بازوؤں میں بے ہوش ہو گئی۔

☆.....☆

ایک مہینے اسپتال میں ایڈمٹ رہنے کے بعد وہ گھر آ گئی تھی۔ پچھلا ایک مہینہ اس کی زندگی کا سب سے برا وقت ثابت ہوا تھا۔ اس عرصے میں اسے خود کو سمجھنے کا موقع ملا تھا۔ اس کا دل مردہ ہو چکا تھا۔ اسے کسی چیز میں بھی دلچسپی محسوس ہی نہیں ہو رہی تھی۔ اسے اپنی زندگی بالکل فضول محسوس ہو رہی تھی۔ اس کا دل ماننے کو تیار نہیں ہو پارہا تھا کہ اس سے سب سے محبت کرنے والا وجود اب اس دنیا میں موجود نہیں ہے۔ اسے یوں محسوس

ہو رہا تھا کہ جیسے اس نے اپنی زندگی کا مقصد ہی کھو دیا ہے۔ وہ اونچی اڑان اڑنا چاہتی تھی مگر اسے اب اڑنے سے ڈر لگنے لگا تھا۔ وہ شادی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اپنے کیریئر پر فوکس کرنا چاہتی تھی مگر اب اسے اپنی زندگی میں ایک خلا محسوس ہونے لگا تھا۔ وہ ٹوٹ کر بکھر چکی تھی۔ اسے اپنے وجود کو سمیٹنے کے لیے کسی کے پیار، کسی سہارے کی ضرورت تھی۔ گھر والے عینارت کی دلجوئی میں لگے ہوئے تھے۔ سب یہی چاہتے تھے کہ عینارت دوبارہ زندگی کی رونقوں کی جانب لوٹ آئے۔ ڈاکٹر عابدی نے ایک بار پھر سے اپنے بیٹے کے لیے عینارت کا ہاتھ مانگا تھا۔ سیرت کے سمجھانے پر اس نے شادی کے لیے ہاں بھری تھی۔ اب اس کی خواہش کے عین مطابق شادی کا اہتمام نہایت سادگی سے کیا گیا تھا۔ شادی کی تمام رسومات نہایت سادگی سے سرانجام پائے تھے۔ شادی کے بعد ریان عابدی کی رفاقت میں وہ ایک بار پھر سے جینے لگی تھی۔ زندگی کی رونقوں میں حصہ لینے لگی تھی۔ اس نے ہاسپٹل بھی جو ان کر لیا تھا۔ وہ آسودہ تھی۔ کیوں کہ اس کے ساتھ اس کے اپنوں کی محبت جو ساتھ تھی اور سب سے اہم ریان عابدی کی محبت اور اعتماد کا ساتھ جو تھا۔ فاروقی صاحب کو اس کے چہرے پر اطمینان نظر آنے لگا تھا۔ زندگی کا سفر بے حد طویل ہوتا ہے اگر اس سفر میں محبت کرنے والے، اپنوں کا وجود ہمارے ساتھ منسلک نہ ہو تو ہمیں ہماری زندگی لا حاصل، بے مقصدی محسوس ہوتی ہے اور اگر ہمارے ساتھ ہماری زندگی کے سفر میں اپنوں کا ساتھ ان کی محبت ساتھ ہے تو آپ کو لگتا ہے کہ آپ زندہ ہیں آپ کا وجود سانس لے رہا ہے۔ آپ کے جینے کا مقصد زندہ ہے۔ پھر آپ کی مرضی۔ آپ جتنی اونچی اڑان اڑنا چاہیں۔

☆.....☆



## دو مہینوں کا صلہ

جب کہ ابو بکر کی پسند سے سالگرہ کے لیے اس نے خود پائن اپیل کاٹن پیک، اپیل فریش کریم کے علاوہ تمام کیک بنانے کے لوازمات خرید کر خود بہت بڑا کیک تیار کیا تھا جس پر بڑی ہی دل شیب والی مسج لگائی تھی۔ ابو بکر کو سرخ گلاب بہت پسند تھے۔ اس نے سارے گھر میں رکھے گلدانوں میں سرخ گلاب سجادیئے تھے۔ دیواروں پر گلاب کی سرخ اودھ کھلی کٹیوں کے درمیان موتیوں کی پتیوں سے لکھا تھا۔

آئی لو یو ابو بکر۔

سب سے بڑھ کر اس نے اپنی دو مہینوں کی تنخواہ سے انتہائی قیمتی سوٹ ابو بکر کو تحفے میں دیا تھا اور ابو بکر نے اسے گولڈ کے ایئر رنگ۔ اب اس بار بھی اس کی خواہش تھی کہ وہ کوئی انتہائی قیمتی تحفہ ابو بکر کو دے۔ اسی خواہش کے تحت وہ ایک شاپ پر گئی تھی۔ مختلف چیزیں دیکھنے کے بعد اسے ایک بہت خوب صورت ریٹ واچ پسند آگئی تھی مگر اس کی قیمت اتنی تھی کہ اس کے اگلے دو مہینوں کی تنخواہ بھی ٹھکانے لگ جاتی۔ وہ دل میں حسرت کی ایک پھانس لیے واپس آگئی تھی۔

☆.....☆

عاتکہ اپنے والدین کی اکلوتی لاڈلی اولاد تھی۔ وہ کسی امیر کبیر والدین کی اولاد تو نہیں تھی مگر جب تک اس کے والدین زندہ رہے اس کی کسی خواہش کو رد نہیں ہونے دیا۔ اب تو وہ دن جیسے خواب ہو گئے تھے۔ جب اس کے والدین نے اس کے لیے ابو بکر کو

اس نے آج خلاف معمول بڑی عجلت میں اپنا کام مکمل کرنے کی کوشش کی تھی کیونکہ آج اسے جلدی گھر جانا تھا اور لہج ٹائم تک وہ اپنا کام مکمل کر بھی چکی تھی۔ پھر پاس کی اجازت سے لہج ٹائم میں ہی آفس سے نکل آئی تھی۔ گھر جانے سے پہلے اسے کچھ خریداری کرنی تھی۔ کچھ خریداری بھی کیا محض ایک ایک وہ بھی مناسب قیمت میں، کیوں کہ آج اس کے شوہر ابو بکر کی سالگرہ تھی۔ سو وہ آفس سے نکل کر سیدھی بیکری کی طرف چلی گئی تھی۔ کیک خرید کر بیکری سے باہر آئی تو اس کی نظر سامنے پھولوں کی دکان پر گئی۔ دل میں ایک ٹیس سی اٹھی۔ اس نے لمحہ بھر کو رک کر پھولوں سے سچی دکان کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھا۔ آج ان کی زندگی کا اہم ترین دن تھا۔ اس کے شوہر ابو بکر کی سالگرہ تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ وہ دنیا کی ہر چیز آج کے دن ابو بکر کو گفٹ میں دے مگر اس کے پاس کوئی بڑی رقم نہیں تھی جو وہ اپنی یہ حسرتیں پوری کر سکتی۔ عاتکہ نے گالوں تک آتے آنسو صاف کیے اور آگے بڑھ گئی۔ اسے پچھلے سالوں والی سالگرہ کے دن یاد آگئے کتنی اچھی طرح وہ ہر سالگرہ کا دن مناتے، چاہے وہ اس کی سالگرہ کا دن ہوتا چاہے ابو بکر یا ان کے بیٹے احسن کی سالگرہ کا۔ پچھلے سال والی سالگرہ کا دن اس کی آنکھوں میں گھونٹنے لگا۔ کتنا حسین دن تھا وہ۔ وہ پارلر گئی تھی۔ بالوں کی کٹنگ کے ساتھ فیشل اور پارٹی میک اپ بھی کروایا تھا۔ بہت سی ڈشز بنائیں تھیں





جنتانہ

READING  
Section





گھر نہیں گئی تھی۔

چنانچہ اس نے اپنے والدین کی پسند کے آگے سر تسلیم خم کر دیا تھا۔ یوں ابو بکر اس کی زندگی کا ہمسفر بن گیا۔ ابو بکر ایک اچھا شوہر ثابت ہوا۔ اسے اپنے والدین کی پسند پر فخر تھا۔ ابو بکر کو پا کر وہ مسرور ہو گئی تھی۔ ابو بکر سے اسے بے پایاں محبت اور اعتماد ملا تھا۔ عاتکہ کی خوب صورتی ہی نہیں اس کی خوب سیرتی نے بھی ابو بکر کو اس کا گرویدہ بنا لیا تھا۔ وہ عاتکہ سے دل کی تمام گہرائیوں سے محبت کرنے لگا تھا۔ جب اس کی شادی کے بعد اسی سال عاتکہ کے پہلے ابو اور پھر کچھ ماہ بعد امی اس جہان سے کوچ کر گئے تو وہ ابو بکر ہی تھا جس نے بے جان عاتکہ کو سنبھالا تھا۔ نہیں تو وہ بے موت مر جاتی۔ اتنے بڑے صدمے سے۔ شادی کے دو سال سسرال کے ساتھ ہنسی خوشی گزر گئے۔ پھر ان کی زندگی میں ایک چاند جیسا بیٹا آ گیا تو ان کو اپنی زندگی مکمل لگنے لگی۔ ابو بکر کے دو بھائی اور بھی تھے ان کی بھی شادیاں کر دی گئیں۔ ان کی شادیوں کے دو ماہ بعد ہی ان کے والد رحلت فرما گئے تھے۔ والدہ تو سات سال پہلے ہی رحلت فرما گئی تھیں۔ ان کے والد کی شہر میں ایک گارمنٹس کی دکان بھی مگر باپ کی وفات کے بعد دکان اور گھر فروخت کر کے سب کو ان کے حصے مل گئے۔ پھر گھر کا جو حصہ ابو بکر کے حصے میں آیا اس نے اس رقم سے ایک مناسب ساقلیٹ کرائے پر لے لیا اور ایک سال کا کرایہ ایڈوانس میں ادا کر دیا۔ وہ ایم بی اے تھا مگر ہمارے ملک میں ملازمت سفارش اور رشوت کے بغیر نہیں ملتی۔ اس کے پاس سفارش تو بھی نہیں مگر جو رقم دکان سے اس کے حصے میں آئی تھی وہ رشوت دے کر اچھی کمپنی میں جاب شروع کر دی تھی۔ اس طرح ان کی زندگی جنت کا نمونہ بن گئی۔ عاتکہ سارا دن خود کو گھر میں اور احسن میں مصروف رکھتی۔ انہیں اس فلیٹ میں آئے تین ہفتے ہو چکے تھے۔ ساتھ والے فلیٹ والوں سے ابو بکر کی اچھی دوستی ہو گئی تھی لیکن عاتکہ ابھی تک کسی کے

دو سال اسی طرح گزر گئے۔ احسن بڑا ہوا تو اسے شہر کے سب سے اچھے اور مہنگے ادارے میں داخل کروا دیا گیا تھا۔ پہلے تو ابو بکر کے آفس جانے کے بعد وہ احسن کے ساتھ لگی رہتی مگر اب احسن کے اسکول اور ابو بکر کے آفس جانے کے بعد وہ سارا دن اکیلی پڑی رہتی۔ اس نے ایک دن تنگ آ کر جاب کے لیے ابو بکر سے بات کی تھی کہ میں کوئی جاب کرنا چاہتی ہوں۔ جسٹ ٹائم پاس کرنے کے لیے۔ پہلے تو ابو بکر نہ مانا مگر عاتکہ بضد رہی کہ میں گھر میں سارا دن بور ہو جاتی ہوں۔

”اچھا بابا ٹھیک ہے کر لو جیسے تمہاری خوشی۔“ ابو بکر جواب میں بولا تھا۔ اس طرح عاتکہ نے ایک پرائیویٹ کمپنی میں جاب شروع کر دی تھی۔ تنخواہ مناسب تھی مگر اس طرح اس کا ٹائم مصروفیت میں گزرتا۔

وہ بہت خوش تھے اپنی زندگی سے مگر ابھی ان پر بہت سی مشکلات آئی تھیں جن سے وہ بے خبر تھے۔ جس کمپنی میں ابو بکر جاب کرتا تھا اس کے مالک کا اچانک روڈ ایکسیڈنٹ میں انتقال ہو گیا۔ اس کے بیٹے نے چارج سنبھال لیا۔ بیٹے نے چارج سنبھالتے ہی گئی ورکرز کو کمپنی سے نکال دیا تھا۔ ابو بکر بھی ان نکالے جانے والوں میں سے ایک تھا۔ تب سے وہ ہر روز اخبار میں نوکری کا ایڈ دیکھتا اور انٹرویو کے لیے جاتا مگر اب اس کے پاس کوئی رشوت نہیں تھی کہ اسے نوکری مل جاتی۔ ایک سال ہونے کو آیا تھا اب تو تمام بچت بھی ختم ہو گئی تھی۔ عاتکہ کی تنخواہ مناسب تھی جس سے احسن کی فیس، پانی، بجلی وغیرہ کے بل ادا ہو جاتے مگر اپارٹمنٹ کا کرایہ یہ سب کہاں سے پورا ہوتا۔ ان سب کے لیے اس کی تنخواہ کم پڑ جاتی تھی۔ تین مہینوں سے اپارٹمنٹ کے کرائے کے لیے مالک کو ٹرخایا جا رہا تھا۔ احسن کو پرائیویٹ سے گورنمنٹ اسکول میں داخل کروا دیا گیا تھا۔ پتہ نہیں ایسا کب تک چلنا تھا۔



اخبار ایک طرف رکھا اور چائے پینے لگا۔ اسی پل ڈور  
بیل ہوئی۔ عاتکہ نے جا کر دروازہ کھولا تو سامنے  
ایک انجان لڑکا کھڑا تھا۔

”جی!“ عاتکہ نے سوالیہ نظروں سے اس کی  
طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔  
”ابوبکر کا گھر یہی ہے؟“

”جی ہاں! آپ کون؟“ عاتکہ نے ایک بار پھر  
اس کی طرف سوالیہ نظریں اٹھائیں۔

”میں اس کمپنی کی طرف سے آیا ہوں جہاں پرسوں  
ابوبکر جاب کے لیے انٹرویو دے کر آئے تھے۔“  
”اچھا.....! آئیں، آئیں اندر آجائیں۔“  
عاتکہ کے اندر امید کی ایک کرن پھولی۔

وہ اسے ڈرائنگ روم میں لے آئی جہاں ابوبکر  
اپنی چائے ختم کیے اس کے آنے کا انتظار کر رہا تھا۔  
پہلے تو وہ کسی غیر کو یوں آمادہ دیکھ کر ٹھٹکا مگر پھر فوراً پہچان  
گیا اور اسے سنگل صوفے پر بیٹھنے کی دعوت دی جسے  
آنے والے نے فوراً قبول کر لیا۔

”جی فرمائیں، کسے آنا ہوا؟“ عاتکہ بھی ابوبکر  
کے ساتھ ڈبل صوفے پر آ بیٹھی تھی۔  
”میرا نام عباد ہے مجھے سیٹھ بلگرامی نے آپ کے  
پاس بھیجا ہے۔“  
”جی کس سلسلے میں؟“

ابوبکر نے پر امید نظروں سے عباد کی طرف دیکھا  
کہ شاید تقدیر کو اس پر رحم آ گیا ہے۔

”یہ لیٹر انہوں نے آپ کے لیے بھیجا ہے۔“  
عباد نے ایک لیٹر آگے بڑھ کر ابوبکر کو تھما دیا۔

ابوبکر لیٹر کھول کر پڑھنے لگا جب کہ عاتکہ تجسس  
سے ابوبکر کی طرف دیکھنے لگی مگر جیسے جیسے ابوبکر لیٹر  
پڑھ رہا تھا اس کے چہرے پر غصے کے تاثرات  
بڑھتے ہی جا رہے تھے۔

”آپ جاسکتے ہیں۔“ ابوبکر ایک دم اٹھ کھڑا ہوا  
اور عباد کو جانے کی اجازت دی۔

اپارٹمنٹ میں قدم رکھتے ہی عاتکہ کی نظر ڈرائنگ  
روم میں بیٹھے ابوبکر پر پڑی جو سامنے انگریزی اخبار  
پھیلائے بیٹھا تھا۔ عاتکہ کو دیکھتے ہی اس نے سلام کیا  
اس نے مدہم آواز میں جواب دیا اور کچن میں چلی  
گئی۔ آج صبح ان دونوں میں ہلکی سی مڈ بھیڑ ہو گئی تھی  
جس کی وجہ بھی پیسے۔ کیوں کہ عاتکہ کے پاس کوئی  
بڑی رقم نہیں تھی ابوبکر کو گفٹ دینے کے لیے اس لیے  
وہ چڑچڑی سی ہو گئی تھی اور کچھ دنوں سے بات بات  
پر ابوبکر اور احسن سے الجھ سی پڑتی تھی۔

وہ ایک فریج میں رکھ کر باہر آ گئی جہاں ابوبکر نے  
چائے کی فرمائش کر ڈالی۔ وہ پھر سے کچن میں گئی۔  
چائے کا پانی چولہے پر چڑھا کر اپنے لیے ایک  
سینڈویچ بنایا اور چلتے پھرتے اسے کھانے لگی۔ ساتھ  
ساتھ چائے بنانے لگی۔ صبح سے اس نے کچھ بھی نہیں  
کھایا تھا۔ سینڈویچ کھانے کے بعد بھی بھوک باقی تھی  
مگر پیچھے صرف سات سینڈویچ بچے تھے۔ صبح ناشتے  
کے لیے۔ چائے بنا کر دو کپوں میں ڈالی اور ٹرے  
میں رکھے ڈرائنگ روم میں آ گئی۔ وہ ٹرے سینٹر ٹیبل  
پر رکھ کر صوفے پر اس کے برابر بیٹھ گئی تو وہ اسے اخبار  
سے ایک اشتہار دکھانے لگا۔ ساتھ ایک کپ اٹھا کر  
چائے کے سب لینے لگا۔

”یہ دیکھو ایک ملٹی نیشنل کمپنی کو فریش ایم بی اے  
کیے ہوئے ٹرینی کی ضرورت ہے۔“ عاتکہ پوری  
طرح اخبار پر جھک کر اشتہار دیکھنے لگی۔

”میں یہاں اپلائی کروں گا اگر مجھے یہاں جاب  
مل گئی تو زندگی بن جائے گی۔ اتنے شاندار کیریئر والی  
جاب اور اتنا بہترین سیری پیکیج۔“

عاتکہ کی آنکھوں میں ایک امید کی شمع روشن ہوئی۔

”مگر عاتکہ! مسئلہ یہ ہے کہ اس کمپنی کو فریش ایم  
بی اے ٹرینی چاہیے مگر مجھے تو چھ سال سے بھی زیادہ  
عرصہ ہو گیا ہے۔“ ابوبکر نے مایوسی سے کہتے ہوئے



”سوچ لیں ابوبکر صاحب؟“ عباد نے انتہائی اطمینان سے کہا تھا۔

”ٹھیک ہے جا رہا ہوں مگر آپ پھر بھی ٹھنڈے دماغ سے سوچنا ضرور۔ وہ تو بلگرامی کو تم پر رحم آگیا تو تمہیں آفر کر دی، ورنہ لاکھوں ہیں ان کی نظروں میں تمہارے جیسے تم نے بتایا تھا کہ تمہیں اشد ضرورت ہے نوکری کی سو تمہیں چن لیا۔“

”جاؤ۔“ ابوبکر حلق کے بل چلایا۔

”ٹھیک ہے جا رہا ہوں مگر سوچ لینا پھر بھی، تین دن ہیں آپ کے پاس پھر فون پر بتا دینا آفر کا۔“ وہ یہ کہتا ہوا باہر نکل گیا۔

ابوبکر غصے سے لال پیلا ہو رہا تھا۔ اس نے غصے سے دانت کچکچائے اور مٹھیاں بھینچیں اور کمرے میں جا کر دروازہ بند کر لیا۔ ان کی جو تھوڑی بہت خوشی تھی اب وہ بھی ختم ہو چکی تھی پھر احسن کے اسکول سے آنے پر بڑی خاموشی سے کیک کاٹا گیا تھا۔ رات کو عاتکہ تو لیٹتے ہی سو گئی مگر ابوبکر کو ساری رات نیند نہیں آئی۔ اس سوچ میں کہ وہ سب جان کر بھی کچھ نہیں کر سکتا۔

لوگوں کے ایمان کتنے کمزور ہو چکے ہیں کتنی بے دردی سے اپنے ہی ہاتھوں اپنے بے گناہ اور معصوم بہن بھائیوں کو موت کے گھاٹ اتار رہے ہیں۔ یہی سوچتے سوچتے تین بج چکے تھے۔ اس نے تمام خیال جھٹک کر سونے کی کوشش کی اور تھوڑی دیر میں کامیاب بھی ہو گیا۔ اگلے روز سنڈے تھا۔ عاتکہ اور احسن جلدی اٹھ چکے تھے جب کہ ابوبکر دیر سے سونے کی وجہ سے ابھی تک سو رہا تھا۔ سنڈے کو عاتکہ پہلے گھر کی صفائی کر لیتی تھی۔ پھر وہ آرام سے ناشتہ کرتے۔ احسن تھوڑی دیر پہلے باہر نکل گیا جب کہ عاتکہ صفائی میں لگی ہوئی تھی۔ صفائی کرتے وقت عاتکہ کو صوفے کے نیچے سے وہ لیٹر نظر آیا تو پھر سے اسے سارا واقعہ یاد آ گیا۔ اس نے لیٹر اٹھا کر پھر سے پڑھنا شروع کر دیا۔

”یہ کیا بکواس ہے؟“ ابوبکر نے وہ لیٹر عباد کی طرف اچھالتے ہوئے انتہائی طیش سے کہا۔

لیٹر پاس ہی جا کر جسے عاتکہ بحس سے اٹھا کر پڑھنے لگی۔

”یہ بکواس نہیں بہت اچھی آفر ہے ابوبکر صاحب! سوچیں ذرا عقل سے سوچیں آپ کو بدلے میں اتنی بڑی رقم ملے گی کہ آپ کی اگلی دس نسلیں بھی بیٹھ کر آرام سے کھا سکتی ہیں۔ آپ کا جاتا کچھ بھی نہیں۔“

عباد نے ٹانگ پر ٹانگ چڑھاتے ہوئے خوش گوار لہجے میں کہا تھا۔

”ہوں..... اچھی آفر.....“ ابوبکر نے نفرت سے کہتے ہوئے نگاہیں پھیریں۔ عاتکہ کا بھی لیٹر پڑھ کر مارے غصے کے برا حال ہو چکا تھا۔

”سزا ابوبکر! آپ ہی سمجھائیں ناں اپنے شوہر کو۔“ عباد نے اب عاتکہ کی طرف مدد طلب نظروں سے رجوع کیا تھا۔

”آپ جاتے ہیں یا بلواؤں پولیس کو؟“ ابوبکر نے اپنے پاس ٹیبل پر پڑے موبائل کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

”نہ نہ ابوبکر صاحب! ایسی غلطی کبھی بھول کر بھی مت کرنا تمہارے ایسا کرنے سے بلگرامی کا تو کچھ نہیں بگڑے گا۔ ہاں البتہ وہ تمہاری بونی بونی کر ڈالے گا۔ شاید آپ اس کو جانتے نہیں کتنا خطرناک آدمی ہے سیٹھ بلگرامی صاحب۔“ عباد نے انگلی اٹھا کر خاصے خطرناک انداز میں کہا تھا۔

”مجھے دھمکا رہے ہو؟“ ابوبکر کی تیوری مزید چڑھ گئی۔

”جو بھی سمجھ لو۔“ عباد نے بے نیازی سے کہا۔

”بھول کر بھی ایسی غلطی مت کرنا ابوبکر صاحب! بلند حوصلہ ہونا اچھی بات ہے لیکن ایروچ فل بندوں سے بچنا نہیں لینا چاہیے۔ میرا کام تھا تمہیں وارن کرنا۔ آگے تم اپنے اچھے برے کے خود ذمہ دار ہو گے۔“



”اب جلدی سے ناشتہ ختم کر لو میں باقی کام دیکھ لوں۔“  
وہ جھوٹی مسکراہٹ کے ساتھ کچن سے باہر آئی تو  
سامنے زمین پر داخل دروازے کے پاس پڑے بجلی  
اور گیس کے بل اس کا منہ چڑھا رہے تھے۔ وہ سر  
تھام کر وہیں صوفے پر بیٹھ گئی۔

”کیا بنے گا، اپارٹمنٹ کا کرایہ، گیس، بجلی کا بل  
کہاں سے ادا ہوگا۔“ یہ سب سوچتے ہوئے اس کی  
نظر لیٹر پر پڑی۔ اس نے جلدی سے اٹھایا اور سیدھا  
کرتے ہوئے آخری لائن پڑھی ”بدلے میں بڑی  
رقم“ ملے گی۔ تو اس کے ذہن نے کایا پٹی۔

”کیا ہے اس میں غلط جب کوئی ہمارے مسائل  
نہیں سمجھتا تو ہم کیوں لوگوں کی پروا کریں۔“ اب  
صرف یہی حال بچا تھا۔ وہ دن بھر سوچتی رہی مگر پھر  
فوراً استغفار پڑھ کر وضو کر کے نماز کے لیے کھڑی ہو  
گئی اور خدا سے دعا مانگنے لگی۔

”اے مالک دو جہاں! میں تیرے دربار میں  
حاضر ہو کر تجھ سے رحمت اور مدد کی طالب ہوں۔  
اے مالک تو ہی ہے جو ہمیں اس مشکل سے نکال سکتا  
ہے اور میری ایک لمحے کی غلط اور گمراہ کن سوچ کو  
معاف کر دے مالک جو میں کمزور پڑ گئی تھی میرے  
مالک ہماری مشکل آسان کر دے۔“ یہ کہہ کر وہ بے  
ساختہ آنسوؤں سے رو پڑی تھی کہ بھی اسے ابو بکر کی  
خوشی سے بھرپور آواز سنائی دی۔

”عاتکہ، عاتکہ کہاں ہو تم؟“ وہ جلدی سے باہر کی  
جانب بڑھی جہاں ابو بکر خوشی سے جھوم رہا تھا۔ اسے  
ایک بہت بڑی کمپنی میں جاب مل گئی تھی اور ساتھ میں  
گھر اور دیگر تمام سہولیات بھی۔ اس نے بے ساختہ  
آگے بڑھ کر عاتکہ اور احسن کو گلے لگایا تھا بھی عاتکہ  
دل ہی دل میں اپنے رب کی شکر گزار ہو گئی تھی جس  
نے اس کی دعا قبول کر لی تھی اور خدا پر اس کا یقین  
پہلے سے بھی بڑھ گیا تھا۔

☆.....

”ایک ڈبا جو گفٹ کی طرح پیک ہوگا، بہت  
احتیاط سے شہر کی میں مارکیٹ میں رکھنا ہوگا۔ آپ کی  
جان محفوظ رہے گی کیوں کہ آپ کے وہاں سے نکلنے  
کے بعد وہ پھٹے گا۔ بدلے میں آپ کو بڑی رقم ملے  
گی۔“ اس نے غصے سے لیٹر مٹھی میں بھینچ ڈالا۔

”لوگوں کا حال دیکھو خدا سے ہی ڈرنا چھوڑ دیا  
ہے جس نے ایک انسان کو قتل کیا گویا پوری انسانیت  
کا قتل کر دیا۔ مجھے ابھی پولیس کو اطلاع کرنی  
چاہیے۔“ وہ یہ خود سے کہتے ہوئے ٹیلی فون کی طرف  
بڑھی ہی تھی کہ احسن باہر سے اندر داخل ہوا جس کے  
ہاتھ میں ایک لفافہ تھا۔

”ممی! یہ باہر دروازے میں پڑا تھا۔“ اس نے  
عاتکہ کی طرف لفافہ بڑھاتے ہوئے کہا جسے عاتکہ  
لے کر کھولنے لگی۔

لفافہ کھولتے ہی اس کا رنگ فق ہو گیا۔ وہ  
اپارٹمنٹ کے مالک کی طرف سے نوٹس تھا اگر ایک  
ہفتے میں پورا کرایہ ادا نہ کیا تو ان کا سامان ضبط کر لیا  
جائے گا اور ان کو نکال باہر کیا جائے گا۔

وہ سب بھول کر نوٹس پڑھتے ہی پریشان ہو چکی تھی۔  
اتنی بڑی رقم کہاں سے آئی تھی۔ وہ یہی سوچنے لگی کیوں  
کہ انہوں نے پچھلے تین ماہ سے کرایہ نہیں دیا تھا۔ وہ یہی  
سوچ رہی تھی بھی احسن نے اسے جھنجھوڑ ڈالا۔

”ممی! بھوک لگی ہے ناشتہ دو ناں؟“  
وہ خیالوں کی دنیا سے پٹی اور احسن کو لیے کچن  
میں آگئی۔

”مما یہ کیا صرف تین سینڈوچ، اتنے سے سینڈوچ  
سے بھوک نہیں ختم ہوتی۔ مجھے نہیں کھانے یہ۔“ وہ  
روٹھتے ہوئے دوسری طرف منہ کر کے بیٹھ گیا۔

”اچھا بیٹا! ابھی یہ کھالو دو پہر میں چکن کڑا ہی بنا  
کر دوں گی اپنے بیٹے کو۔“ اس نے جھوٹی لہلی دیتے  
ہوئے تھوڑا سا سینڈوچ توڑ کر بیٹے کے منہ میں ڈالا تو  
وہاں کی اس محبت سے خوش ہو گیا تھا۔



## جہنم کی رات

دکھوں کی بارش میں کیسے بھیگ سکتی ہوں  
وہ دیکھو سامنے  
شفقت کا چھاتا تھا ہے  
کھڑی ہے  
میر کی پیاری ماں

کانوئیاں پر ہیڈ فون لگائے تیز میوزک سے لطف  
اندوز ہوئی۔ صبا اپنے بیڈ پر اوندھی پڑی تھی۔ ساتھ  
ساتھ موبائل پر ایس ایم ایس کا سلسلہ بھی جاری تھا۔  
نرم نرم اسپاؤٹ دانتوں تلے کچلا جا رہا تھا۔ اس کا  
یونیفارم صوفے پر پڑا تھا اور دوپٹے نیچے لٹک رہا تھا۔  
جوتے اور موزے اٹے سیدھے کارپٹ پر آرام فرما  
رہے تھے۔ کچن سے بلقیس بیگم کی پکار اس تک نہیں  
پہنچ پائی۔ تو وہ اس کے کمرے میں آگئیں۔ ایک تو  
پکارنے پر کوئی جواب نہ پا کے امی کا غصہ عروج پر  
تھا۔ مزید کمتر کی حالت دیکھ کر ان کا بلڈ پریشر مزید  
ہائی ہو گیا۔

”صبا! یہ کمرہ ہے یا کباڑ خانہ اوپر سے منحوس ہیڈ  
فون لگائے تم بالکل بہری ہو گئی ہو۔ چھوٹی بیٹی نہیں  
ہو میٹرک کی طالبہ ہو، یہی گن رہے تو کوئی پوچھے گا  
بھی نہیں۔ کام کاج میں تو ویسے بھی تنگمی ہو کم سے کم  
اپنا کمرہ ہی سنہال لیا کرو۔“ امی شروع ہوئیں تو  
مسلسل بولتی چلی گئیں۔ ٹھیک ٹھاک ڈانٹ سے صبا  
کے چہرے کے زاویے بگڑ گئے۔

”امی! اسکول سے آنے کے بعد آپ آرام بھی

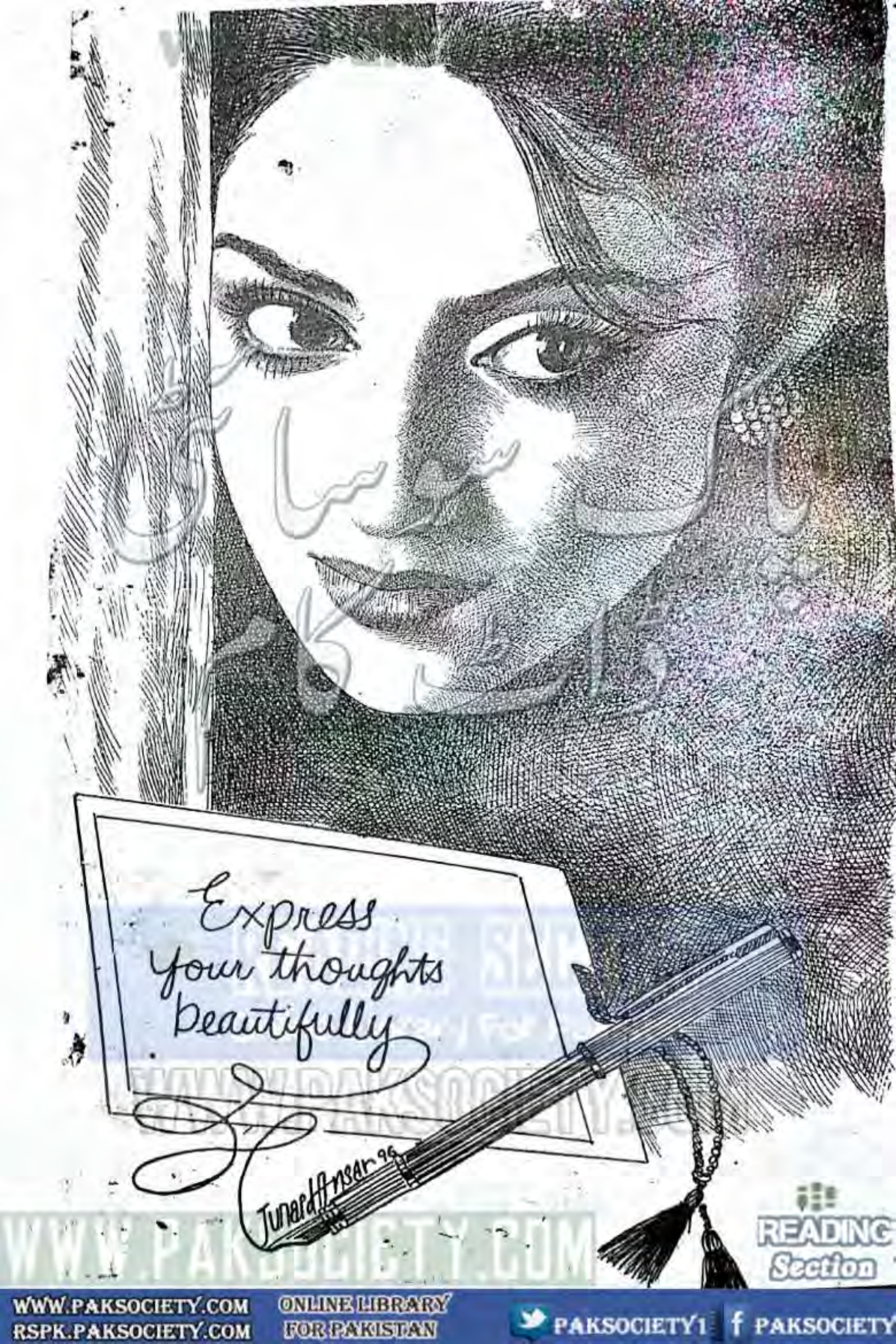
نہیں کرنے دیتیں۔“ وہ منمنائی۔  
”اسکول سے آئے تین گھنٹے ہو گئے ہیں۔ بس  
بہت کر لیا آرام اب کمرہ سمیٹو اور سیدھا کچن میں آؤ۔  
ابو کے کچھ دوست شام کی چائے پر آرہے ہیں۔  
میری لوازمات بنانے میں کچھ بد کرو۔“ امی حکم  
صادر کر کے چلتی بنیں۔ صبا منہ بناتی بادل نخواستہ اٹھی  
اور کمرہ سمیٹ کے سیدھا کچن کا رخ کیا کہ مبادا پھر  
سے امی کی توپوں کا رخ اس کی طرف نہ ہو جائے۔  
”امی نہ ہوتیں تو گھر میں کتنا سکون ہوتا۔“ اس  
نے دل میں سوچا۔

صبا تین بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی۔ باپ کے لاڈ  
و پیار نے اسے بہت آرام طلب اور پھوہڑ بنا دیا تھا۔  
بحیثیت ماں بلقیس بیگم اس سے بہت پیار کرتی تھیں  
مگر ساتھ ساتھ وہ چاہتی تھیں کہ صبا کی تربیت اسلامی  
خطوط کے مطابق ہو، نماز، روزہ، شرم و حیا یہ سب  
اوصاف اس میں ہوں۔ سکھڑ ہو مگر برا ہو اس کی وی  
اور موبائل کا جس کے اثرات کی وجہ سے صبا اکثر ان  
کے زیر عتاب رہتی تھی۔ جس کی وجہ سے وہ اکثر ماں  
سے نالاں رہتی۔

”چلو صبا! اٹھو بھائیوں کے کپڑے استری کرو،  
بجلی کا کچھ پتہ نہیں چلتا وقت بے وقت کی لوڈ شیڈنگ  
نے جان عذاب میں کر رکھی ہے۔“ امی نے بستر پر  
کمر سیدھی کرتے ہوئے صبا کو مخاطب کیا۔

”امی پلیز! یہ ڈرامہ دیکھ لوں پھر اٹھتی ہوں۔“





Express  
your thoughts  
beautifully

Junaid Ansari 96

WWW.PAKSOCIETY.COM

READING  
Section





”یہ امی بھی کسی خوشی کے لیے نہیں چھوڑتیں اگر یہ نہ ہوتیں تو گھر میں کتنا سکون ہوتا۔“ ہمیشہ کی طرح وہ سوچ کر رہ گئی۔

☆.....☆

صبا کے اسکول میں ہر جمعے صبح اسمبلی کے بعد آدھے گھنٹے کا درس ہوتا تھا۔ اسلامیات کی ٹیچر مس صبیحہ کسی بھی دینی موضوع کو چن کر انہیں درس دیتی تھیں۔ ان کے لہجے کی فصاحت و بلاغت قابل دید تھی۔ اس لیے ہر لڑکی ان کی باتیں غور سے سنتی۔ آج بھی جمعہ تھا اور درس شروع ہونے والا تھا۔ صبا پر غنودگی طاری تھی کیونکہ وہ رات دیر تک اپنی کزن ماریہ سے ایس ایم ایس پر باتیں کرتی رہی تھی۔ مس صبیحہ درس شروع کر چکی تھیں۔ ان کا جادوئی لہجہ سب کو اپنی گرفت میں لے رہا تھا۔

”جانتی ہو بچیوں! دنیا میں سب سے خوب صورت رشتہ ماں باپ کا ہے اور ہمارے رب کی طرف سے خوب صورت تحفہ بھی۔ معاشرے میں جو شخص چاہے کتنے ہی رشتوں سے ہی منسلک ہو مگر سب سے مخلص اور سب سے مضبوط رشتہ یہ ہے۔ جب تک ہم چھوٹے ہوتے ہیں ہم اپنے ماں باپ پر انحصار کرتے ہیں۔ وہ ہماری ہر جائز خواہش پوری کرتے ہیں۔ اپنی خواہشوں کو مار کر ہمیں خوش کرنا اپنا اولین فرض سمجھتے ہیں۔ خاص کر ماں جو اپنے خون اور اپنے دودھ سے بچوں کی آبیاری کرتی ہے مگر جب ہم شعور کی سیڑھی پر قدم رکھتے ہیں تو ہمارے غصے اور چڑچڑے پن کا شکار یہی والدین بنتے ہیں۔ ہم اپنی نا اہلی میں اپنی جنت کو خود اپنے ہاتھوں سے دور کرتے ہیں۔ وہ قصہ تو تم لوگوں کو یاد ہو گا جب اللہ کے حکم سے حضرت موسیٰ ایک عام سے قصاب کے پاس گئے۔ کیوں کہ دنیا میں ہی اسے جنت کی بشارت ہو گئی تھی۔ وہ دیکھنے گئے تھے کہ قصاب کا کون سا خاص عمل ہے جس نے اسے

”یہ تو میں کافی ٹائم سے سن رہی ہوں۔ اٹھو جلدی کرو۔ بہت سست لڑکی ہو۔ ارے ماں کے لیے تمہارا بالکل دل نہیں دکھتا۔ صبح سے کام میں جتی ہوں۔ کپڑے دھوئے، صفائی کی، کھانا پکانا کمر دوہری ہو گئی ہے۔ تمہارے ساتھ پڑوس والی ثوبیہ بھی ہے۔ اسکول سے آ کے کیسے ماں کا ہاتھ بٹاتی ہے۔ چھوٹے بھائی کو سنبھالتی ہے۔ ایک تم ہو۔ میں نے کوئی سکون نہ دیکھا۔“ امی بولتے بولتے تھک سی گئیں تو آنکھیں موند کر آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا۔ چارو ناچار صبا کو اٹھنا ہی پڑا۔ امی کی باتیں اس کا حلق تک گڑوا کر دیتی تھیں۔

”یہ امی نہ ہوتیں تو گھر میں کتنا سکون ہوتا۔“ اس نے ہمیشہ کی طرح سوچا۔

”ابو! آپ کو اپنا وعدہ یاد ہے ناں کہ اگر میں میٹرک اچھے نمبروں میں کلیئر کروں گی، تو آپ مجھے انعام میں لیپ ٹاپ خرید کر دیں گے۔“

”مجھے اپنا وعدہ یاد ہے گڑیا! پہلے آپ میٹرک پاس تو کر لیں فرسٹ پوزیشن میں۔ پھر ہم بھی اپنا وعدہ پورا کر لیں گے۔“ ابو نے تار ہونی نظروں سے اپنی لاڈلی بیٹی کو دیکھا۔

”جی نہیں کوئی ضرورت نہیں۔“ ابھی سے اس کا یہ حال ہے کہ ٹی وی اور موبائل کی جان نہیں چھوڑتی، اس موئے لیپ ٹاپ سے چپک گئی تو باہر نظر بھی نہیں آئے گی۔ لڑکی ذات ہے تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت بھی بہت ضروری ہے۔ ان چیزوں نے نئی نسل کو تباہ کر کے رکھ دیا ہے۔ نماز روزہ تو درکنار بڑوں کی عزت کرنا بھی بھول گئے ہیں۔ گھنٹوں ان تباہیوں سے چپکے اپنا وقت اور ایمان دونوں بھول چکے ہیں۔“ امی کا وعظ پھر شروع ہو چکا تھا۔

صبا نے پریشانی سے ابو کی طرف دیکھا مگر مسکراتے ہوئے سر ہلا کر گویا انہوں نے اسے تسلی دی۔



پیارے رب کی نظروں میں سرخرو کر دیا۔ اس کا عمل یہ تھا کہ وہ اپنی کمزور و ضعیف العمر اور معذور ماں کی خدمت کرتا تھا اور اسے ایسے کھانا کھلاتا تھا جیسے چڑیا اپنے بچے کو کھانا کھلاتی ہے۔ اس کی بے لوث خدمت سے نہ صرف جنت واجب ہو گئی بلکہ اس وقت کے بلند پایہ پیغمبر بھی بحس کے ہاتھوں اس قصاب سے ملنے آئے۔ والدین سے چھوٹی اور میٹھی بات بھی ہمیں اپنے رب کی نظروں میں سرخرو کر سکتی ہے اور اپنے اخلاص بھرے عمل سے تا صرف ہم قلبی سکون حاصل کر سکتے ہیں بلکہ یہ مختصر عمل ہماری نجات کا موجب بھی بن سکتا ہے۔

ہمارے پیارے پیغمبر نے حضرت عزرائیل کے ساتھ مل کر ان لوگوں پر لعنت بھیجی جو والدین کو دنیا میں پاپ کے بھی جنت نہ حاصل کر پائیں۔ والدین کو اف کہنا بھی گناہ ہے حالانکہ یہ چھوٹا لفظ کہنے سے اگر منع کیا گیا ہے تو ماں باپ کی نافرمانی اور دل آزاری تو گناہ کبیرہ میں شامل ہے۔ یہاں تک کہ زیادہ وقت عبادت میں گزارنے کے بجائے ماں باپ کی خدمت میں گزارنے کا حکم دیا گیا ہے تاکہ کل کو تم اس عہدے پر فائز ہو تو تمہاری اولاد بھی تمہارے عمل کا رد عمل ہو۔ مکافات عمل تو برحق ہے جو بوؤ گے وہ کاٹو گے۔“ مس صبیحہ کے لہجے کی حلاوت اور سچی باتوں نے صبا کی گویا آنکھیں کھول دیں۔ اس کی آنکھیں نم ہو گئیں تھیں۔ اسے اپنی ماں یاد آرہی تھی جس کی وہ کوئی بات نہیں مانتی تھی، نہ نماز پڑھتی نہ تلاوت کرتی، لڑکھانے کے کام کرتی اور ماں کے نہ ہونے کا سوچتی۔

آج کے بعد وہ ایک اچھی بیٹی بن کے دکھائے گی۔ اس نے دل میں تہیہ کر لیا۔ آج اسے بے صبری سے چھٹی کا انتظار تھا۔ گھر میں داخل ہو کر اس نے امی کی تلاش میں نظریں گھمائیں۔ جمعے کی وجہ سے آج ہاف دے تھا۔ دوپٹے سے پسینہ پوچھتی امی

کچن سے برآمد ہوئیں۔

”السلام علیکم امی!“ صبا نے جلدی سے سلام کیا۔

”وعلیکم السلام! صبا میں نے تمہارے لیے لیموں پانی بنایا ہے۔ آج بہت گرمی ہے پاد سے پی لینا۔ میں نے آج تم لوگوں کی پسند کی مین بریانی بنائی ہے۔ بس اب راستہ اور سلاڈ بنانی ہوں اور ساتھ میں کباب تل لوں گی۔ تم جا کے فریش ہو جاؤ۔“ امی حسب معمول اپنی سنا کے کچن میں چلی گئیں۔

صبا کو زندگی میں پہلی بار ماں پر پیار آیا۔ پورے گھر کی ذمے داری اور سب کی خوشی کا خیال رکھنے والی ماں جیسے اپنے آپ کو بھول گئی تھی۔ جب تھکن سے چورہ غصہ کر لیتی تو ماں پر اسے بھی غصہ آ جاتا۔ حالانکہ ماں کا غصہ تو پانی کے پیلے کی طرح ہوتا ہے جو منٹوں سیکنڈوں میں ہوا میں تحلیل ہو جاتا ہے۔ صبا نے جلدی جلدی یونیفارم بدلا ہر چیز اس نے سلیقے سے رکھی اور کچن میں آ گئی۔

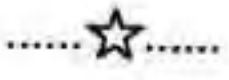
فریج سے شربت نکال کر اس نے ماں کو تھمایا۔

”امی! آپ جائیں باقی کام میں کر لوں گی۔“

”مگر تم ابھی تھکی ہوئی آئی ہو۔“ امی نے کہا۔

”میں بالکل فریش ہوں بس آپ جائیں۔“ اس نے راستہ بنانے کے لیے دہی نکالا۔ تو امی حیرانی سے اسے دعا دے کر کچن سے نکل گئیں۔

صبا کے لبوں پر پرسکون مسکراہٹ تھی۔ ماں کے ساتھ ساتھ اس نے رب سے بھی معافی مانگنی تھی جو دیر ہونے سے پہلے اسے راہ راست پر لے آیا تھا اور ساتھ میں شکرانے کے نفل بھی پڑھنے تھے کہ پیارے اللہ نے اس کی آنکھیں کھول دیں اور اسے جہنم کا ایندھن ہونے سے بچا لیا۔ اب اسے اپنے عمل سے خود جنت حاصل کرنا تھی والدین کی خدمت کر کے۔





# قمر پید کی گھونٹ

”میں ہر دکھ کا ازالہ کر دوں گا لاروش! بس تم مجھے معاف کر دو اور گھر چلو، بی جان اور ماما تمہیں بہت یاد کرتی ہیں اور جب تک تم مجھے معاف نہیں کرو گی وہ لوگ بھی مجھے معاف نہیں کریں گی۔“



READING  
Section



”بہت اچھی بات ہے جو بی جان اور مانا آپ کو معاف نہیں کر رہی ہیں ان کو کرنا بھی ایسا چاہیے۔“  
لاروش اغولان نے اپنی دونوں ہتھیلیاں اس کے سینے پر رکھ کر اسے زور سے پیچھے دھکا دیا تھا۔ وہ لڑکھڑا  
کے جو پیچھے ہوا پیچھے جہازی سائز بیڈ پر گر ا مگر لاروش اغولان کی کلائی نہیں چھوڑی تھی۔ وہ پورے وزن  
سمیت اس پر آ رہی تھی۔

لاروش اغولان کا دل بری طرح دھڑکنے لگا تھا۔ سانسوں کا تنفس تیز سے تیز تر ہوتا چلا گیا تھا۔ ان  
ہر نی آنکھوں میں حنین آفریدی کو اپنا عکس بہت واضح نظر آیا تھا۔ بے اختیار ہی حنین آفریدی نے اس کے  
گرد اپنے دونوں بازوؤں کا حصار کھینچ کر خود سے مزید نزدیک کر لیا تھا۔

”میں جانتا ہوں تم بھی مجھ سے بہت پیار کرتی ہو۔ تمہاری آنکھوں کا یہ پیار میں نے بہت پہلے دیکھ لیا  
تھا مگر سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ آج سب کچھ واضح ہے ساری دھند چھٹ گئی ہے۔ ہر منظر صاف ستھرا نکھرا سا ہو گیا



READING  
Section



ہے جس میں صرف میں اور تم ہیں۔“ حنین آفریدی نے اس کی لرزتی گھنیری پلکوں پر اپنے دہکتے لب رکھ دیے تھے۔

لا روش اغولان کا سارا غصہ جیسے کہیں جھاگ کی طرح بیٹھ گیا تھا۔ اسے یہ در بدری کی زندگی نہیں چاہیے اسے حنین آفریدی کے ساتھ رہنا تھا۔ ان چاہنے والوں کے درمیان رہنا تھا۔ جنہوں نے اسے مان سمعان عزت، محبت چاہت دی تھی اسے اپنی بیٹی مانا ہے اور جو سب سے حیرت والی بات تھی اس کے لیے وہ یہ کہ وہ سب پہلے دن سے جانتے تھے کہ وہ حنین آفریدی کے نکاح میں ہے۔

☆.....☆

”اف۔“

ثمرن بیڈ پر بیٹھ کر بری طرح کراہ رہی تھی ارشد ویسے بھی آج کل آفس سے ثمرن کی وجہ سے جلدی ہی آرہا تھا۔ وہ اپنا آرام وہ شلواری میض لے کر واش روم جا رہا تھا۔ ثمرن کی تکلیف وہ کراہ پر وہ شلواری میض صوفے پر پھینکے اس کی سمت آیا تھا۔

”کیا ہوا ثمرن طبیعت ٹھیک ہے نا تمہاری؟“ ارشد اس کے قریب بیٹھا اور اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ اس کے چہرے پر درد کے آثار بہت زیادہ تھے۔

”بس ارشد ایسی ہی طبیعت ہو رہی ہے اتنا مشکل ہو جاتا ہے۔ بیٹھ جاؤں تو کھڑے ہونا مشکل ہو جاتا ہے اور اگر کھڑی ہو جاؤں تو بیٹھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ جلدی سے یہ دو ماہ بھی گزریں بہت بے چینی ہو جاتی ہے۔“

”تو یار کیوں اٹھ بیٹھ رہی ہو لیٹی رہو آرام کرو۔“

”ارشد پتہ نہیں کیوں میرا دل بہت گھبرا رہا ہے۔“ ثمرن نے ارشد کے دونوں ہاتھ اپنے لرزتے کپکپاتے ہاتھوں میں تھام کر اس پر گرفت سخت کر دی تھی۔

”کیوں!“ اس کی گھبراہٹ ارشد نے اپنے اندر تک محسوس کی تھی۔

”مجھے نہیں معلوم مگر اندر اندر میرا دل بیٹھا جا رہا ہے۔“ ثمرن کی آنکھوں سے آنسو نکلنے لگے تھے۔ ارشد کا دل خون ہونے لگا تھا۔

”سب ٹھیک ہو جائے گا تھوڑی ہمت کرو میں ہوں سب ہیں تمہارے ساتھ۔“ بس پھر کیا تھا درد کی ایک تیز لہر اٹھی تھی ثمرن کی جان نکل گئی تھی۔

”ارشد!“ ثمرن چیخی تھی۔

وہ تڑپنے لگی تھی۔ اب گھبرانے کی باری ارشد کی تھی۔ اس نے نجمہ کو آواز دینی شروع کر دی۔

”ماما..... ماما..... جلدی آئیں۔“

ایک منٹ میں ارشد کے کمرے میں سب جمع ہو گئے تھے۔ گھر میں مردوں میں ارشد اور عارفین کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔

”ارشد ثمرن کو اسپتال لے کر چلو۔“

”میں گاڑی نکالتا ہوں تم ثمرن بھابی کو اٹھاؤ۔“ عارفین اپنی تکلیف کی پرواہ کیے بغیر تیزی سے بھاگا تھا۔ ارشد نے جلدی سے ثمرن کو بازوؤں میں اٹھایا تھا وہ بے انتہار رو رہی تھی۔ تڑپ رہی تھی، ان کے ساتھ

رداڈائجسٹ [172] ستمبر 2015ء

READING  
Section



نجمہ، آسیہ اور رابعہ بھی گئی تھیں۔ دوسری گاڑی میں ڈالے، دانیہ نکلی تھیں۔ ثمرن کی ایسی حالت تھی کہ گھر پر رکھنے کو کوئی تیار ہی نہیں تھا۔

آپریشن تھیٹر میں ثمرن کو گئے دو گھنٹے ہو گئے تھے۔

آفس میں زر میل کو بھی اطلاع دے دی گئی تھی۔

آپریشن تھیٹر سے ڈاکڑ آئی تھی۔ نجمہ آسیہ تیزی سے آگے بڑھیں۔

”مبارک ہو ثمرن کے دو جڑواں بچے ہوئے ہیں ایک لڑکا اور ایک لڑکی۔“ سب کی خوشی کی حد ختم ہو گئی تھی۔ دس برس بعد ارشد کو خوشی دیکھنے کو ملی تھی۔ ثمرن کی گود بھری تھی، اس پر جتنی خوشیاں منائی جاتیں کم تھیں۔

ثمرن کو کچھ دیر بعد پرائیویٹ روم میں شفٹ کر دیا گیا تھا۔ اس کمرے میں سب اکٹھے ہو گئے تھے۔ خیرات و صدقہ کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ شکرانہ نمازیں ادا کی گئیں مسجدوں میں دیکھیں بھینچنے کا آرڈر دیا گیا، غریب و مساکین بچوں کو کھانا کھلانے کا کہا گیا۔ گوکہ جس کا جودل کر رہا تھا وہ کر رہا تھا۔ ان سب میں کسی نے بھی مقسوم کی غیر موجودگی کو نوٹ نہیں کیا تھا۔ عارفین کی متلاشی نظریں اسے ہی ڈھونڈنے لگیں مگر ناکام ثابت ہوئی تھیں۔ اس کے دل و دماغ میں خطرے کا الارم بجنا شروع ہو گئے۔

”ڈالے مقسوم کہاں ہے؟“

”عارفین بھائی یہیں ہوں گی۔“ ڈالے نے عارفین کا فکر مند چہرہ نہیں دیکھا تھا۔

”ڈالے وہ تمہارے ساتھ آئی ہے نا۔“

”نہیں میرا تو خیال تھا کہ وہ آپ کے ساتھ آئی ہوں گی۔“ ڈالے کو بھی فکر لگ گئی تھی وہ ادھر ادھر دیکھنے لگی تھی کہ حرائے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا اس کی گود میں ارشد کا بیٹا تھا۔ عارفین کے چہرے کی رنگت اڑنی شروع ہو گئی تھی۔ اس کے اندر جھکڑ سے چلنے لگے تھے۔ زر میل کی زیرک نگاہوں سے عارفین کا ہوا بیاں اڑتا چہرہ مفقود نہیں رہ سکا تھا۔

”عارفین کیا بات ہے اتنے پریشان کیوں لگ رہے ہو سب خیریت تو ہے نا۔“

”نہیں زر میل میرا خیال ہے کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ مقسوم ہمارے ساتھ نہیں آئی ہے تم یوں کرو سلجوق کو لے کر گھر پہنچو میں تمہیں وہیں ملتا ہوں۔“ عارفین نے اپنے گلے ہاتھ میں بندھی پٹی بے دردی سے اتار کے پھینکی تھی اور اپنی گاڑی اشارت کر لی۔

”بے وقوف..... یہ لڑکی بالکل عقل سے پیدل ہے۔“ وہ غصے میں منہ ہی منہ میں بڑا اتا تیزی سے گاڑی بھگا رہا تھا۔

اور پھر وہی ہوا جس کا ڈر تھا مگر قسمت نے بروقت اس کا ساتھ دیا تھا، گھر کے پاس ہی اسفند درانی کی گاڑی کھڑی تھی، جس میں وہ دونوں آگے اور مقسوم اکیلی پیچھے بیٹھی تھی۔ عارفین کا خون رگوں میں لاوا بن کر بہنے لگا تھا اس نے مزید اسپید بڑھائی تھی اور لا کر اسفند درانی کی گاڑی کے آگے لا کر اس طرح روک دی کہ وہ گاڑی آگے بڑھا ہی نہیں سکتا تھا۔ یاور پھل لے کر غصے میں باہر نکلا تھا۔ مقسوم کا دل دہل کر رہ گیا تھا۔ یاور درانی کو یوں غصے میں پھل نکال کر گاڑی سے باہر نکلتے دیکھ کر وہ بھی باہر نکلی تھی۔

”نہیں یاور تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا، تم عارفین کو کچھ نہیں کہو گے۔“ مقسوم نے یاور درانی کا پھل پکڑا



”تو پھر اسے اپنی زبان میں کہو کہ یہ ہمارے راستے سے ہٹ جائے۔“ یاوردرانی نے مقسوم کا ہاتھ جھٹک کر عارفین کو گھورا تھا۔

”عارفین پلیز! آپ جائیں یہاں سے میں ان لوگوں کے ساتھ اپنی مرضی سے جا رہی ہوں۔“  
 ”شٹ اپ..... جسٹ شٹ اپ۔ اگر آگے ایک اور لفظ بھی کہا تو ابھی یہیں تمہاری جان نکال لوں گا۔“ عارفین نے مقسوم کو بری طرح جھڑکا تھا اس کو مقسوم سے اتنی بے وقوفی کی امید نہیں تھی۔  
 ”بس بہت ہو گیا آج اس بات کا فیصلہ ہو ہی جائے۔“ اس کا غصہ اتنا جلالی تھا کہ مقسوم اندر تک کانپ کر رہ گئی۔

”دیکھو مسٹر عارفین! تمہیں آرام سے سمجھا رہے ہیں ورنہ میرے اور میرے بیٹے کے لیے کسی کو بھی مارنا کوئی بڑی بات نہیں ہے اور اس کا ہلکا سا نمونہ تو تم دیکھ ہی چکے ہو۔“ اسفنددرانی کا اشارہ اس کے بازو پر لگی گولی پر تھا۔

”تم جیسے شیر کی کھال میں چھپے گیدڑ صرف دھمکیاں ہی دے سکتے ہو۔ ہمت تھی تو سامنے سے آ کر وار کرتے ہڑدلوں کی طرح پیچھے سے وار کیوں کرتے ہو۔“  
 ”عارفین!“ اسفنددرانی اور یاوردرانی بری طرح دھاڑے تھے۔

”آواز سنی..... ورنہ ایسا نہ ہو کہ تمہاری زبان حلق سے کھینچ کر تمہارے ہی ہاتھ پر رکھ دوں۔“ عارفین نے دونوں کو باری باری گھورا تھا اور عارفین بیگ صرف دھمکیاں نہیں دیتا کر گزرتا ہے۔

”اچھا اپنی بہادری اور طاقت پر بڑا غرور ہے نا تمہیں اچھی پتہ چل جائے گا کہ دھمکی کس چڑیا کا نام ہے۔“ اسفنددرانی نے اپنی بڑی سی جیب کے پاس کھڑے دونوں مسلح گارڈز کو آڑ دیا تھا اسفنددرانی کے آڑ پر دونوں مسلح گارڈ عارفین کی طرف بڑھے۔

خوب زبردست ہاتھ پائی ہوئی تھی۔ ایک گارڈ نے تو ایک زور کا مکا عارفین کے کسرتی بازو پر رسید کر دیا تھا کہ اس کی ہلکی سی کراہ نکل گئی۔ وہاں سے اب خون رسنے لگا تھا۔

مقسوم کی روح تک تڑپ کے رہ گئی تھی۔ وہ تیزی سے آگے بڑھی مگر یاوردرانی نے اس کا ہاتھ پکڑ کے روک لیا تھا۔

”یاورچھوڑو مجھے..... عارفین.....“ وہ اپنا ہاتھ چھڑانے کی جان توڑ کوشش کرنے لگی تھی مگر یاوردرانی کی گرفت بہت سخت تھی۔ مقسوم حلق کے بل چیخ رہی تھی۔ عارفین کے کسرتی بازو سے خون بہہ رہا تھا۔

مگر وہ بھی عارفین تھا جس نے جوڈو کراٹے میں ماسٹر کیا ہوا تھا۔ وہ بلیک بیلٹ تھا۔ عارفین نے مقسوم کو چیختے چلاتے روتے تڑپتے دیکھا تو اس کا خون کھول اٹھا جس میں دگنا اضافہ یاوردرانی کی وجہ سے ہوا تھا۔ اس نے مقسوم کا ہاتھ بری طرح سے پکڑا ہوا تھا۔ اس کا جوش مزید بڑھا اور ان گارڈز کو عارفین نے اتنا مارا کہ وہ دونوں خون میں لت پت ادھر ادھر گرے تھے اب باری تھی اسفنددرانی اور یاوردرانی کی۔

”عارفین تیری موت میرے ہی ہاتھ لکھی ہے۔“ یاوردرانی نے مقسوم کو اسفنددرانی کی طرف دھکیلا تھا۔ یاوردرانی نے ہسپتال کی نئی عارفین کی طرف کی مگر اس سے پہلے کہ وہ گولی چلاتا۔ وہیں دور سے آتے سلجوق آفریدی نے اس کے ہاتھ پر گولی چلا دی تھی یاوردرانی کے ہاتھ سے ہسپتال دور جا گری تھی۔



اسفند درانی نے سلجوق آفریدی کو پولیس فوج کے ساتھ دیکھا تو مقسوم کو چھوڑا اور یاورد درانی پر چنچا تھا۔  
”یاور بھاگ۔“

مگر سلجوق آفریدی نے اسفند درانی کے پیر پر گولی ماری تھی۔ سلجوق آفریدی نے اسفند درانی اور یاورد درانی کو پکڑ لیا تھا۔ پولیس نے ان دونوں کو گارڈ سمیت پولیس دین میں ڈال دیا تھا۔

”فکر مت کرو اب کچھ نہیں ہوگا۔ کینیڈا کی گورنمنٹ کو تلاش ہے ان مجرموں کی، یہ وہیں جائیں گے۔“  
سلجوق آفریدی نے زرمیل کو دیکھا۔

”تم ٹھیک ہو؟“ سلجوق آفریدی نے عارفین کو دیکھا۔

”عارفین تمہارے ہاتھ سے تو بہت خون بہہ رہا ہے۔“ وہ پریشان ہو گیا تھا۔

”میں ٹھیک ہوں۔ تم ان لوگوں کو یہاں سے لے جاؤ۔“ عارفین نے اپنے ہاتھ پر توجہ دے کر بغیر مقسوم

کو غصے سے دیکھا اور اس کی طرف بڑھا اس کی کلائی زور سے پکڑی تھی۔ مقسوم کو تقریباً ٹھینتا ہوا اندر لایا تھا اور اپنے بیڈروم میں لا کر زور کا دھکا دے کر دروازہ اندر سے بند کر کے لاکڈ کر لیا تھا۔ عارفین دروازہ لاکڈ کر کے مقسوم کی طرف بڑھا اور ایک رٹاٹے دار تھپڑ اس کے منہ پر مارا۔ کہاں وہ نازک اندام سی اور کہاں وہ باڈی بلڈر عارفین، وہ عارفین کا وار سپر نہ سکی اور دور جا کر گر گئی تھی۔ عارفین پھر غصے میں آگے بڑھا اور اس کا بازو تختی سے پکڑ کے کھڑا کر کے مقابل کھڑا کیا۔

”کیا سوچ کر مجھ سے بغیر اجازت کے تم نے گھر سے قدم باہر نکالا میرے منع کرنے کے باوجود تم ان لوگوں کے ساتھ جا رہی تھیں۔“ عارفین کا اس قدر غیض و غضب بھرا انداز دیکھ کر وہ مزید خوفزدہ ہو گئی تھی۔

”عارفین میں نہیں چاہتی تھی کہ اسفند چاچو اور یاور آپ کا کوئی اور نقصان کریں آپ کو تکلیف پہنچائیں۔“ سیاہ آنکھوں میں ایک سمندر موجزن تھا۔ لب کپکپا رہے تھے۔ درد کی شدت سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

”اور جو تم میرا نقصان کر کے جا رہی تھیں اس کا کوئی احساس کوئی پرواہ ہے تمہیں۔“ عارفین کی ذومعنی بات مقسوم کی بالکل سمجھ میں نہیں آئی تھی۔

اس نے خاموشی سے بھیگی پللیں سرخ عارض پر گرائیں۔ عارفین نے غور سے دیکھا تھا۔

”آل رائٹ۔“ عارفین نے ایک سرد آہ لی اور اس کا بازو چھوڑ دیا تھا۔

”تم میرے ساتھ نہیں رہنا چاہتی ہو، ٹھیک ہے اسفند درانی اور یاورد درانی کینیڈا کی جیل کی سلاخوں تک پہنچ جائیں پھر تمہارا بھی فیصلہ کر دوں گا تم نے جس مقصد کے تحت مجھ سے شادی کی تھی، اس میں تم کامیاب بھی ہو گئی ہو، بہت جلد میں تمہیں آزاد کر دوں گا۔“ عارفین کا بہت سا خون بہہ جانے کی وجہ سے اسے بہت کمزوری ہو گئی تھی اس کی ہمت جواب دے گئی تھی۔ اس نے اپنے سارے عقل و خرد گنوا دیئے تھے۔ مقسوم ڈر و خوف کے زیر اثر عارفین کی طرف بڑھی تھی۔

”عارفین..... عارفین.....“

وہ تو صد شکر کہ زرمیل یہیں ان کی طرف آ رہا تھا۔ مقسوم کے چیخنے پر اس نے زور زور سے دروازہ پیٹا

تھا۔ مقسوم نے جلدی سے دروازہ کھولا اور زرمیل اندر آیا تھا۔



"زر میل بھائی عارفین....." اس کا پورا وجود ہچکیوں کی زد میں تھا۔

زر میل کے فون کرنے پر ڈاکٹر بھی فوراً ہی آ گیا تھا۔ اسی اثناء میں ثمرن اور دونوں جڑواں بچوں کے ہمراہ سب خوشی خوشی گھر میں داخل ہوئے تھے۔ سب کو عارفین کی طبیعت کے بارے میں پتا چلا تو سب پریشان ہواٹھے۔

زر میل نے رابعہ اور مقسوم کو تسلی دی کہ سب ٹھیک ہے عارفین جلد ہی صحت یاب ہو جائے گا۔

☆.....☆

ڈاکٹر کی ٹریٹمنٹ نے عارفین کی حالت قدرے بہتر کر دی تھی۔ وہ اس وقت دوائیوں اور انجکشن کے زیر اثر پرسکون سویا تھا۔ گھر کے بھی لوگ اس سے مل کر جا چکے تھے۔ فہیم احمد نیر دلی سے کچھ گھنٹے پہلے آئے تھے اور جیسے ہی عارفین کی طبیعت کے بارے میں پتہ چلا وہ فوراً اسے دیکھنے اوپر آئے تھے۔ زر میل، عارفین اور ارشد میں انہوں نے کبھی کوئی فرق نہیں رکھا تھا۔ وہ جو کچھ زر میل کے لیے لاتے بچپن میں عارفین کو بھی وہی دلاتے تھے۔ عارفین کا بھی یہی حال تھا باپ کی شکل تو اس نے کبھی دیکھی نہیں تھی جو اس کے پیدا ہوتے ہی کینسر کا شکار ہو کر یہ دنیا چھوڑ گئے تھے مگر اپنے دونوں ماموں اور ممانی کو ویسی ہی عزت و احترام دیتا جیسی اپنی ماں رابعہ کو دیتا، اسی لیے تو سب گھر والے اس کی تکلیف پر پریشان ہواٹھے تھے۔

عارفین بیڈ پر کمبل اوڑھے سو رہا تھا۔ مقسوم آرام سے چلتی ہوئی آئی اور عارفین کے پاس بیٹھ گئی۔ آج اس کو کوئی جھجک کوئی عار نہیں تھا۔ عارفین کے پاس اس کے قریب بیٹھنے پر، وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ عارفین اتنا دیوانہ وار اس سے محبت کرتا ہے کہ اس کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار ہے اور اس نے..... عارفین کو کیا دیا سوائے درد تکلیف اور اذیت کے..... وہ بغور اس کا چہرہ دیکھنے لگی تھی عارفین سوتا ہوا بہت معصوم لگ رہا تھا اس نے بلا جھجک اس کا ہاتھ تھام لیا تھا اور اپنی بھلی بھلی آنکھوں سے لگا لیا تھا۔

"مجھے معاف کر دیں عارفین! میں آپ کو سمجھ ہی نہیں سکی۔ آپ بہت اچھے ہیں میں آپ کی قدر نہیں کر سکی۔" اس کی ہچکیاں بندھ گئیں آگے کچھ بولا ہی نہیں جا رہا تھا بس روئے جا رہی تھی۔

"پلیز عارفین! مجھے معاف کر دیں مجھے خود سے جدامت کریں میں آپ کے بغیر مر جاؤں گی۔"

"اگر مرنے دیتا تو آج اس حالت میں بستر میں نہیں پڑا رہتا۔" عارفین کی گھمبیر آواز پر اس نے چونک

کر سر اٹھایا تھا۔ یعنی وہ جاگ رہا تھا۔

کس قدر شرمندگی نے گھیرا تھا۔

"میرے لیے عارفین نے اتنا خطرہ مول لیا ہے اور میں پھر بھی انہی دھوکے باز لوگوں کا ساتھ دینے

چلی تھی۔"

"آپ جاگ رہے ہیں۔" لہجے میں شرمندگی ہی شرمندگی تھی۔

"اچھا ہے ناورنہ اتنا خوب صورت اقرار اور اظہار محبت جس کے لیے میں ترس گیا تھا کیسے سن سکتا تھا۔"

مقسوم اس کی بات پر بری طرح ناصر جھینپ کر رہ گئی بلکہ سیاہ آنکھوں سے اشکوں کا ایک ریلٹوٹ کر بنے لگا تھا۔

جانتی ہونا میں کتنی تکلیف میں ہوں تم پھر بھی مجھے اپنے آنسوؤں سے اور تکلیف اور اذیت دے رہی



عارفین کا بس اتنا ہی کہنا تھا کہ وہ اس کے چوڑے سینے پر سردہر کے جو روئی تھی تو اگلا پچھلا سارا سیلاب آنکھوں کے ذریعے اس کے سینے پر جذب ہوتا چلا گیا تھا۔ عارفین کے ہونٹوں کی مسکراہٹ یکدم دم توڑ گئی اس نے سختی سے اپنے جڑے بھینچ لیے تھے۔

"عارفین خدا کے لیے مجھے معاف کر دیں۔" اس کا پورا وجود ہچکیوں کی زد میں تھا۔ عارفین سے بھلا کہاں برداشت ہوتا اس کا یوں بلک بلک کر زار و قطار رونا اس نے بڑی مشکل سے اپنا زخمی بازو اٹھایا اور اس کے سر پر رکھ دیا تھا۔

"مقسوم! بس کرو، کوئی ضرورت نہیں ہے تمہیں مجھ سے معافی مانگنے کی کیوں کہ جن لوگوں سے ہم بے انتہا محبت کرتے ہیں اپنے دل میں کسی قیمتی شے کی طرح سنبھال کے رکھتے ہیں، ان سے کبھی بھی ناراض نہیں ہوتے اور مقسوم....." عارفین نے اس کا چہرہ اور اٹھایا تھا۔

"میں نے تم سے صرف محبت ہی نہیں کی تم میرا عشق بھی ہو۔" عارفین نے اس کا بھگا چہرہ اپنے ہاتھ سے صاف کیا تھا۔

"مگر ہاں میں تم سے ضرور معافی مانگوں گا۔" آنکھوں میں مسکراہٹ لیے وہ بغور ان سیاہ آنکھوں میں جھانکنے لگا تھا۔

"وہ کس لیے؟"

"میں نے تمہیں یہاں زور سے تھپڑ مارا تھا۔" عارفین نے ہولے سے اس کے گال پر اپنی ہتھیلی پھیری تھی۔

"وہ تو میں نے غلطی کی تھی نا۔" ہولے سے پلکوں کی باڑ گرائی تھی۔

"مقسوم اگر میں بروقت نہ پہنچتا تو جانے وہ کہاں لے جاتے تمہیں، کیا کرتے یہی سوچتا ہوں تو جسم سے ایسا لگتا ہے روح نکل رہی ہو۔"

"لیکن عا....."

"شش....." عارفین نے مقسوم کے ہونٹوں پر انگلی رکھ تھی اور نفی میں ادھر ادھر گردن ہلائی تھی۔

"اب ہم کبھی بھی اس ٹاپک پر بات نہیں کریں گے اوکے۔"

"عارفین۔" مقسوم نے اس کی اپنے ہونٹوں پر رکھی انگشت شہادت پکڑ کر دھیرے سے پکارا تھا۔

"ہوں۔"

"میں آپ سے الگ رہ کر جینا نہیں چاہتی، مجھے اس گھر سے بہت پیار ملا ہے آپ مجھے چھوڑیں گے تو

نہیں نا۔" اس کے دل کا ڈر اس کی زبان پر آ گیا تھا۔

"یہ واہیات خیال تمہارے ذہن میں کیونکر آیا۔"

"آپ ہی نے کہا تھا کہ آپ میرا فیصلہ کر دیں گے مجھے آزاد کر دیں گے۔" کتنی مشکل سے اس نے یہ

چند لفظ بولے تھے۔ عارفین نے بغور اس کا چہرہ دیکھا تھا وہ تو بھول چکا تھا کہ اس نے ایسا کچھ کہا ہے۔

اس نے مقسوم کی کمر میں اپنا بازو ڈال کر اسے خود سے اتنا قریب کر لیا کہ دونوں کی گرم سانسیں ایک

دوسرے سے الجھنے لگی تھیں۔



”مسز مقسوم عارفین آپ ہماری رگوں میں لہو بن کر بہتی ہیں۔ میری آتی جاتی سانسوں میں خوشبو بن کر مہکتی ہو، میرے جسم میں مقید میری روح ہو تم تو کیا اگر جسم سے روح الگ کر دی جائے جسم زندہ رہ پائے گا۔ تم میری قسمت ہو اور اپنی خوش قسمتی سے جدا ہو کر کون زندہ رہ سکتا ہے۔“

کتنا خوب صورت اقرار کر رہا تھا وہ کہ مقسوم کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے تھے۔ دل بہت پرسکون ہو گیا تھا اس نے آسودہ ہو کر عارفین کے وسیع سینے پر اپنا سر دھر دیا اور آنکھیں موندھ لیں۔ عارفین ہولے سے مسکرا دیا اور اس کے سر پر اپنے پیار کی مہر ثبت کر دی۔

☆.....☆

وانیہ ٹی وی لاؤنج میں بیٹھی ٹی وی پر کوئی پروگرام دیکھ رہی تھی۔ جب ہی حسن چلا آیا۔

”السلام علیکم!“ وانیہ نے نہایت چونک کر پلٹ کر دیکھا تھا۔ ہاتھ سے ریموٹ بھی گر گیا تھا۔ ایسا لگا جیسے اچانک سے آفریدی اس کے سامنے آکھڑا ہوا ہے۔

”.....وعلیکم.....السلام.....!“ زبان بری طرح لڑکھڑا کے رہ گئی تھی۔

حسن آفریدی نے بغور اسے دیکھا تھا۔ پھر قالین پر پڑے ریموٹ کو دیکھا وہ آگے بڑھا اور اس کے قدموں پر جھک کر ریموٹ اٹھالیا۔ حسن آفریدی کے اس طرح جھکنے پر وہ ڈر کر پیچھے کھسکی تھی۔ اس کی کلون کی تیز خوشبو وانیہ کے نتھنوں میں گھس کر بہت کچھ یاد دلا گئی تھی اس نے پھر چونک کر حسن آفریدی کو دکھا تھا۔ یہ خوشبو کتنی جانی پہچانی ہے۔

وانیہ کے یوں کم صم ہونے پر حسن آفریدی نے پہلے ریموٹ ٹیبل پر رکھا پھر اس کی پرسوج آنکھوں کے سامنے چٹکی بجاتی گئی۔ وہ گڑبڑا کے رہ گئی۔

”کیا میں عارفین سے مل سکتا ہوں۔“

”جج.....جی.....“

”یہ میرے سوال کا جواب ہے یا حیرت کا اظہار۔“ وہ دکشی سے مسکرا دیا تھا۔

”جی وہ اپنے کمرے میں ہیں۔“

”یہ تو میں بھی جانتا ہوں کہ عارفین اپنے کمرے میں ہے مگر میں یہ پوچھ رہا ہوں کہ کیا میں ان سے مل سکتا ہوں؟“ حسن آفریدی نے بغور اس کی آنکھوں میں جھانکا تھا اور ان آنکھوں سے نظر ہٹتی ہوئی سیدھی اس کی صراحی دار شفاف گردن پر پڑے سیاہ تل پر ٹھہر گئی تھی۔

حسن آفریدی کے یوں گھور گھور گرد دیکھنے پر وانیہ بری طرح جھینپ کرنا صرف رہ گئی تھی بلکہ اپنے دوپٹے کو اور ٹھیک کر کے اپنی گردن بھی چھپالی تھی۔ حسن آفریدی نے اپنی نظروں کا رخ پھیر لیا تھا۔ ہونٹوں سے مسکراہٹ یکدم غائب ہو گئی تھی۔

”میں رابعہ یامی کو بلا کے لاتی ہوں۔“ وانیہ سے وہاں رکنا محال ہو رہا تھا وہ سیدھی بھاگتی ہوئی رابعہ کے بیڈروم میں آئی تھی۔

وہ عارفین سے ملایا نہیں وہ نہیں جانتی مگر وہ بیڈروم سے باہر نہیں نکلی تھی۔ آج پھر اسے وہ بلوریں آنکھیں یاد آ گئی تھیں۔

☆.....☆



لا روش اغولان کو دو دن ہو گئے تھے یہاں آئے مگر کسی کے بھی رویے سے ظاہر نہیں ہو رہا تھا کہ وہ اس سے ناراض ہیں بلکہ زو بار یہ نے تو اسے خود سے لپٹا کے خوب پیار کیا تھا۔ بی جان نے بھی اسے گلے سے لگایا تھا۔ صد آفریدی نے اس کے سر پر دستِ شفقت رکھا تھا۔

”اسی لیے بار بار بول رہا تھا کہ مجھ سے دوستی کر لو فائدے میں رہو گی مگر تم تو کچھ سمجھ ہی نہیں رہی تھیں اگر عارفین کا مسئلہ بیچ میں نہ آیا ہوتا تو تمہیں اس گھر میں واپس آنے میں اتنے دن بھی نہیں لگتے۔“ سلجوق آفریدی نے نرمی سے لا روش اغولان کو دیکھا تھا۔

”غلطی کچھ ہماری بھی ہے جب یہ گھر آئی تھی ہمیں اسی دن بتا دینا چاہیے تھا کہ تم اس گھر کی بہو ہو حنین کی بیوی مگر ہم ان دونوں کا انتظار کرتے رہے کہ کب یہ بتائیں گے اور دیکھ لو ہماری دیری نے یہ دن دکھایا کہ ہماری بیٹی کو گھر سے در بدر ہونا پڑا۔“ بی جان نے لا روش اغولان کا سراپے کندھے سے لگایا تھا۔

”آئی ام سوری بی جان!“ اس نے شرمندگی سے بی جان کا نرم ہاتھ تھام لیا تھا۔

”نہیں کوئی بات نہیں اگر تمہاری جگہ کوئی بھی ہوتا وہ یہی کرتا ہنی نے جو کیا وہ غلط کیا اور اسے اپنی غلطی پرنا صرف پچھتاوا ہے بلکہ اسے تمہاری قدر بھی ہو گئی ہے۔“ لا روش اغولان ہولے سے مسکرا دی اور کن اٹھیوں سے سلجوق آفریدی کے برابر میں بیٹھے حنین آفریدی کو دیکھا۔

”یار! اتنی آؤ بھگت ہو گئی اتنا پیار سمیٹ لیا، اب ذرا مجھ پر بھی توجہ دے لو۔ صبح سے بھوکا ہوں۔“ حنین آفریدی نے اپنے پیٹ پر ہاتھ رکھا تھا۔ ”سچی جب سے گئی ہو کچھ اچھا کھانے کو نہیں ملا۔“

”شاباش بیٹا! کیا کہنے ہیں تمہارے۔“ زو بار یہ نے اسے گھور کے دیکھا تھا۔ حنین آفریدی کان کھجا کے رہ گیا تھا۔

”ماما اس کو سزا تو ملنی چاہیے نا۔“ سلجوق آفریدی نے شریر لہجے میں کہتے ہوئے اپنے برابر میں بیٹھے حنین آفریدی کے کندھے پر ہاتھ مارا۔

”بالکل ملے گی اور سزا یہ ہے کہ حنین ہی آپ کی شادی کے ہر فنکشن کا سوٹ شادی کی پوری تیاری یہ لا روش کو اپنے پاکٹ منی سے کرائیں گے۔“

”یہ سزا.....“ حنین آفریدی یکدم خاموش ہو گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ذہن میں حسن آفریدی گھوم گیا۔ اس نے بھی تو ہم سب لوگوں سے دور رہ کے سزا کاٹی ہے اکیلے ہی سب سنبھالا ہے اور اب گھر کی شادی ہے وہ کیسے اس گھر کی شادی میں نہ ہو۔

”کیا ہوا یہ سزا کم ہے کیا؟“ سلجوق آفریدی نے پر مزاح انداز میں اسے چھیڑا تھا۔

”میرے پاس آپ سب کے لیے ایک سر پرانز ہے۔“

”بات پلٹنا تو کوئی تم سے سیکھے۔“

”او کے نہ یقین کریں مگر جب یہ سر پرانز کا بم پھٹے گا تو آپ سب مجھے شادی کی شاپنگ کرانے کی آفر کریں گے۔“

”بیٹا! مجھے مغرب کی نماز ادا کرنی ہے میں تو چلوں۔“ بی جان کو اس کا سب پتہ تھا۔ یقیناً کوئی لڑکی کی کہانی ہوگی اور ابھی ان کے پاس ٹائم نہیں تھا کہ وہ سٹیں۔ ”بی جان سمجھ گئی ہیں تمہارے سارے بہانے اور میں بھی جانتی ہوں کہ یقیناً کسی لڑکی کے بارے میں کوئی سر پرانز ہے مگر یاد رکھنا اس بار تمہارے بابا



تمہارے کان پکڑیں گے۔“ زوہاریہ بھی بوری ہوتی ہوئی انھیں اور ساتھ لاروش اغولان بھی۔

”بھئی میں تو آپ سب کو سر پرانزدے رہا تھا ابھی، اب انتظار کریں پھر مجھ سے شکایت مت کرنا۔“

”کسی میں ہمت نہیں ہے اس وقت پکنے کی سوباتیں مت بناؤ۔“

”یہ تم کہاں جا رہی ہو۔ مجھے کچھ کھانے کو تو دے دو بھوک لگ رہی ہے۔“ حنین نے جاتی ہوئی لاروش

اغولان کو ٹوکا تھا۔ لاروش اغولان نے پلٹ کر دیکھا تو اس نے اتنی معصوم سی شکل بنالی تھی کہ اسے ترس آ گیا۔ سلجوق آفریدی نے مسکرا کے دیکھا۔

وہ اندر جانے کا ارادہ کینسل کرتی ہوئی پکن میں چلی آئی تھی۔

☆.....☆

حرا اور سلجوق آفریدی کی شادی کے سلسلے شروع ہو چکے تھے۔ تاریخ رکھ دی گئی تھی۔ اس اچانک شادی پر سب خوش تھے مگر جو جھنجھلا گئی تھی وہ بھی ڈالے جسے اپنی شاپنگ کی فکر لاحق ہو گئی تھی۔

”شادی کی اتنی جلدی کیا پڑی تھی میری تو کوئی شاپنگ نہیں ہے۔ شادی میں پہننے کے لیے ہر فنکشن کا

سوٹ چاہیے۔“ وہ جھنجھلاتی ہوئی بولی تھی۔

”جی ہاں ہم سب جانتے ہیں کہ جب تک ڈالے مارکیٹ کے دس چکر نہ لگالے سب کا کھانا ہضم نہیں

ہونے دے گی۔“ عارفین نے جی بھر کے چڑایا۔

”آپ تو چپ ہی رہیں تو اچھا ہے لیکن میں نے بھی سوچ لیا ہے کہ میں مقسوم بھابی کو ہی پکڑوں گی۔

مقسوم بھابی آپ میرے ساتھ شاپنگ پر چلیں گی نا؟“ ڈالے کا ڈائریکٹ رخ مقسوم کی سمت تھا۔

”میں.....“ ڈالے کا رخ اور پھر ڈائریکٹ اس سے کہنا سب کے درمیان وہ بھونچکا کے رہ گئی تھی۔ اس

کی شکل پر ایسی مسکینی تھی جو حلال ہونے والے بکرے کی شکل پر قربانی کے بعد ہوتی ہے یا جیسے کسی مجرم کو

پھانسی پر لٹکانے پر اس سے آخری خواہش پوچھ لی ہو۔ مقسوم کی معصومیت بھری شکل دیکھ کر عارفین کا چہرہ

پھاڑتہ پورے ہال میں گونجاتھا۔ ڈالے نے نہایت گھور کے عارفین کو دیکھا پھر مقسوم کو دیکھا تھا۔

”ڈالے! میں ضرور چلتی مگر تم دیکھو ماں آج کل عارفین کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ ان کے لیے

سوپ پر ہیزی کھانا اور دوائی وغیرہ کا خیال مجھے ہی دیکھنا ہوتا ہے۔“

”مقسوم بھابی! آپ کو عارفین بھابی کی محبت نے سچ کا بگاڑا ہے۔“ عارفین اس پر بھی چپ نہیں رہا۔

ایک تو مقسوم کا بہانہ پھر ڈالے کی بات وہ پھر سے زور سے ہنساتھا۔

ڈالے نے ثمرن کو دیکھا تھا۔ ثمرن جو کیری کاٹ میں لیٹے اپنے بیٹے کو جھلا رہی تھی اس کے ہاتھ میں

ڈرا تیزی آگئی تھی۔

”اللہ ڈالے! میں تو ضرور چلتی مگر دیکھو تو تمہارا بھتیجا اتنا روتا ہے کہ کیا بتاؤں وہ میرے بغیر رہتا ہی نہیں

ہے۔“

”ثمرن بھابی! ہم زیادہ ٹائم نہیں لیں گے۔“

”نہیں چندا! پوٹ بہت روتا ہے اور مارکیٹ میں تو مزید گھبرائے گا۔“

”ثمرن، لاروش کا کوئی فون وغیرہ آیا، کہاں ہے وہ کچھ اتنا پتا شادی میں بلایا ہے نا اس بچی کو؟“ رابعہ کو

اچانک سی لاروش اغولان کی یاد آئی تھی۔



# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✦ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسجے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

**We Are Anti Waiting WebSite**

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

# WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on  
Facebook

[fb.com/paksociety](https://fb.com/paksociety)



[twitter.com/paksociety](https://twitter.com/paksociety)



”رابعہ پھپھو! لا روش کو اس کا ہسینڈ لے گیا ہے اور فون تو کوئی نہیں آیا۔ میں بھی انتظار کر رہی تھی۔ اس کے فون کا کہ اگر آئے گا تو بلاؤں۔“

”ماشاء اللہ سے اتنی پیاری بچی تھی کہ دل خوش ہوتا تھا اس بچی کو دیکھ کر۔“ رابعہ کی نظروں میں لا روش اغولان کا چہرہ گھوم گیا تھا۔

”اگر وہ یہاں ہوتی تو وہ ڈالے کے ساتھ چلی جاتی۔“

”جی ہاں بجا فرمایا آپ نے جو یہاں موجود ہیں وہ تو میرے ساتھ چل نہیں رہی ہیں اور جو نہیں ہیں ان کی فکر کے لیے کھل رہی ہیں۔“ ڈالے ہٹن کی چالاکی سمجھ گئی تھی۔

”بے چاری بچ گئی۔“ ارشد نے دھیرے سے کہا تھا۔

”مت جاؤ کوئی بھی میری بیسٹ فرینڈ حرامیرا ساتھ کبھی نہیں چھوڑے گی۔“ ڈالے نے بڑے یقین سے کہتے ہوئے حرامیرا کے گلے میں ہاتھ ڈالا تھا۔

”سوری یا ڈالے! میں تو مایوں بیٹھ رہی ہوں ابھی کل ہی پانچ ہزار کا فیشل، مٹی پور پیڈی کیور کروایا ہے، دھوپ اور گرمی سے خراب ہو جائے گا۔“ ڈالے کا ہاتھ اپنے گلے سے نکالا اور تھوڑا پیچھے کھسکی تھی۔

”دیکھ لیا کوئی حامی نہیں بھر رہا تھا۔ تمہاری بیسٹ فرینڈ حرامیرا نے بھی ہری جینڈی دکھا دی۔ اب سمجھ جاؤ کہ تمہارے ساتھ شاپنگ پر جانا دانتوں کے نیچے پسینا آنے کے مترادف ہے۔“ ارشد باز نہیں آیا تھا اسے چھیننے سے۔

”مجھے تو لگ رہا ہے آپ نے پیسہ کھلایا ہے ان لوگوں کو۔“ ڈالے نے تپ کر عارفین کو دیکھا تھا۔

”خدا کا خوف کرو کیوں مجھے مشکوک بنا رہی ہو۔“

ڈالے کچھ بولتی کہ زرمیل بول پڑا۔

”ڈالے اپنی شاپنگ کی ساری لسٹ بندرہ منٹ میں بناؤ میں لے کر چلتا ہوں ابھی۔“

”چلو جی آگیا زرمیل کو جوش۔“ عارفین نے اپنے دونوں ہاتھ جھاڑے تھے۔

”آپ!“ اب شپٹانے کی باری ڈالے کی تھی۔

”کیوں میں نہیں چل سکتا کیا؟“ زرمیل نے سنجیدگی سے کہا۔ وہ کافی دیر سے بیٹھالیپ ٹاپ پر کچھ

کر رہا تھا۔

”نہیں زرمیل وہ بات نہیں ہے مگر آپ کو شاپنگ کرنا نہیں آتی ہے۔“ وہ منمنائی تھی۔

”لیکن تمہیں شاپنگ میں ہی کراؤں گا کیوں کہ تمہیں میرے علاوہ کوئی ہینڈل نہیں کر سکتا۔“ زرمیل

نے لیپ ٹاپ بند کر کے ٹیبل پر رکھ دیا تھا اور بغور ڈالے کو دیکھا۔

”جی میرے شیر۔“ عارفین نے پھر جملہ کسا۔

”اچھا آپ رہنے دیں میں ارشد بھائی کے ساتھ ہی چلی جاتی ہوں۔“

”سوری گڑیا! اگر میری میٹنگز اور ڈیلی کیشن کا مسئلہ نہ ہوتا یا میں نے حسن کے ساتھ نیابزنس اشارٹ

نہیں کیا ہوتا تو میں ضرور تمہارے ساتھ چلتا مگر ابھی بالکل ٹائم نہیں ہے۔ میرے پاس لوہہ دیکھو میرا فون

بھی آگیا۔“ ارشد کا فون بچ رہا تھا۔ فون آن کر کے وہ فوراً وہاں سے نکلا تھا۔ زرمیل نے ڈالے کو ایسے

دیکھا جیسے کہہ رہا ہو ”اب“۔



www.Paksociety.com  
”وانیہ.....وانیہ فارغ ہے وہ میرے ساتھ چلے گی۔“  
”آئی ایم.....سو.....سوری.....ٹالے.....“ وہ گڑبڑا کے دیکھنے لگی۔

”وہ دراصل میں نے ابھی اپنی ٹانگوں کا آپریشن کرایا ہے۔ میں زیادہ چل نہیں سکتی۔ میرے پاؤں میں درد اٹھنے لگتا ہے۔“ وانیہ نے بھی خود کو صاف بچا لیا اس کا پہلا تجربہ ہی کافی تھا۔  
”تو یار! ہم کسی ریسٹورنٹ میں بیٹھ جائیں گے۔“ چہرے پر بے چارگی ہی بے چارگی تھی مگر عارفین کی دبی دبی ہنسی نہیں رک رہی تھی۔

”اوہ مائی گاڈ!“ عارفین بھرپور مزے لے رہا تھا اس وقت ڈالے کی بے چارگی کے مقسوم گھور کے رہ گئی تھی۔ عارفین کو حالانکہ اندر ہی اندر وہ خود بھی مسکرا رہی تھی مگر ڈالے کی ناراضی کی وجہ سے چپ رہی تھی۔  
”ڈالے ابھی اور اسی وقت شاپنگ کی لسٹ تیار کرو جو تمہیں چاہیے سب لکھو ایک پیپر پر میں صرف تمہیں آدھا گھنٹہ دوں گا۔ جو آئے گا آج ہی آئے گا تمہیں میرے ساتھ جہاں چلنا ہے چلو، اس کے بعد تم ہارکیٹ نہیں جاؤ گی۔“ زرمیل دو ٹوک لب و لہجے میں کہتے ہوئے اٹھا تھا۔ جب سے مویائل نکالا اور کسی کو فون ملاتا باہر نکل رہا تھا۔ شاپنگ پر جانا وہ بھی زرمیل کے ساتھ، ایک دو دفعہ وہ جا چکی تھی اس کے ساتھ۔

”جو شے تمہیں پسند آ رہی ہے گھنٹوں بحث کے چکر میں بڑے گنواؤ نہیں، خرید لو مجھے ٹائم ضائع کرنا پسند نہیں ہے۔“ بہت سال پہلے کا کہا گیا زرمیل کا یہ جملہ ابھی ابھی اس کے کان میں گونجا تھا۔  
”زرمیل نے کہا ہے کہ اسے آدھے گھنٹے بعد باہر آنا ہے تو آنا ہے ورنہ وہ بنا لسٹ کے بھی اس کو لے جائے گا اور سب جانتے ہیں کہ جو زرمیل بول دے پتھر پر لکھی لکیر ہے۔“ وہ سب کو ایک نظر دیکھ کر رہ گئی مگر اس نے غصے و غم کی شدت سے مغلوب ہو کر صرف عارفین کو گھورا تھا جس کی ہنسی کو بریک ہی نہیں لگ رہا تھا۔

”یار! میری طرف مت دیکھو ان ظالم نظروں سے میں معصوم بچہ ہوں ڈر جانا ہوں۔“ وہ ڈرنے کی ایکٹنگ کرنے لگا تھا۔

”اور تم دیکھ بھی رہی ہو کہ میرے بازو پر لگی ہے میں بیمار ہوں، مقسوم بے چاری میری تیمارداری میں لگی ہوئی ہے۔“ وہ جان کر چپکے چھوڑ رہا تھا۔ مقسوم گھورے بنا نہیں رہ سکی۔  
ڈالے نے اپنے پیچھے سے کشن نکالا اور کھینچ کر عارفین کو مارا تھا۔

”مجھ سے بات بھی مت کیجیے گا۔“ نہایت جل بھن کر وہ پیر پختی ہوئی وہاں سے نکلتی چلی گئی تھی مگر پیچھے سے عارفین کا ایک اور جاندار قہقہہ ضرور اس کی جان جلا گیا تھا۔

”عارفین! بہت بد تمیز ہیں آپ، اتنا تنگ کرتے ہیں آپ ڈالے کو۔ سچی اس بار آپ کی کوئی خلاصی نہیں ہوگی۔“ مقسوم نے اپنی مسکراہٹ دباتے ہوئے کہا تھا۔

”ٹھہرو بھئی مجھے سانس لینے دو ڈالے کے غم و غصے کی وجہ سے کب سے سانس روکے بیٹھی تھی۔“ رابعہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”لود دیکھ لو۔“ عارفین نے مقسوم سے کہا۔ مقسوم رابعہ کو دیکھ کر ہنس دی۔

”امی! ڈالے بہت غصے میں گئی ہوگی عارفین نے مزید اسے غصہ دلا دیا ہے۔“



”اگر تمہیں اتنی فکر ہے تو جاؤ تم چلی جاؤ ڈالے کے ساتھ شاپنگ پر۔“  
”خدا کو مانے عارفین! میں نے آپ سے یہ کب کہا ہے کہ میں ڈالے کے ساتھ شاپنگ پر جاؤں۔“  
مقسوم اس طرح گڑبڑائی جیسے ابھی ڈالے کہیں سے نکل کر آئے گی اور اس کا ہاتھ پکڑ کے لے جائے گی۔  
عارفین اس کے گڑبڑانے پر ہنس دیا تھا۔

”خوب ہنس لو مگر یاد رکھنا ڈالے تمہیں چھوڑنے والی نہیں ہے اس بار۔“ ثمرن نے اپنے بیٹے یوشع کو  
کیری کاٹ سے نکالا جو رونے لگا تھا۔ بیٹی عانیہ آپہ کے پاس تھی۔  
”دیکھیں گے۔“ عارفین نے بات ہو میں اڑائی۔

”دیکھ لیجئے گا مگر میں ڈالے کا ہی ساتھ دوں گی۔“ مقسوم کھڑی ہو گئی تھی۔  
”ابھی تم ہی بڑی بڑی تقریریں کر رہی تھیں کہ میں عارفین کی تیمارداری کر رہی ہوں ان کا خیال رکھ  
رہی ہوں وغیرہ وغیرہ اب فوراً پارٹی بدل لی یعنی شوہر کی نافرمانی۔“ عارفین نے مقسوم کو مسکرائے دیکھا مگر  
مقسوم نے کچھ نہیں کہا اور ایک پتی ہوئی نظر سے دیکھتی ہوئی چلی گئی کیوں کہ وہ سمجھ گئی تھی عارفین اس وقت  
فل موڈ میں ہے۔

”عارفین! تمہاری خیریت نہیں ہے آج مقسوم بھی چھوڑ کے چلی گئی اور میں بھی جا رہی ہوں۔“ ثمرن،  
یوشع کو لے کر نیچے آنے لگی تھی ڈالے کے پاس۔  
”یعنی میں اکیلا محاذ پر کھڑا ہوں۔“

”جی ہاں اور میں تو ویسے بھی ڈالے کی بیسٹ فرینڈ ہوں۔“  
”بیسٹ فرینڈ، بہت خوب تو ذرا اپنی دوستی بھاؤ، جاؤ ڈالے کے ساتھ شاپنگ پر۔“ عارفین نے حرا کو  
رگیدا۔

”ہاں تو.....“  
”تو.....“ عارفین نے فوراً کہا حرا نے گھور کے دیکھا اسے۔  
”صحیح کہتی ہے ڈالے آپ ہیں ہی بدتمیز۔ اچھی بات ہے آپ کی کلاس لی جائے۔“ حرا تیزی سے  
وہاں سے نکلی۔

”کہاں جا رہی ہو رکو ابھی بلاتا ہوں۔ ڈالے کو کہتا ہوں کہ حرا جانے کو تیار ہے تمہارے ساتھ۔“ حرا  
زور زور سے کوئی انگلش سوئگ گاتی ہوئی باہر نکلی تھی، عارفین ہنس دیا تھا۔

”دیکھیں ذرا سب ڈالے کے ساتھ ڈرتے ہیں شاپنگ پر جانے سے۔“ اس نے رابعہ سے کہا۔  
”اگر تم صحیح ہوتے ناتو زبردستی میں تم کو ڈالے کے ساتھ بھیجتی۔“

”امی تسلی تو کر لیجئے سب ڈرتے ہیں اس سے۔ مراد اس میں، میں بھی شامل ہوں۔“  
”مگر تمہارے لیے اس سے اچھی سزا ہو ہی نہیں سکتی۔“ عارفین مسکرا دیا تھا۔

☆.....☆

حسن آفریدی اور رابعہ کے پورشن میں آیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں خاکی کلر کا ایک لفافہ تھا گھر میں سب  
لوگ شادی کی تیاریوں میں لگے ہوئے تھے۔ وہ بھی ابھی حسین آفریدی کے ساتھ شاپنگ مال سے آیا تھا۔  
حسین آفریدی نے لاروش اغولان کے لیے بہت سی شاپنگ کی گئی۔ وہ تو گھر چلا گیا تھا۔ حسن آفریدی



یہاں آ گیا تھا۔ رابعہ مقسوم شاپنگ پر گئی ہوئی تھیں۔ وانیہ نے جانے سے منع کر دیا تھا۔ وہ اپنے روم میں بیڈ پر نیم دراز کوئی میگزین پڑ رہی تھی۔ جیسی دروازے پر دھیرے سے دستک ہوئی تھی۔ وانیہ نے دروازے کی طرف دیکھا اور میگزین ٹیبل پر رکھ کے دروازے کی سمت بڑھی تھی۔ دروازہ کھولا وہاں حسن آفریدی کھڑا تھا۔

”السلام علیکم!“

”وعلیکم السلام۔“ اس نے جھکتے ہوئے جواب دیا تھا۔

”وہ عارفین بھائی تو گھر پر نہیں ہیں۔“

”میں نے آپ سے کب کہا کہ مجھے عارفین سے ملنا ہے۔“ حسن آفریدی نے مسکراتے ہوئے اس کی جھک سے حظ اٹھایا تھا۔ وہ خاموش رہی مگر اس کی آنکھوں اور چہرے پر سوالیہ نشان ضرور پڑھا جاسکتا تھا۔

”اگر آپ برانہ مانیں تو میں آپ کے لیے یہ لایا تھا۔“ حسن آفریدی نے ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا تھا جس میں وہ خاکی لفافہ تھا۔

”یہ..... یہ کیا..... ہے؟“ وانیہ نے وہ خاکی لفافہ دیکھا اور اندر سے گھیرا لے لیا۔

”میں ابھی مال سے آرہا ہوں مجھے یہ سوٹ بہت پسند آیا تو میں نے آپ کے لیے لے لیا۔ مجھے خوشی ہو گی اگر آج کی کپاسن مایوں میں آپ یہ سوٹ پہنیں گی تو۔“ وانیہ نے حسن آفریدی کی بلوریں آنکھوں میں دیکھا۔

”پلیز لے لیجیے اگر آپ نے میری خواہش کا احترام کیا تو میں سمجھ جاؤں گا کہ آپ کے دل میں میرے لیے کوئی سوٹ کارنر ہے۔“

وانیہ شش و پنج میں پڑھ گئی تھی اس کے پرسوں چہرے کو حسن آفریدی نے بغور دیکھا تھا اور دھیرے سے مسکرا دیا تھا۔

”وانیہ!“ گھمبیر لہجے میں ہولے سے پکارا تھا۔

وانیہ نے نظر اٹھا کے دیکھا۔

”پلیز.....!“ حسن آفریدی کے لہجے میں ایسی التجا تھی کہ نہ چاہتے ہوئے بھی جانے کیوں وانیہ نے ہاتھ بڑھا دیا۔

”ہینکس۔ آج رات میں آپ کی ہاں کا انتظار کروں گا۔“

اور پھر وہ رکنا نہیں وانیہ کے چہرے پر ایک اپنائیت بھری نظر ڈالتا ہوا وہاں سے نکلتا چلا گیا تھا۔ وانیہ نے جاتے ہوئے حسن آفریدی کو ایک نظر دیکھا پھر اس بند خاکی لفافے کو اور دروازہ بند کر کے بیڈ پر آ کر پھر سے بیٹھ گئی۔ کتنی ہی دیر تک اس نے اس بند خاکی لفافے کو دیکھا تھا۔ بالآخر بہت سوچنے کے بعد اس نے وہ خاکی لفافہ کھولا تھا جس میں سے نہایت ہی قیمتی خوب صورت سی بائل گرین اور میرون امتزاج کی ٹیٹ کی اٹھارہ کلیوں والی فرائک نکلی تھی۔ جس پر بہت ہی نازک مگر مہنگا کام کیا گیا تھا جو بول رہا تھا کہ یہ فرائک بہت ہی مہنگی ہے اس کا دوپٹہ تو زیادہ خوب صورت تھا پورے دوپٹے پر چوڑی سی ایپلک کے ساتھ کڑھائی ہوئی تھی۔ وانیہ نے پورا دوپٹہ کھولا تھا۔ بے شک حسن آفریدی کی چوائس لا جواب تھی اس کی سوچوں کا محور حسن



آفریدی ہی تھا وہ دلکشی سے مسکرانے لگی تھی مگر یہ مسکراہٹ تادیر اس کے ہونٹوں پر نہیں رہ سکی تھی۔ اس کے ذہن کی اسکرین پر ہی نہیں آنکھوں کی پتلیوں پر بھی ایک چہرہ پورے استحقاق وطمطراق کے ساتھ وارد ہوا تھا اور وہ چہرہ وہ عکس تھا آفریدی کا۔

”نہیں یہ ٹھیک نہیں ہے۔ یہ غلط ہے مجھے سنے دیکھنے کا کوئی حق نہیں ہے اور نہ ہی حسن کو دھوکے میں رکھ کر اس کے ساتھ زیادتی کرنی ہے۔ یہ سراسر نا انصافی ہے اس کے ساتھ وہ میری پچھلی زندگی سے ناواقف ہے اور اگر اسے میری گزری پچھلی زندگی کے بارے میں پتا چل گیا تو وہ مجھ سے نفرت کرے گا تا صرف بلکہ اپنے بڑھتے قدموں کو بھی روک لے گا۔“

ان گلابی آنکھوں میں سے جانے کب دو موتی ٹوٹ کر حسن آفریدی کے دیے ہوئے سوٹ پر گرے اور اندر ہی جذب ہو گئے تھے۔ وانیہ نے اس سوٹ پر ایک افسردہ بھری نظر ڈالی تھی اور پھر اسے واپس تہ کر کے اسی خاکی لفافے میں قرینے سے ڈال دیا تھا۔

☆.....☆

لاروش اغولان، حنین آفریدی کا بیڈروم سمیٹ رہی تھی۔  
 ”پتا نہیں کیوں اتنا پھیلا دیتے ہیں یہ سب، ایسا لگتا ہے جیسے پوری رات اپنے کمرے کی ہر شے سے قائم نگ کرتے ہیں۔“ وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑا رہی تھی۔ حنین آفریدی نے پورے کمرے کو تہس نہس کیا ہوا تھا۔ وہ وارڈروب میں کپڑے رکھنے لگی تھی کہ ایک شاپراؤپر کے خانے سے اس کے پیروں پر گرا تھا۔ لاروش اغولان نے وہ شاپر دیکھا۔ پھر ہاتھ میں تہہ شدہ اس کے کپڑے خانے میں رکھ کے وہ شاپرا اٹھانے کو جھکی شاپر کھولا اس میں سے ایک چھوٹی سی ٹاپ یلو کلر کی نکلی جس پر ریڈ کلر سے پریٹی لکھا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ہی جینز کی بلک ٹائس تھی۔ لاروش اغولان نے نہایت عجیب نظروں سے وہ ٹاپ اور ٹائٹس دیکھا تھا۔ اسی اثناء میں حنین آفریدی بھی بیڈروم میں آ گیا تھا۔ حنین آفریدی نے اس کے ہاتھ میں وہ ٹاپ اور ٹائٹس دیکھا تو اسے یاد آیا کہ وہ یہ سمعیہ زیدی کو پارٹی میں دینے کے لیے لایا تھا مگر حالات ایسے ہو گئے کہ یہ رکھا کارکھا ہی رہ گیا۔

”کیسا لگ رہا ہے تمہیں یہ؟“ حنین آفریدی نے مسکراتی آواز میں اسے چونکا دیا تھا۔

”یہ کس کا ہے اور آپ کی الماری میں کیا کر رہا ہے؟“ لاروش اغولان نے حق سے پوچھا تھا۔

”تمہیں لگ کیسا رہا ہے یہ بتاؤ۔“

لاروش اغولان نے کچھ نہیں کہا خاموشی سے وہ ٹاپ اور ٹائٹس تہہ کر کے واپس شاپر میں ڈالنے لگی تھی کہ حنین آفریدی آگے بڑھا تھا۔

”ارے یار! کیا ہوا اچھا نہیں لگ رہا کیا دیکھو تو ذرا۔“ حنین آفریدی نے اس کے ہاتھ سے شاپر لیا

اور اس میں سے وہ یلو ٹاپ نکال کر اس پر لگایا۔

”دیکھو کتنی اچھی لگ رہی ہے اور آج کی پارٹی ویئر کے حساب سے یہ کلر بھی اچھا لگے گا۔“

”آپ کو لگتا ہے یہ اتنا واہیات سوٹ میں پہنوں گی؟“ لاروش اغولان نے وہ ٹاپ سمیت اس کا ہاتھ

جھٹکا تھا۔

”واہیات کی کیا بات ہے لڑکیاں پہنتی ہیں ایسے سوٹ۔“

(جاری ہے)



ایف ایم 95 پنجاب رنگ کے پریزنٹر

R.J عامر حیات

ملاقات



ایف ایم 95 پنجاب رنگ اور ایف ایم 106-6 کے معروف آر جے عامر حیات جب آن ایئر ہوتے ہیں تو ان کا اپنا منفرد انداز ہوتا ہے جو لسنرز بہت پسند کرتے ہیں ان کے شو کے انتظار میں ہوتے ہیں۔

عامر حیات سے کیا گیا ایک انٹرویو قارئین کے لیے پیش خدمت ہے۔

☆ السلام علیکم جی عامر حیات کیسے ہیں آپ؟  
☆ وعلیکم السلام سائل خیریت سے ہوں۔

☆ آپ کا پورا نام کیا ہے؟

☆ عامر حیات۔

☆ تاریخ پیدائش۔

☆ 12 مئی 1988ء۔

☆ آپ کا اشار کیا ہے اور اشارز پر یقین رکھتے ہیں؟

☆ Twrus ہے اور اشار پر کم یقین رکھتا ہوں۔

☆ ایف ایم کی فیلڈ میں کیسے آنا ہوا؟

☆ شروع سے ہی ریڈیو اور ٹی وی چینلز پر کام کرنے کا شوق تھا۔ اس شوق کی وجہ سے ایف ایم کی فیلڈ میں آ گیا۔

☆ ایف ایم پر کس نے متعارف کروایا؟

☆ ایف ایم پر بہت پیار کرنے والے میرے ماموں لیاقت علی اور ان کے بڑے اچھے دوست شاہین بھٹی صاحب نے متعارف کروایا۔

☆ پہلا پروگرام کہاں سے کیا؟

☆ پہلا پروگرام ایف ایم 95 کے معروف آر جے ممتاز ملک کے ساتھ کیا۔

☆ پہلا پروگرام کیا تو کیا کیفیت تھی؟

☆ پہلا پروگرام جب کیا تو بہت کنفیوژ تھا اور ڈر لگ رہا تھا کوئی غلط بات نہ کر دوں۔ کیونکہ پہلی دفعہ میری آواز آن ایئر جا رہی تھی۔

☆ آج کل کون سے شو کر رہے ہیں؟

☆ آج کل ایف ایم 95 پنجاب رنگ لاہور سے پروگرام ”گلاں دل دیاں“ اور بوم ایف ایم 106.6 سے Bombastic Moring کے نام سے شو کر رہا ہوں۔

☆ کون سا پروگرام وجہ شہرت بنا؟

☆ ایف ایم 95 پنجاب رنگ سے مارننگ شو کرتا رہا جو کہ وجہ شہرت بنا۔



زیادہ فرق ہے۔ گھریا دوستوں کے ساتھ آپ جس طرح چاہیں بول سکتے ہیں لیکن ایف ایم پر ایک مخصوص انداز اور اخلاقیات کے دائرے میں رہ کر اچھی بات دوسروں تک پہنچانی ہوتی ہے اور ایسے کہ دوسرے اچھے طریقے سے سمجھ سکیں۔

☆ ایف ایم کے علاوہ آپ کی مصروفیات کیا ہیں؟  
 ﴿ ایک نیوز چینل میں جاب کر رہا ہوں اور زیادہ جاب میں ہی مصروف رہتا ہوں۔

☆ کھانے میں کیا شوق سے کھاتے ہیں؟  
 ﴿ کھانے میں بریانی شوق سے کھاتا ہوں۔  
 ☆ پسندیدہ خوشبو؟  
 ﴿ خوشبو ہر قسم کی پسند کرتا ہوں چاہے وہ پھولوں کی ہو یا رقیوم کی۔ گلاب کی خوشبو زیادہ پسند کرتا ہوں۔

☆ کس ساٹھی پر ریٹائرمنٹ کے ساتھ شو کرنے میں مزہ آتا ہے؟  
 ﴿ جو میری طرح ہلکے ہلکے انداز میں بات کرے اور ہنسی مذاق کا ماحول رہے۔

☆ آپ کے خیال میں ایک آر جے دوسرے کی نقل کر رہا ہے؟  
 ﴿ ایک آر جے دوسرے کی نقل کر سکتا ہے لیکن نقل کرنے والے انسان کی ہمیشہ اپنی کوئی پہچان نہیں ہوتی۔ وہ ہمیشہ دوسروں کے نام سے ہی پہچانا جاتا ہے۔

☆ ایک اچھے اور معیاری پروگرام میں آر جے کا کتنا ہاتھ ہوتا ہے؟  
 ﴿ ایک اچھے اور معیاری پروگرام میں ایک آر جے کا ہی ہاتھ ہوتا ہے۔ وہی لوگوں کی پسند اور نا پسند کا خیال رکھتے ہوئے پروگرام کو بہتر کر سکتا ہے۔

☆ دوستوں کو ایس ایم ایس کرنا اچھا لگتا ہے کہ فون کرنا؟  
 ﴿ دوستوں کو ایس ایم ایس کرنا اچھا لگتا ہے لیکن جہاں کال کی ضرورت ہوتی ہے وہاں کال بھی

☆ اپنے شو میں کس موضوع پر زیادہ بات کرتے ہیں؟  
 ﴿ میں اپنے شو میں کبھی بھی ایک ٹاپک پر بات نہیں کرتا۔ کوشش کرتا ہوں کہ ہر دفعہ ایک نئے ٹاپک پر بات کروں تاکہ لوگوں تک کوئی نئی اور اچھی بات پہنچا سکوں۔

☆ ایف ایم کا کامیاب ترین پروگرام کون سا تھا؟  
 ﴿ ایف ایم 95 پر پروگرام ”گلاں دل دیاں“ کامیاب ترین پروگرام تھا۔  
 ☆ کبھی ایسا ہوا کہ پروگرام کرنے کو دل نہ چاہ رہا ہو لیکن پروگرام کیا ہو؟  
 ﴿ جی ہاں! بہت دفعہ ایسا ہوا کہ پروگرام کرنے کو دل نہیں چاہ رہا ہوتا لیکن پروگرام کیا ہے۔

☆ لسٹرز کی طرف سے آپ کے پروگرامز کا کیا فیڈ بیک ملتا ہے؟  
 ﴿ لسٹرز کی طرف سے بہت زیادہ فیڈ بیک ملتا ہے اور بہت سے لوگ بہت محبت سے اور چاہت سے میرا پروگرام سنتے ہیں۔ جب لسٹرز کی کالز اور میسج ملتے ہیں تو خوشی ہوتی ہے کہ اتنے سارے لوگ میرے شو میں ہیں اور میرے ساتھ ہیں اور پسند کر رہے ہیں۔

☆ کیا شادی شدہ ہیں؟  
 ﴿ غیر شادی شدہ ہوں۔  
 ☆ تقدیر یا قسمت کس چیز پر بھروسا کرتے ہیں؟  
 ﴿ قسمت پر بھروسا رکھتا ہوں۔  
 ☆ آپ کے نزدیک غم کیا ہے؟  
 ﴿ خوشی کے ساتھ ساتھ غم بھی زندگی کا حصہ ہیں غم نہ چاہتے ہوئے بھی برداشت کرنے پڑتے ہیں غم اپنوں سے دوری کا احساس۔

☆ عام بولنے اور ایف ایم پر بولنے میں کیا فرق ہے؟  
 ﴿ عام بولنے اور ایف ایم پر بولنے میں بہت

☆ عام بولنے اور ایف ایم پر بولنے میں کیا فرق ہے؟  
 ﴿ عام بولنے اور ایف ایم پر بولنے میں بہت

☆ عام بولنے اور ایف ایم پر بولنے میں کیا فرق ہے؟  
 ﴿ عام بولنے اور ایف ایم پر بولنے میں بہت

☆ عام بولنے اور ایف ایم پر بولنے میں کیا فرق ہے؟  
 ﴿ عام بولنے اور ایف ایم پر بولنے میں بہت

☆ عام بولنے اور ایف ایم پر بولنے میں کیا فرق ہے؟  
 ﴿ عام بولنے اور ایف ایم پر بولنے میں بہت







جذبے ہونے چاہئیں۔

☆ اپنی کوئی خوبی؟

☆ کسی کو پریشان نہیں دیکھ سکتا۔

☆ کوئی خامی؟

☆ کھانا وقت پر نہیں کھاتا۔

☆ ایف ایم چینلوں کے بارے میں کیا رائے ہے؟

☆ ایف ایم پر جتنے بھی چینلوں ہوں کم ہیں

کیوں کہ ایف ایم پر آ رہے پروگرام پیش کرتے

ہیں جو ہزاروں لوگوں کے چہروں پر مسکراہٹ

لاتے ہیں۔

☆ دن کا کون سا وقت اچھا لگتا ہے؟

☆ ڈھلتا سورج اور اس کے بعد کا ٹائم بہت

پسند ہے۔

☆ کیا راستے کی دشواریاں کامیابی کی

دلیل ہیں؟

☆ کوئی بھی کامیاب انسان ایسے کامیاب نہیں

ہوا ہر کامیاب انسان کو بہت زیادہ دشواریاں

برداشت کر کے ہی کامیابی نصیب ہوتی ہے۔

☆ ردا ڈائجسٹ کے بارے میں آپ کی رائے؟

☆ ڈائجسٹ بہت سے لوگ پڑھتے ہیں

میرے خیال میں فارغ وقت میں یہ ایک اچھی

عادت ہے۔ ردا ڈائجسٹ ایک اچھا نام ہے اس کا

معیار بہت بہتر ہے۔

☆ قارئین اور لسنرز کے نام پیغام؟

☆ آپ کا اور ہمارا آواز کا رشتہ ہے اس کو ایسے

نبھائیں کہ ہمیشہ دوسروں کو اس سے خوشی ہو۔

☆ آپ کا بہت شکریہ، آپ نے کچھ ٹائم

قارئین ردا کو دیا ہے۔

☆ آپ کا بھی بہت شکریہ میں ردا کی ترقی کے لیے

دعا گو ہوں۔

☆.....

☆ آپ کی کامیابی کا راز؟

☆ اساتذہ کی محنت اور والدین کی دعائیں۔

☆ پسندیدہ گلوکارہ یا گلوکار؟

☆ لوک گلوکار اچھے لگتے ہیں۔ غزلیں زیادہ سنتا

ہوں۔ نصرت فتح علی خان، عطاء اللہ خان، نور

جہاں، لتا منگیشکر، ندیم عباس پسند ہیں۔

☆ پسندیدہ موسم؟

☆ سردیوں کا موسم پسند ہے۔

☆ آپ کے نزدیک زندگی کیا ہے؟

☆ زندگی اللہ پاک کی طرف سے دی ہوئی

ایک نعمت ہے اپنی خوشی سے زیادہ اگر دوسروں کی

خوشی کا خیال رکھیں تو میرے خیال میں یہی اصل

زندگی ہے۔

☆ ایف ایم کے معیار سے مطمئن ہیں؟

☆ جی مطمئن ہوں۔

☆ کن لوگوں پر رشک آتا ہے؟

☆ جو لوگ اپنی پریشانی چھوڑ کر دوسروں کے دکھ

میں شریک ہوتے ہیں۔

☆ کیا پہلی نظر کی محبت پر یقین رکھتے ہیں؟

☆ میں پہلی نظر کی محبت پر یقین نہیں رکھتا۔

☆ کوئی ایسی عادت جو آپ کی آپ کے

دوستوں اور گھر والوں کو سخت ناپسند ہے۔

☆ جاب کی وجہ سے دوستوں اور گھر والوں کو ٹائم

نہیں دے پاتا۔ جس کی وجہ سے مجھ سے شکوہ رہتا

ہے کہ ٹائم نہیں دیتے یہ برا لگتا ہے گھر والوں کو۔

☆ کس جذبے کی قدر کرتے ہیں؟

☆ سچے جذبے کی قدر کرتا ہوں۔

☆ شدید ادا سی میں کیا کرتے ہیں؟

☆ غمگین گانے سنتا ہوں۔

☆ کیا آج کے دور میں سچی محبت موجود ہے؟

☆ آج کے دور میں سچی محبت موجود ہے بس سچے



# روحانی ڈائری

کہیں ذکر رہتا ہے اقبال تیرا  
فسوں تھا کوئی تیری گفتار کیا تھی

سفینہ جمشید کی ڈائری سے

سیدہ شمینہ شاہین کی نظم

تربت لہورنگ ہوا  
ایک بار پھر لاشیں گریں  
پھر ز میں لہورنگ ہوئی  
پھر ایک بار کہرام مچ گیا  
یہ لاشیں ان کی ہیں جن کا قصور  
جن کا گناہ بس صرف اتنا تھا کہ وہ غریب تھے  
جن کا جرم صرف یہ تھا کہ وہ دو وقت کے لقمے کمانے  
چند روپوں کے حصول کے لیے  
گھروں کو چھوڑ کر

پردہ لسی بنے ہوئے تھے  
نجانے کس کی گولیوں کا نشانہ بن گئے  
ایک بار پھر کئی گھرا جڑ گئے  
سنا ہے ایک مقتول کے ہاتھوں پر  
شادی کی مہندی لگی تھی  
مہندی کے رنگ پر اب  
لہو کا رنگ غالب آ گیا

آہ  
کتنا سناٹا چھا گیا  
یہ بھی سنا ہے کہ اک مقتول نے کچھ دن بعد  
دلہا بننا تھا

فریدہ فریدی کی ڈائری سے

بقاء امرہوی کی غزل

مدحت اہل بیت کا یہ صلہ ہے  
ہم کو ملا ہے جو کچھ در زہرہ سے ملا ہے  
کوئی اور وسیلہ کام نہ آیا بروز حشر  
بنام حضرت زہرہ ہر ایک عذاب ملا ہے  
اپنا ایمان ہے کہ سرور کائنات کے حضور  
پہنچا ہے اسی در سے ہو کر جو بھی چلا ہے  
بگڑے ہوئے بن گئے سب کام عاصی کے  
ہر زخم ہوا مندمل ہر چاک سلا ہے  
در زہرہ وہ در ہے کہ جس کی ہے شان  
بقاء پھر نہ ہوا بند جس پر بھی اک بار گھلا ہے

گیتی آراء کی ڈائری سے

علامہ اقبال کی غزل

نہ آتے ہمیں اس میں تکرار کیا تھی  
مگر وعدہ کرتے ہوئے عار کیا تھی  
تمہارے پیامی نے سب راز کھولا  
خطا اس میں بندے کی سرکار کیا تھی  
بھری بزم میں اپنے عاشق کو شاید  
تیری آنکھ مستی میں ہوشیار کیا تھی  
تاہل تو تھا ان کو آنے میں قاصد  
مگر یہ بتا طرز انکار کیا تھی  
کھینچے خود بخود چاہ طور موٹی  
کشتش تیری اے شوق دیدار کیا تھی



وہ صفحہ تم نے دھو ڈالا  
وہ صفحہ بالکل خالی ہے  
اب کاغذ کے اس صفحے کو  
کیوں آگے لا کے رکھتے ہو  
کیوں نام پیغام، اشعار لکھیں  
ہم لوگ تو جو سرکار لکھیں  
اک بار لکھیں

آہ سارے ارمان ٹوٹ گئے ایک بار پھر بے گناہ  
لوگوں کی سسکیاں سنائی دیں  
تربت لہورنگ ہوا اور  
ایک بار پھر میری دھرتی روانھی  
غربت کے ماروں کے خون میں لتھڑے وجود  
دیکھ کر

ایک بار پھر کہرام مچ گیا  
اور ایک بار پھر دل میں یہ سوال اٹھا

یہ خون خرابہ کیوں اور  
آخر تک

### رابعہ افضل خان کی ڈائری سے

نامعلوم شاعر کی ایک پیاری نظم

بارہا ہم نے اس کو آزما کے دیکھا ہے  
بارہا وفا کا گیت ہم نے گا کے دیکھا ہے  
بارہا اس کوچے میں دل جلانے پہنچے ہیں  
بارہا ہم حال دل اس کو سنانے پہنچے ہیں

لیکن وہ جوڑکی ہے

نہیں جھرنکوں کی اور سے

چوری چوری ہم کو لگتی ہے

اور پھر ہم پہنتی ہے

یہ جو گیت محبت کا تم روز سناتے ہو

یہ جو ہر روز گلی میں میری چلے آتے ہو

کیسے تم سمجھو گے کیسے تم جانو گے

تیری دستک پہ جو کھل جائے یہ وہ در نہیں ہے

تو جہاں آن بے میرا دل وہ گھر نہیں ہے

تم اپنے دل کو لے جاؤ

کسی اور پروار ڈالو تم

ورنہ دل تو دل ہی ہے

اس کو مار ڈالو تم

☆.....

### ریمیا نور کی ڈائری سے

نامعلوم شاعر کی نظم

میں تیری ذات کا حصہ ہوں

میں تیری سوچ میں شامل ہوں

میں تیری یاد کا محور ہوں

میں تیری سانس کا جھونکا ہوں

جذبے کا کوئی نام نہیں

بس

تو میرا نام نہ پوچھا کر

### ثناء کنول اللہ دتہ کی ڈائری سے

ابن انشاء کی نظم

دل کا تمہارے جو صفحہ ہے

وہ آج جو بالکل سادہ ہے

اس پر بھی تو لکھا تھا ہم نے

اک نام کبھی

اک پیغام کبھی

اشعار کبھی

سرکار کبھی



## اشعار

سباس گل..... رحیم یارخان  
 ابھی تو زخم سبھی چاہتوں کے تازہ ہیں  
 ابھی سے سوچھی ہے پھر تم کو مسکرانے کی  
 رہمانور..... کراچی  
 ہاں میں نے تجھے چاہا انکار نہیں مجھ کو  
 یہ جرم تو ثابت ہے کیا اس کی صفائی دوں  
 ریمیل آرزو..... اوکاڑہ  
 آشوب چشم کی تریاق تیری دید  
 تیری صورت، صورتِ علاج ہے جاناں  
 سدہ شاہین..... خانیوال  
 افسانہ غم دل پر کتاب لکھوں گی  
 تمہارے نام اس کا انتخاب لکھوں گی  
 کسی کے دکھ سے ہے شاہین سچی حیات میری  
 تو کیوں نہ کانٹوں کو پھر سے گلاب لکھوں گی؟  
 فریدہ فرید..... پاکپتن شریف  
 کتنی بہاریں آئیں ٹھہریں چلی بھی گئیں  
 کھلانہ کوئی پھول میرے آنگن میں اب کے برس بھی  
 چاند عید کا اب کے بھی ہم نے تنہا دیکھا  
 ہوئی نہ کوئی دعا قبول اب کے برس بھی  
 صبا عبدالغنی..... کراچی  
 جب بھی ہم اس دنیا سے جائیں گے  
 اتنی خوشیاں اور اپنا پن دے جائیں گے  
 جب بھی یاد کرو گے ہمیں  
 ہنستی آنکھوں سے بھی آنسو نکل آئیں گے

عابد محمود..... ملکہ ہانس  
 سکوت لب پر آنکھوں میں انتظار ہے  
 ہر اک شام تری آرزو رہی مجھ کو  
 سپمانا صر..... ڈی آئی خان  
 اس غم زدہ سے پوچھو وقت سحر کی قیمت  
 جلتا ہے جس کا خون چراغوں میں رات بھر  
 ساجدہ جمشید..... ڈی آئی خان  
 ہاتھ آیا نہ کچھ رات کی دلدل کے سوا  
 ہائے کس موڑ پر خوابوں کے پرستار گرے  
 اسماء جمشید..... ڈی آئی خان  
 چہرہ بنا رہا تھا مارا ہے بھوک نے  
 لوگ کہہ رہے ہیں کچھ کھا کے مر گیا  
 عائشہ سجاد..... ڈی آئی خان  
 اسے کہنا صدا موسم بہاروں کے نہیں رہتے  
 پتے جب بھی گرتے ہیں جب ہوائیں رخ بدلتی ہیں  
 ثناء سجاد..... ڈی آئی خان  
 باہر گلی میں ہلچل سی سچ گئی وصی  
 بارش کے بعد چھت سے جو اس نے جھاڑی زلفیں  
 شمینہ سلیم..... کراچی  
 اک بیٹھا درد بھی دل میں کبھی پیدا ہو  
 کیا اکیلے میں کسی دن آپ نے سوچا ہمیں  
 تو سمندر ہے ہماری پیاس کی کچھ لاج رکھ  
 یوں نہ اک دو گھونٹ پانی کے لیے ترسا ہمیں  
 ☆.....



# اس ماہ میں

پیغام، خالص سیاحوں کا شہر ہے۔ جہاں آپ اپنے جاننے والوں سے ملاقات کرتے ہیں۔ اس ملک میں چین نامی ریسٹورنٹ بھی ہے جہاں ہر طرح کے پکوان ملتے ہیں۔ الغرض اس خوب صورت سے ملک کی جتنی تعریف ہو کم ہے۔ یقین نہیں تو آپ خود جا کر سر کر آئیں جہاں قدم قدم پر خلوص پیار کے ساتھ ویلکم کے بورڈ آؤٹز ہیں۔، اس ملک کو اور اس سیاح کو اپنی دعاؤں میں یاد رکھیے گا اور ضرور بتائیے گا یہ سفر کیسا رہا؟

افشاں علی۔ کراچی

## اس ماہ کی محبت

ہر انسان اپنی زندگی میں ایک بار ضرور اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو جاتا ہے۔ خدا کے سوا کسی انسان کے آگے جھک جاتا ہے۔ اس کے لیے اپنے سجدے فنا کرتا ہے اور اس کے لیے وقت پر سجدے کرتا ہے۔ دعائیں مانگتا ہے اور خدا سے شکوے کرتا ہے۔ اس کی دی ہوئی نعمتوں کو بوجھ سمجھتا ہے صرف ایک انسان کی خاطر اور یہ سب کرنے کی وجہ ہوتی ہے ”محبت“..... صرف محبت!

راجکماری سارہ احسان۔ بہاولپور

## اس ماہ کا ڈائٹ پلان

ڈائٹ پلان کو چین کر قائم ایسی رہتی ہیں اپنی بھوک پیاس کو شام تک وہ سہتی ہیں ڈائٹنگ کے اوقات مقرر 9 ٹو 5 رہتی ہیں

ایک سفر ردا افشاں علی کے ساتھ  
السلام علیکم! پیاری پیاری قارئین! آج آپ کو مابدولت یعنی افشاں علی ایک سفر پر لے کر جائیں گی تو آئیے جناب اپنے سفر کا آغاز کرتے ہیں۔

”ردا نامی یہ ملک بہت کم ہی عرصے میں آسمان ادب کا ایک درخشاں ستارہ بن کر چمکا ہے۔ اس کی دن گئی رات چوگنی ترقی سے ہر کوئی واقف ہی ہے۔ تو مابدولت اور آپ سب کی جانی پہچانی افشاں علی نے سوچا اپنے قلم سے اس خوب صورت سے ملک کی شان میں کچھ الفاظ تحریر کیے جائیں۔ ردا کے ملک کا داخلی دروازہ ”گوشہ آگہی“ ہے۔ جس سے گزرے بغیر ہم ملک کی حدود میں داخل نہیں ہو سکتے جیسے ہی ہم یہ دروازہ کراس کرتے ہیں ”ردائے جنت“ نامی لائبریری ہماری منتظر ہوتی ہے۔ جہاں ہر مسافر کو اچھی اچھی باتیں سیکھنے کو ملتی ہیں۔ اس کے علاوہ آگے بڑھنے کے ساتھ ساتھ یہاں ہم نئے نئے لوگوں سے ملاقات بھی کرتے ہیں۔ اس ردا ملک کی ملکہ خاص صالحہ محمود ہیں یہاں کے محل ردا کی شہزادیوں میں پرستان سے ہر بار نئی نئی پریاں ملنے آتی ہے۔ ردا ملک کے چار صوبے ہیں۔ مکمل ناول، سلسلے وار ناول، افسانہ اور ناولٹ۔ اس ملک میں بہت ہی خوب صورت اور ترقی یافتہ شہر آباد ہیں جیسے اشعار، خوشبو، اس ماہ میں، ردا کی ڈائری، سنگھار، دوستوں کے نام



اور اس کی روشنی کی کرن نے اس کو اپنے دامن میں سمیٹ لیا اور بارش کا ایک قطرہ اس کے ماتھے کو چھوتا ہوا اس کے دل پر آگرا جس نے نرمی سے اس کے آنسوؤں کو دھو ڈالا اور آنکھوں میں امید کا دیا جلا دیا اور دل میں آرزوؤں کا شہر بسا دیا۔ پھر اس سکتے وجود نے اذیت بھرے لمحات کا تصور دل سے نوج ڈالا۔ اب اسے اپنے جلتے پاؤں اور ان سے رسنے والے خون کی پرواہ نہ تھی بس وہ امید اور یقین کی ڈور اپنے ہاتھ میں تھامے اپنی منزل کی طرف گامزن ہو گیا۔

ڈنر کے ٹائم پر لیکن آف ڈیوٹی رہتی ہیں ان کی فیکر پہ دکھی کترینہ کرینہ رہتی ہیں شوقیہ ایکسٹرالارج کپڑے پہنے رہتی ہیں شام ڈھلے جب میاں آئے، تو وہ کہتی ہیں فرق پڑا ہے مجھ پہ سکھیاں میری کہتی ہیں ڈائمنگ کی خوشی میں ٹریس باقی رہتی ہیں اک ڈنر اور بیٹھے کی متلاشی سی رہتی ہیں اتنی ڈائمنگ کے بعد اب تھوڑا جی لیتی ہیں بس ڈبل چیز کا برگر، پیزا، شیکس لیتی ہیں شمینہ فیاض۔ کراچی

حریم فاطمہ۔ جھنگ

اس ماہ جواب دیں.....!

☆ خشک سالی زیادہ خطرناک ہے یا صرف سالی؟

☆ بیوی کی ڈانٹ زیادہ زور دار ہوتی ہے یا ساس کی؟

☆ شوہر کی زندگی پہلے ختم ہوتی یا بیوی کی فرمائشیں؟

☆ عورت کے آنسو مرد کو جلدی گھائل کرتے ہیں یا اس کی مسکراہٹ؟

☆ عورتیں دکھاوے کے لیے روتی ہیں یا دکھاوا انہیں رلاتا ہے؟

☆ لڑکیاں ایک دوسرے سے زیادہ حسد کرتی ہیں یا عورتیں؟

☆ آج کل برقع پردے کے لیے پہنا جاتا ہے یا چہرے کے عیب چھپانے کے لیے؟

☆ ماں کی دعا جنت کی ہوا کہلاتی ہے تو ساس کی دعا کیا کہلائے گی؟

☆ محبوبہ کو دیکھنے سے دل کی دھڑکن زیادہ تیز ہوتی ہے یا محبوبہ کے ہٹے کٹے بھائی کو دیکھنے سے؟

☆ میاں بیوی گاڑی کے دو ایسے پسے ہیں جس میں ایک بھی خراب ہو جائے تو زندگی کی گاڑی نہیں

اس ماہ کا مزاحیہ قطعہ

قلم دو چار ایسے ہی لگا لیتا ہوں جیبوں میں مرے احباب میں اس سے میری توقیر بڑھتی ہے کبھی لکھنے لکھانے کی نوبت ہی نہیں آتی میں ناٹا ڈال لیتا ہوں ضرورت جب بھی پڑتی ہے ریمانور رضوان۔ کراچی

اس ماہ امید کی کرن

زندگی کتنی مشکل ہے؟ یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے چپکے چپکے، دھیرے دھیرے کوئی اندھیرا سانگل رہا ہے۔ کچھ خالی پن ہے، کچھ ادھورا ادھورا سا ہے کیا زندگی یونہی گزر جائے گی؟ تپتے صحرا میں کھڑے اس وجود نے ادھر ادھر سا تباہی کی تلاش میں نظر دوڑاتے ہوئے زیر لب کہا اور مسکرا دیا۔ اس کی مسکراہٹ میں ایک درد تھا جس نے اس کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور وہ بے بسی سے سوچنے لگا کہ بارش تو ریگستانوں میں برسوں بعد آتی ہے تو کیا وہ یونہی ان بیابان ریت کے ٹیلوں میں زندگی کی بازی ہار جائے گا۔ خوف اور وحشت نے اس کو مزید چلنے سے روک دیا۔ اس کے زخموں سے خون رسنے لگا اور اس کی آنکھیں اذیت سے تڑپ اٹھیں اور وہ درد سے زار و قطار رونے لگا۔

اجنے میں ٹھنڈک کا ایک احساس جاگا امید کا جگنو چکا



سدا ساتھ ساتھ چلنے والے ایک جگہ سے چل کر ایک ہی مقام پر ختم ہونے والے لیکن وہ ساتھ ساتھ چلتے رہنے کے باوجود کبھی مل نہیں پاتے۔ وہ ایک لمحہ جسے پل بننا ہوتا ہے۔ وہ ان کے درمیان کبھی آتا ہی نہیں ندیاں جب دریاؤں پہاڑوں سے نکلتی ہیں تو بڑی پرشور ہوتی ہیں لیکن آخر میں ایک چھوٹا سا کھائی رہ جاتی ہیں اس طرح محبتیں بھی آغاز میں بڑی تیز بڑی پیاری ہوتی ہیں یہ آخر میں دو انسانوں کی زندگیاں ختم کر دیتی ہیں اور محبت کرنے والوں کے درمیان صرف مجبور یوں کا پانی ہوتا ہے جو ان دو کناروں کی طرح کبھی ملنے نہیں دیتا۔ کوئی کوئی خواب کبھی پورے نہیں ہوتے۔ کچھ محبتیں سدا ادھوری رہتی ہیں۔ کچھ لوگ کبھی مل نہیں پاتے، کچھ آرزوئیں کبھی پوری نہیں ہوتی۔ کچھ حالات کبھی ہمارے حق میں نہیں ہوتے کچھ مطالبے کبھی مانے نہیں جاسکتے اور کچھ راستوں کی کوئی منزل نہیں ہوتی۔

عابد محمود۔ ملکہ ہانس

### اس ماہ کی غزل

اپنے لبوں کو دشمن اظہار مت بنا  
سچے ہیں جو لوگ انہیں گناہ گار مت بنا  
جتنے بھی لفظ ہیں وہ مہکتے گلاب ہیں  
لہجے کے فرق سے انہیں تلواریں مت بنا  
الزام کچھ تو گردشِ ایام کو بھی دے  
اپنے ہر ایک غم کو غمِ یار مت بنا  
ہر ایک کے لیے کھلا مت رکھ اسے فراز  
یہ دل ایک گھر ہے اسے بازار مت بنا

شاعر: احمد فراز

سفینہ جمشید۔ ڈی آئی خان

☆.....

چل سکتی، اگر کسی شخص کی دو بیویاں ہوں تو کیا اسے رکشہ کہا جاسکتا ہے؟

☆ برف زیادہ ٹھنڈی ہوتی ہے یا برف کا پانی؟  
☆ اگر پچاس کلو آٹا مفت مل جائے تو آدھا کس کو گفٹ کیا جائے، بھائی کو، سارے کو یا پولیس والے کو؟

☆ پولیس ڈیوٹی پر موجود ہونے کے باوجود نظر کیوں نہیں آتی؟

☆ ڈاکو، حکمران لیٹروں اور پولیس میں کیا فرق ہے؟

ایس امتیاز احمد۔ کراچی

### اس ماہ کی مزاحیہ غزل

عشق کے میدان میں دوڑے تو نہیں تھے  
اب بھی گدھے ہو پہلے بھی گھوڑے تو نہیں تھے  
آفس بھی لیٹ آئے ہو اور کان بھی ہیں لال  
بیگم نے رات کو کان مروڑے تو نہیں تھے  
شکایت کیوں کی اپنے باپ سے جا کر  
پکڑے تھے ہاتھ تیرے توڑے تو نہیں تھے  
کل شام مجھے دیکھ کر تم بھاگے کیوں اس طرح  
ساگر میرے ہاتھ میں کوڑے تو نہیں تھے  
ریمانور رضوان۔ کراچی

### اس ماہ کا قطعہ

سر میں درد شدید رہتا ہے  
بن کے ایسی لویہ رہتا ہے  
کام کوئی ڈھنگ سے کرنے پائیں ہم  
اس قدر یہ شدید رہتا ہے  
سہاس گل۔ رحیم یار خان

اس ماہ میں

### محبوبوں کی منزل

کچھ لوگ ندی کے دو کناروں جیسے ہوتے ہیں





دیکھے اور یہ معلوم کر سکے کہ آنے والا کُل کیسا ہوگا؟ اس کی عمر کتنی ہوگی؟ وہ آگے چل کر غم دیکھے گا یا خوشیاں؟ حادثے اور سانحے کب اور کہاں پیش آئیں گے اور شادمانی کے اسباب کیا کیا میسر ہوں گے؟

مگر یہ تو سوچئے کہ اگر خالق کائنات انسان کو یہ سب کچھ پیشگی بتا دیتا تو زندگی اس کے لیے موت سے بدتر ہو جاتی۔ آنے والے غموں کے تصور میں اس کی موجودہ خوشیاں بھی زہر کا پالہ بن جاتیں۔ اگر اسے یہ معلوم ہو جاتا کہ زندگی کے کس مرحلے میں اس کے کون کون سے پیارے داغ مفارقت دینے والے ہیں تو ایک اسی غم کے باعث دنیا سے اس کا دل اچاٹ ہو جاتا۔

یہی وجہ ہے کہ قدرت نے مستقبل پر غیب کے پردے ڈال رکھے ہیں اور دیکھا جائے تو یہ بھی اللہ کی رحمتوں میں سے ایک بہت بڑی رحمت ہے۔

ایس امتیاز احمد۔ کراچی

### فرق

شیخ سعدی سے کسی نے دوست اور بھائی کے بارے میں دریافت کیا۔ آپ نے فرمایا: ”ان میں وہی فرق ہے جو ہیرے اور سونے میں ہے۔ دوست ہیرے کی مانند اور بھائی سونے کی مانند۔“ وہ شخص بہت حیران ہوا اور کہا: ”حضرت بھائی جو حقیقی اور سگا رشتہ ہے اسے آپ کم قیمت یعنی سونا سے منسوب کر رہے ہیں اس میں کیا حکمت ہے؟“

شیخ سعدی نے فرمایا: ”سونا اگرچہ کم قیمت ہے

### حضورؐ نے فرمایا

”سیدنا جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات سے منع فرمایا کہ قبروں کو پختہ کریں اور اس بات سے کہ ان پر بیٹھیں اور اس سے کہ ان پر گنبد (یا عمارت) بنائیں۔“ (مسلم)

### فرمان رسولؐ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”قابل رشک دو ہی آدمی ہو سکتے ہیں، ایک وہ شخص جس کو اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی دولت عطا فرمائی اور وہ شب و روز اس پر عمل کرتا ہے اور دوسرا وہ شخص جس کو اللہ تعالیٰ نے مال و دولت سے نوازا اور وہ شب و روز اس کے حکم کے مطابق اس مال کو خرچ کرتا رہتا ہے۔“ (صحیح مسلم)

### حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں، رسول کریمؐ مسجد میں بیٹھے تھے کہ قبیلے مزینہ کی ایک عورت زینت والا لباس پہنے اتراتی ہوئی مسجد میں آئی، نبی کریمؐ نے فرمایا:

”لوگو! اپنی عورتوں کو زینت والا لباس پہننے اور تفاخر والی چال چلنے سے منع کرو۔ بنی اسرائیل پر اسی وقت لعنت کی گئی تھی جب ان کی عورتوں نے زینت والا لباس پہنا اور مسجدوں میں فخر سے چلنے لگیں۔“ (سنن ابن ماجہ)

سیدہ نورین۔ کراچی

### بڑی رحمت

انسان کی دیرینہ خواہشات میں سے ایک خواہش یہ بھی ہے کہ وہ کسی طرح اپنے مستقبل میں جھانک کر



عابد محمود۔ ملکہ ہانس

باتوں سے خوشبو آئے...!

☆ محبت ایسا دریا ہے کہ بارش روٹھ بھی جائے تو پانی کم نہیں ہوتا۔

☆ ہم ضرورت سے بہت زیادہ کی آرزو کرتے ہیں اس لیے ناکام ہوتے ہیں۔

☆ جب انسان کو شہرت مل جائے تو دولت خود بخود اس کا پیچھا کرتی ہے۔

☆ یاد رکھیں جو چیز اچھی مگر کامیاب ہو، اس کی قدر و قیمت بڑھ جاتی ہے۔

☆ انسان کی سب سے بڑی خوبی بصورتی اس کی مسکراہٹ ہے۔

☆ اپنے دامن کو سچائی اور خلوص کے موتی سے بھر کر اس کو تحفہ اپنے دوستوں میں تقسیم کرو کیونکہ یہ بے مول تحفہ ہے۔

☆ شک کا پہلا سوراخ محبت کی کشتی کو ڈبو دیتا ہے۔

☆ سب سے اچھی بات وہ ہے جس کے معنی زیادہ اور الفاظ کم ہوں۔

☆ محبت تپتی بھی ہے اور سستی بھی، اگر کی جائے تو سستی ہے اور اگر نہ ملے تو قیمتی ہے۔

☆ دل ایک آئینہ ہے اگر وہ بدی سے پاک ہے تو اس میں خدا بھی نظر آ سکتا ہے۔

☆ مرد کا امتحان عورت سے اور عورت کا امتحان پیسے سے ہوتا ہے۔

☆ بہترین کی امید رکھو اور بدترین کے لیے تیار رہو۔

☆ جو لوگ تعریف کے بھوکے ہوتے ہیں وہ باصلاحیت نہیں ہوتے۔

☆ محبت صرف ملتی ہے اور دی جاتی ہے، خریدی نہیں جاسکتی۔

☆ اگر تم تیس برس میں طاقتور اور چالیس برس میں عقل مند نہیں بنے تو پھر بسھی طاقتور اور عقل مند بننے کی امید نہ رکھو۔

لیکن اگر ٹوٹ جائے تو اسے پگھلا کر اصل شکل دی جاسکتی ہے جب کہ ہیرا ٹوٹ جائے تو اصل شکل نہیں دی جاسکتی۔ بھائیوں میں وقتی ناراضی ختم ہو سکتی ہے لیکن اگر دوستی میں دراڑ آ جائے تو اسے دور نہیں کیا جاسکتا۔“

فرزانہ شوکت۔ کراچی

چٹکے

ایک دوست دوسرے دوست سے۔  
”بتاؤ آئیٹ کے کہتے ہیں؟“

دوسرا دوست۔ ”جو آم دیر سے پکتا ہے اسے آم لیٹ کہتے ہیں۔“

ریمانور رضوان۔ کراچی

مدت

زنگی روگ لگنے لگی ہے

مشطیں مجھ پہ اتنی پڑی ہیں

بحر امدادت سے آتا

آپ کے در پہ نظریں لگی ہیں

راؤ تہذیب حسین تہذیب۔ رحیم یار خان

کہاں جا کے رکیں

اب بھی وہی اک سچی بہیم ہے وہی ہم ہیں۔  
وہی مقدر، وہی وقت کی ناراضگیاں ادھر سے سنوارو۔ تو ادھر سے پھر اسی طرح پر پیچ، یہ برس ہا برس کا سفر اور انہی موسموں کا جنگل سب رتیں بیت جاتی ہیں پر دکھ کی رت کیوں نہیں بنتی یا پھر یہ ہم ہی ہیں جو انہیں ساتھ لیے پھرتے ہیں ان دکھوں سے چھٹکارا نہیں پاسکتے۔ ہم یہ تو یہ زمین تنگ ہو گئی ہے کہاں ایسی جگہ ڈھونڈیں؟ کہاں جا کے رکیں جہاں دکھ، مایوسیاں اور آنسو نہ ہوں۔ جہاں محرومیاں اور ناکامیاں نہ ہوں؟ ایسی جگہ جہاں دھوپ زیادہ روشن ہو اور دن زیادہ شفاف ہوں جہاں نگاہوں میں دیپ جلتے ہوں اور جن پر اعتماد ہو جن کے لیے سب کچھ بیچ دیا جائے وہ دھوکہ نہ دیتے ہوں۔



☆ سب سے بڑی فتح اپنے آپ کو فتح کرنا ہے۔  
☆ زبان کا وزن بہت ہی ہلکا ہوتا ہے مگر کم لوگ اسے سنبھال پاتے ہیں۔

☆ اگر کسی کو کچھ دینا ہے تو اسے اچھا وقت اور دعا دو کیونکہ تم ہر چیز واپس لے سکتے ہو مگر کسی کو دیا ہوا اچھا وقت اور دعا واپس نہیں لے سکتے۔

صبا نور۔ ہارون آباد  
میں نکلا شام شہر کو دل میں کچھ ارمان تھے  
ایک طرف تھیں سبز جھاڑیاں ایک طرف ٹوٹے قبرستان تھے  
ماؤں تلے ایک ہڈی آئی جس کے یہ بیان تھے  
مسنجھل کر چل اے چلنے والے کبھی ہم بھی انسان تھے  
روبینہ خان۔ کوہاٹ

### اقوال زریں

☆ چاند کے بغیر رات بے کار ہے اور علم کے بغیر ذہن۔  
☆ مرد آنکھ ہے تو عورت اس کی چیتائی، مرد پھول ہے تو عورت اس کی خوشبو ہے۔  
☆ نیکی کی طرف بلانے والا نیکی کرنے والے کے برابر ہے۔  
☆ بدترین گروہ ہے جس میں یتیم کے ساتھ بدسلوکی ہو۔  
☆ محبت تو چوں کی سائیں سائیں کی طرح ہوتی ہے نہ دکھائی دیتی ہے نہ پکڑ میں آتی ہے بس اپنے حصار میں لے لیتی ہے۔

☆ وہاں رہنا آپ کی نادانی ہے جہاں آپ کی ضرورت اور قدر نہ ہو۔

☆ دنیا تمہیں اس وقت تک نہیں ہرا سکتی جب تک تم اپنے آپ سے نہ ہار جاؤ۔  
☆ حوصلہ کبھی نہیں پوچھتا کہ پتھر کی دیوار کتنی اونچی ہے۔  
☆ انسان کی باشعور زندگی کسی آزمائش کے بعد شروع ہوتی ہے۔

☆ اعتبار کی دیواروں کو اتنا مضبوط کر لو کہ اسے شک کا کوئی طوفان گرانہ سکے۔

☆ جب ہمارا خود اپنے دل پر اختیار نہیں تو کوئی دوسرا ہم مزاج کیسے بن سکتا ہے۔

سائرہ کنول۔ بہاولپور

### انسان بچ سکتا ہے

☆ تکبر سے سلام کے ذریعے۔  
☆ مصیبت سے صدقے کے ذریعے۔  
☆ بیماری سے دعا کے ذریعے۔  
☆ گناہ سے اللہ کے خوف کے ذریعے۔

صائمہ طاہر سومرو۔ حیدرآباد

### چالان

تیز رفتاری کے جرم میں ایک صاحب کا چالان ہوا  
پلیس اور انپیس مجسٹریٹ صاحب کے سامنے پیش کیا گیا۔  
انہوں نے صحت جرم سے انکار کرتے ہوئے کہا۔  
”جناب عالی! میں تو صرف بیس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے جا رہا تھا۔“

”کیا ثبوت ہے اس بات کا؟“ مجسٹریٹ نے دریافت کیا۔

”جناب والا! ثبوت کے طور پر صرف اتنا جان لینا کافی ہے کہ میں اس وقت اپنے سر ال جا رہا تھا۔“  
عابدہ اسلم۔ لاہور

### جلترنگ

کسی ملک کے وزیر خزانہ بے تکلف احباب کے حلقے میں چہک رہے تھے۔

بچپن کا زمانہ بھی کیا زمانہ ہوتا ہے۔ ان دنوں میری تمنا تھی کہ بڑا ہو کر ڈاکٹر بنوں گا۔  
”مبارک ہو۔“ کسی ستم ظریف نے کہا۔  
”مراد پوری ہوئی۔“

صائمہ ادریس۔ کراچی

### بہت اچھی باتیں

☆ شکر ادا کرتے رہا کرو اس رب کا جو برداشت سے زیادہ دکھ نہیں دیتا مگر اوقات سے زیادہ سکھ دیتا ہے۔



## فردوس بریں کا کہنا

ملکہ فردوس بریں کے آئین عبادت کو شعار بنا کر لب ہائے زہرا کی جنبش سے تلاوت کا گمینہ سیکھو حرف شکایت نہ لایا زباں پہ کبھی تقدیس کی رانی نے خاتون قیامت سے شوہر کی اطاعت کا سلیقہ سیکھو منشور فاطمہ کو اپناؤ کنیز فاطمہ بن کر تم اسوۂ بتول کی روشنی میں پردے کا طریقہ سیکھو صداقت، امامت اور سخاوت کا جو مرکز ہے اس گھرانے سے تم قناعت کا سلیقہ سیکھو زہرا کی تربیت سے راز حسنین کی سرفروشی کا شہزادگان بتول سے تکمیل شہادت کا قرینہ سیکھو جاں کو لٹا دو سر سجدے میں رکھ کر اے مون حسین ابن علیؑ سے عبادت کا طریقہ سیکھو حافظہ مون شاہ

نظم

میرے خدایا! میری زمیں پر یہ قہر سا کیوں

پا ہوا ہے

ہر آنکھ نم ہے ہر دل دریدہ ہر گھر میں

ماتم کا سماں ہے

یہ میری مٹی، یہ میری دھرتی، لہو کے رنگ

میں رنگی گئی ہے

ہر ماں کا چہرہ، دھرتی ماں کا چہرہ کئی

دنوں سے دھواں دھواں ہے

سباس گل

اے رب العزت کی حمد و ثنا  
لکھنے کو جی چاہتا ہے  
سجدے کی حالت میں  
ہی زندگی گزارنے کا  
جی چاہتا ہے

بے حد بے پناہ دے بے شمار

میرے رب کی عنایتیں

ہیں مجھ گناہ گار پر

رور و کرگڑ گڑا کر

اپنے پروردگار کا

شکر ادا کرنے کا جی

چاہتا ہے

بخش دے گا میرا

پاک رب میری

خطاؤں کو بس

اسی بات پر یقین

کرنے کو جی چاہتا ہے

ریمان نور رضوان

سیرت سیدہ زہرا سلام

کردار فاطمہؑ کی ضیاء پاشیوں سے جینے کا سلیقہ سیکھو  
کس طرح حاصل ہوتا ہے مقام عظمت کا قرینہ سیکھو  
اپنے اندر کو ڈھالو اے بیٹیو اطوار بتولؑ میں  
کیسے پار لگتا ہے پھر یہ تمہارا سفینہ دیکھو



کبھی خوشیوں کی تمازت کبھی غموں کی دھوپ  
تمام جدا ہی لگے زیست کے افسانے کے  
خوش حالی میں دوست بدحالی میں اجنبی  
یوں ہی اطوار بدل جاتے ہیں زمانے کے

درخشاں ضیاء

### انتظار

تمہیں معلوم تو ہوگا  
رات کی تاریکی میں  
کوئی درتپے سے سرٹکائے  
تمہیں بہت یاد کرتا ہے  
بھگی آنکھوں سے دیکھ کر آسمان کو  
تمہارے لوٹ آنے کی دعا کرتا ہے  
کسی کی بے چین آنکھیں  
انتظار کی آگ میں جلتی ہیں

سنو جاناں!

اب تو لوٹ کر آ جاؤ  
اس سے پہلے کہ میری بے قرار آنکھیں  
ہجر کی آگ میں جھلس کر پھرا جائیں  
میری آس کے سارے معصوم بھول  
ٹوٹ کر کسی ویرانے میں بکھر جائیں  
تم لوٹ آؤ  
مجھے بکھرنے سے بچالو  
میرے ٹوٹے بکھرے وجود کو  
اپنے سینے میں چھپالو!

رابعا افضل خان

### کتاب لکھنا

تم اپنی ایک کتاب لکھنا  
محبوبوں کا حساب لکھنا  
چاہتوں کو بے تاب لکھنا  
م جو کہتے ہو  
گزارنے آتے نہیں ہیں

### محبت چیز کیا ہوتی ہے

تم سے مل کے جانا ہے  
محبت چیز کیا ہوتی ہے  
اک مسکراہٹ پر دل ہار جانا  
چیز کیا ہوتی ہے  
اک نظر کریم کی خاطر تڑپنا  
چیز کیا ہوتی ہے  
کسی کو دیکھ کر کھلنا  
چیز کیا ہوتی ہے  
تم سے مل کے جانا ہے  
محبت چیز کیا ہوتی ہے

### غزل

سحر ہوئی تو سحر یہ ٹوٹا رات کا  
موسم لگتا ہے موسم برسات کا  
مگر مگر پھول کھلتے ہیں سمن کے  
نہیں گرتا مقام گلاب کا  
چھپ کے دیکھ رہا تھا چاند  
بدلی کی اوڑھ سے  
کچھ سرک کے بادل بٹے  
بالا پھل گیا تھا جناب کا  
سمجھ لے میرے دل کی بات کیوں ہے روٹھا  
دل کی بزم میں رہتا ہے مکھڑا آپ کا  
مہرین کنول

### غزل

انداز ہزار اس نے پائے ہیں ستانے کے  
لحات کبھی نہیں گنوا تا وہ میرا دل جلانے کے  
خفا کر کے ستم گر بھول ہی جاتا ہے  
خدا ہنر بھی کوئی دیتا اسے منانے کے  
دم بھر شاد ہو گئے سر محفل ہم  
ہزار عنوان ہوئے اک ذرا مسکرانے کے



کہ یہ خود اپنی موت مر جائے گی  
دو تین گھنٹوں بعد

اس کا وجود مٹ جائے گا  
پھر میں کیوں اپنے ہاتھ  
خون سے رنگوں گا؟

یہ سوچ کر میں ہنستا ہی چلا گیا  
اور دسمبر کی یہ آخری رات  
اپنی موت آپ مر گئی  
میری ہنسی کے ساتھ!

ساتھی زبیرہ نہیاری

غزل

مٹی کی پوشاک کے اندر  
زندہ ہوں میں خاک کے اندر  
ایک جہاں آباد زمیں پر  
ایک جہاں افلاک کے اندر  
اس کی سمجھ میں نہ آسکی جو  
بات تھی وہ ادراک کے اندر  
پھر نہ کسی پر انگلی اٹھائی  
دیکھا جب اس نے جھانک کے اندر  
نفرت، دھوکہ، جھوٹ ہے اس میں  
پیار نہیں اشراک کے اندر  
ظلم غریبوں پر ڈھاتا ہے  
رحم نہیں سفاک کے اندر

حکیم خان حکیم

غزل

وہ پیاری لڑکی کہ اک پری سی  
ادا میں اس کی ہیں پھلجھڑی سی  
وہ ایک لمحے میں مسکرا دے  
تو دو بجے لمحے لگے لڑی سی  
کبھی ہے تیور میں سخت غصہ  
کبھی ہے آنکھوں میں اک جھری سی

شب و روز محبتوں کے  
پھر اس میں تم  
محبتوں کا نیا باب لکھنا  
یہ کیسی الفت ہے تم کو ہم سے  
کہتے ہوا کثر دوستوں سے  
پھر ایسا کرنا  
تمام شکوے اکٹھا کرنا  
تمام گلوں کا حساب لکھنا  
تم اپنی ایک کتاب لکھنا  
محبتوں کا حساب لکھنا  
چاہتوں کو بے تاب لکھنا

کائنات غزل

نظم

مجھے چپکے سے  
تنبہائی نے مار دیا  
کوئی تو ہو  
جو آئے اور آ کر  
میری قاتل  
میری تنہائی سے  
میرے قتل کا حساب لے.....

ریمل آرزو

نظم

میرے چہرے پر  
اس کی یاد کی شدت کے اثرات دیکھ کر  
دسمبر کی یہ آخری رات  
مجھ سے ڈر کے کانپ رہی ہے  
شاید اس کو خوف ہے  
کہ  
کہیں میں اس کا قتل نہ کر دوں  
مگر یہ پاگل رات  
کیا جانے!



ٹھہرنا تو اسے آتا نہیں تھا  
اسے تو یار ہجرت چاہیے تھی  
اذیت ہی اگر ہے یہ محبت  
محبت میں اذیت چاہیے تھی  
راؤ وحید اسد

### غزل

تیرے ساتھ جو موسم تھے ان کا کیا حال ہوا کبھی لکھنا  
میرے بعد تجھے کوئی خوشی ملی کہ ملاں ہوا کبھی لکھنا  
کبھی ساتھ ہوانے رقص کیا دکھ سکھ بانٹا سچ کہنا  
کوئی ساتھ ہنسا یا رویا کتنا ٹنڈھا ل ہوا کبھی لکھنا  
جو تجھ میں تجھے تلاش کرے اور کاش کہ ایسا ہو  
کوئی لمحہ جاں میرے جیسا سخن مثال ہوا کبھی لکھنا  
وہی آب و ہوا کا فیصلہ ہے کہ اکیلا ہے تو اب تک  
کہیں پھول کھلے یا سبزہ پامال ہوا کبھی لکھنا  
میرا سانس سے رشتہ باقی ہے دل سا بھی ہے کیا لکھنا  
تو چین سے ہے یا جینا کا رحماں ہوا کبھی لکھنا  
فرزانہ شوکت

### غزل

میرے ناز اٹھانے والے کیسے ہو  
مجھ کو تنہا چھوڑ کے جانے والے کیسے ہو  
تیرے بغیر نیند نہ آئی شب بھر ہمیں  
میرے خواب چرانے والے کیسے ہو  
جنہیں ٹوٹ کے چاہا تھا زندگی میں ہم نے  
وفا کو میری ٹھکرانے والے کیسے ہو  
وعدہ کیا تھا تو نے ساتھ نبھانے کا  
چاہت کا وعدہ توڑ کے جانے والے کیسے ہو  
تجھ بن نہ جی سکے گا جاوید کبھی  
مجھ کو یوں دل سے مٹانے والے کیسے ہو  
محمد اسلم جاوید

آج پھر شہر میں دھرتا تھا

چھوڑ دو

مجھے جانے دو

ردا ڈائجسٹ 204 ستمبر 2015ء

میں ڈر سا جاتا ہوں جب بھی دیکھوں  
نگاہ اس کی کڑی کڑی سی  
میں ڈوب جاؤں کہ جمیل ہیں یہ  
نگاہیں اس کی بڑی بڑی سی  
شرم سے رخ پھیرے جب بھی پائے  
وہ خود پہ نظریں میری گڑی سی  
یہ زندگی اس کے ساتھ ساجد  
ہے موتیوں سے جڑی جڑی سی

سید ساجد

### غزل

صحن چمن میں آگ جو برسا گئے ہیں لوگ  
اپنے کیے کی آپ سزا پائے ہیں لوگ  
پڑا مردگی چہرہ سو چھائی ہے آج کل  
شاید عم حیات سے اکتا گئے ہیں لوگ  
اسی چلی ہے شہر میں کچھ باد تیز رو  
پھولوں کی طرح آج جو مرجھا گئے ہیں لوگ  
کچھ مسئلے ہیں رو برو ایسے جہان میں  
انجام سوچ سوچ کے گھبرا گئے ہیں لوگ  
جن کو جنون شوق نے وحشی بنا دیا  
امتیاز بس وہ راہ وفا پائے گئے ہیں لوگ  
ایسے امتیاز احمد

### غزل

بس اتنی سی سہولت چاہیے تھی  
مجھے تیری محبت چاہیے تھی  
اتر آتے ہیں سبھی منظر زمین پر  
ان آنکھوں کی اجازت چاہیے تھی  
میرے چاروں طرف ہو بس محبت  
محبت کی حکومت چاہیے تھی  
ٹھٹھرتی روح اور سوکھے بدن کو  
تیری سانسوں کی عدت چاہیے تھی  
میرے خوابوں کے بنجر آئینے کو  
نی کی ایک صورت چاہیے تھی



اس نے اپنی بائیک  
مبادل راستے کی طرف موڑ دی تھی  
مگر  
اُسے کیا پتہ تھا  
وہ مبادل راستہ  
تو اس کی زندگی کا مبادل!  
موت کا راستہ بن جائے گا

شیریں تبسم

### عشق عبادت

شہر خموشاں کے ویرانے کو نے میں  
دنیا کی رنگینیاں سب فراموش کیے  
اپنے ذکر میں مصروف جو گن  
جس کے بے ترتیب لفظوں سے  
جذبوں کی سجائی چمکتی تھی  
آنکھیں بے چینی سے موندھے  
سرگشٹیوں پر ٹیکے  
من ہی من میں گنگاتی ہوئی  
کچھ پر اسرار سی وہ کمال جو گن  
وہ جسے دنیا تہر آلودنگا ہوں سے تکتی  
اور پھر قہقہے لگانی بڑی بے دردی سے گزر جاتی  
مگر اس بے ضرری دنیا میں  
میں جاہ کر بھی ملنے سے قاصر رہتی  
اب نکلتی ہوں اب چلتی ہوں  
مستسلل ارادہ تو باندھتی تھی  
سہ پہر گزر جاتی تھی  
میں دل پر پتھر رکھ کر جبراً  
دو قدم ہی چل پاتی تھی  
کہ سامنے کی راہ گزر مجھے  
جیسے کانٹوں بھری سی لگتی تھی  
اپنی ذات میں گن وہ بے مثال جو گن  
گرد میں لپٹا جس کا بکھرا وجود  
اس قدر نکھر اسالگتا تھا

میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟

گھر پر میری ماں  
میری بہنیں  
میری بیوی  
میری بیٹی  
میرا انتظار کر رہے ہیں  
میں تمہارے پاؤں پڑتا ہوں  
تم جو چاہے لے لو  
میری بائیک رکھ لو  
مجھے جانے دو  
میں یہ شہر ہی چھوڑ جاؤں گا  
میری ماں کے آپریشن کے لیے  
لی ہوئی میری یہ  
دو ماہ کی ایڈوانس میں لی ہوئی تنخواہ  
رکھ لو

مجھے چھوڑ دو، مجھے جانے دو  
یہ سونے کی بالیاں لے لو  
جو میں اپنی آٹھ مہینے کی بیٹی  
کے لیے  
لایا ہوں  
جس نے  
آج صبح  
پہلی بار مجھے

بابا

کہہ کر پکارا تھا  
مجھے چھوڑ دو، مجھے جانے دو  
مجھے مت مارو  
وہ اپنی آخری سانس تک  
التجائیں فریاد کرتا رہا  
آج پھر  
شہر کی معروف شاہراہ پر  
دھرتا تھا



کہ اب سنگ سنگ رہیں گے سدا  
 نہ چھوڑ کے جاؤ گے تم مجھے  
 نہ تڑپاؤ گے یوں پہلے کی طرح  
 چلو اب وعدہ کرو  
 چلو اب وعدہ کرو

رمنا نور

اس روز

اس روز جب  
 میں تنہا تھی  
 تمہاری خاموشی سہا  
 گئی میری روح کو  
 دل ساکت کر گئی  
 میرے ہاتھوں سے  
 کانچ نہیں بکھرا  
 میری زندگی بکھری  
 تھی اس روز  
 کانچ نہیں ٹوٹا  
 میرا دل ٹوٹا  
 تھا اس روز  
 کانچ کی کرچیاں نہیں  
 میری روح کرچی کرچی  
 ہوئی اس روز  
 جب میں ہاری  
 اور تم جیتے  
 تب میں ہاری  
 نہیں بلکہ جیتتی  
 کیوں کہ تمہاری  
 جیت ہمیشہ سے  
 ہے میری جیت!

شاء ناز

کہ آنکھیں چندھیانے لگتی تھیں  
 اس کے پوڑھے نڈھال جسم کی مہک  
 محسوس کن تھی اتنی کہ  
 شہر مدفن کا ایک ایک گوشہ  
 شہر گلاب لگنے لگتا تھا  
 اپنی دھن میں گم وہ گنگناتی جو گن  
 جسے پہر کی خبر ہوتی

نہ سحر کا پتا ہوتا  
 جانے اسم کیسا پھونکتی تھی  
 کہ جس کے طلسم میں کھو کر  
 میں گھنٹوں کی کھوٹی ہی رہتی تھی  
 شہر کہکشاں سے دور  
 پرے دور کہیں  
 شہر گورکن میں کئی بوجھل شام کا  
 کچھ براسرار سا وہ برسکون منظر  
 جسے لوگ نحوست سمجھ کر  
 یوں رخ پھیرتے کہ  
 پلٹ کر نہیں سکتے تھے  
 مجھے جنت سا لطف دے جاتا تھا

نظم

اب جو بیٹھے ہو سامنے میرے  
 چلو کچھ سوالوں کے جواب دے دو  
 میرے گزرے کل کا حساب دے دو  
 تمہارے بن لمحے جو گزرے ہیں  
 کس اذیت سے گزرے ہیں کیا بتاؤں  
 ان بیتے ہوئے لمحوں کا کچھ تو ازالہ کرو  
 چلو چھوڑو یہ سب باتیں  
 یہ شکوے اور شکایتیں  
 بلکہ ایسا کرو  
 کچھ وعدے تم کرو  
 کچھ وعدے میں کروں

مدیحہ اعجاز حسین



شب تنہائی میں  
 بہت ترپتے ہیں ہم  
 شب تنہائی میں  
 کسی روز آ جاؤ گے تم  
 شب تنہائی میں  
 یہ امید کے چراغ جلاتے ہیں ہم  
 شب تنہائی میں

عائشہ جمیل - کراچی

دلوں میں میل آئے  
 بدگمانی کے باول چھا جائیں  
 سنو تو جان جاں میرے  
 کبھی بھی تم مجھ سے  
 تعلق توڑ نہ لینا  
 کبھی بھی زندگی کا رستہ  
 میرے رستے سے تم الگ نہ کر لینا  
 یہ تو زندگی کی خو ہے  
 کہ تصور کا ایک رخ ہے  
 اگر کہہ سکیں اس کو  
 محبت کی آزمائش ہے  
 محبت کی انتہا حد تک  
 پہنچنے کی سیڑھی پر  
 بدگمانی ایک منزل ہے  
 منزل سے کامیابی سے  
 گزر جانا ہی معراج ہے  
 محبت سے تو ہدم دست جانِ جاں  
 کبھی زندگی میں  
 ایسے لمحات بے خیالی میں جو آ جائیں  
 کبھی تم میرے بارے میں  
 بدگمان نہ ہونا  
 تعلق توڑ نہ لینا

نورالصبأ

لظم

سمندر کی گہرائی  
 میں  
 جا چھپوں  
 دل میرا کرے  
 کسی گہری کھائی  
 میں

جامروں  
 دل میرا کرے  
 اب نہ کوئی  
 آس ہے  
 نہ امید  
 تیری بے وفائی  
 پر روؤں  
 دل میرا کرے  
 پر یہ زمانے کے  
 سخت بندھن  
 ہیں مجھے جکڑے ہوئے  
 نہ ہو فریب کہیں  
 دل میرا کرے

شب تنہائی

روٹھ جاتے ہیں ہم خود سے  
 شب تنہائی میں  
 نگاہیں برسی ہیں  
 شب تنہائی میں  
 دھڑکن دل کو کرتے ہیں محسوس  
 شب تنہائی میں  
 یاد آتی ہے جب تیری  
 شب تنہائی میں  
 دل لہو کے آنسو روتا ہے



## سنسنیلی

**صبا عبدالفضلی.....کراچی**

میری جانب سے تمام قارئین ردا، رائٹرز، صالحہ آپی، نورین ملک اور ردا اسٹاف کو باربی ڈول کا سلام پر خلوص قبول ہو السلام علیکم۔ جولائی میں مجھے کس کس نے مس کیا؟ آپ لوگ نہیں بھی بتائیں گے تو بھی مجھے بتا ہے کہ آپ لوگوں نے مجھے بہت مس کیا۔ غیر حاضری پر معذرت۔ اب آتی ہوں تبصرے کی طرف تو ٹائٹیل اچھا تھا۔ ماڈل بہت پیاری لگ رہی تھیں۔ بس پس منظر سادہ تھا۔ ”گوشت آگہی“ میں اس بار آپ کی پیار بھری باتیں بہت اچھی لگیں۔ نانکہ طارق اور فاطمہ خان کے ناول کی کمی بھی بہت محسوس ہوئی۔ پھر سب سے پہلے اپنے فیورٹ ناول ”تیرے پیار کی کوشبو“ کی طرف دوڑ لگائی۔ اس بار کی قسط بہت زبردست تھی۔ ساری الجھنیں سلجھ گئیں۔ قمروش آپی! یو آر دی بیسٹ۔ ”تجھ سے مانگوں میں تجھ کو“ شازیہ آپی! تھوڑی اسپینڈ پکڑیں اور شہریار اور حسنیٰ کی جلدی شادی کروائیں۔ آپ کا ناول بھی سپر ہٹ جا رہا ہے۔ ”ایک چاند ہم سفر ہے“ نوشاہہ فاروق! ہنسی سے بھر پور، مسکراہٹوں سے سجا اور شرارت سے نکھرا ہوا آپ کا ناول زبردست رہا۔ پڑھ کر میں کتنی ہی دیر تک ہنستی رہی۔ ویلڈن ”اندھیری رات میں نکلا چاند“ روشنی فاطمہ! آپ کا ناول زبردست رہا۔ خاص کر کہ ناول کا نام بہت خوب صورت ہے، ویلڈن۔ اس بار کے دونوں ناولٹ بیسٹ رہے۔ ”جنہیں رستے میں خبر ہوئی“

نیلیم ریاست، پہلی تحریر بہت کمال کی ہے۔ پڑھ کے لگا ہی نہیں کہ یہ آپ کی پہلی کاوش ہے۔ ماشاء اللہ آپ کا انداز تحریر بہت پختہ ہے۔ ردا سے یونہی جڑی رہے گا۔ ”اترے چاند درتے میں“ نانکہ طارق! اف آپ کے لیے کیا کہوں؟ کچھ سمجھ ہی نہیں آ رہا۔ بہت زبردست تحریر ہے آپ کی۔ بہت خوب صورتی سے آپ نے قرآن شریف کی اہمیت واضح کی ہے ویلڈن۔ ”چاند رات کی چاندنی“ عائشہ الیاس! کہانی کا نام جتنا خوب صورت تھا کہانی بھی اتنی ہی خوب صورت تھی زبردست۔ ”ردا کے رنگ اپنوں کے سنگ“ سیدہ فرزانہ حبیب فرزین! آپ کی تحریر بہت زبردست تھی۔ پڑھ کر بہت مزہ آیا۔ ”محبت خجواگ ہے جاناں“ جویریہ بانو آپ کی کہانی واقعی شاندار تھی۔ موضوع بھی بہت اچھا تھا اور کہانی بھی زبردست تھی۔ ”امتحان“ ایقان علی بہت اچھا اور بہت اداس افسانہ تھا۔ عمر سے بہت ہمدردی محسوس ہوئی۔ آپ کا ایک الگ انداز ہے جو آپ کو منفرد بناتا ہے۔ مجھے آپ کا افسانہ بہت پسند آیا او سم، ”جینا تو ہے“ سحر مبین افسانہ لا جواب تھا۔ ”وطن کی مٹی گواہ رہنا“ ثناء ناز! آپ نے بہت خوب صورت افسانہ لکھا۔ شہادت کی اور حب الوطنی کی ایسی عظیم مثال آج کل کہاں ملتی ہے۔ ”اور سب ٹھیک ہو جائے“ راجکماری سارہ احسان آپ نے بھی بہترین لکھا۔ اسپیشلی وہ نظم جو آخر میں آپ نے لکھی تھی بہت پیاری تھی۔ ”ردا کی ڈائری“ میں مہرین کنول، افشان



سندیسے کی محفل میں حاضر خدمت ہے۔ پڑھنے والی تمام خوب صورت بصارتوں کو افشاں علی کا پُر خلوص سلام۔ جناب ایک ماہ کی غیر حاضری کے بعد افشاں علی پھر سے موجود ہیں امید ہے کہ آپ سب نے خوب سارا مس کیا ہوگا۔ عید الفطر کے موقع پر عیدی کے طور پر ہمیں جولائی کا خوب صورت سا سجا ہوا شمارہ موصول ہوا۔ سب سے پہلے ”گوشہ آگہی“ کو پڑھا۔ ایک بار، دو بار اور پھر تین بار۔ صالحہ آپنی نے خوب صورت الفاظوں کو پیار کی مالا میں پرو کر کیا خوب لکھا۔ شاہدہ علی کا مکمل ناول بھی ٹھیک رہا۔ ناولٹ جو کہ ثناء کنول کے قلم کا شاہکار تھا۔ بہت ہی خوب تھا۔ اتنے پیارے پیارے ناموں کے ساتھ تھوڑی سی Sad مگر بہترین تحریر پڑھنے کو ملی۔ فریدہ فرید خوب صورت سے انداز میں آپ نے تمام لڑکیوں و ماؤں کو بہت اچھا سا پیغام دیا۔ ویل ڈن۔ اقراء چنا، کائنات، غزل، مہرین کنول، تبسم فیاض، رابعہ افضل، سعدیہ اقبال، ماریہ عمران، شیریں تبسم، نوشین طاہر اور امبرین ناز ان سب نے بھی کافی اچھا لکھا۔ عید کے موقع پر صالحہ اپنا آپ کے قلم کا جادو بھی خوب رہا۔ درخشاں ضیاء نے بھی اچھے موضوع کی طرف توجہ دلائی۔ پیاری گیتی آراء اور عائشہ ذوالفقار ان دونوں نے بھی انوکھے اور دلچسپ موضوع پر لکھا۔ عید سروے میں سب کے جوابات پڑھے۔ مزا آیا۔ سندیسے کی محفل تو اس بار بہت بارونق رہی۔ پیاری سی رابعہ، صبا عبدالغنی، شمینہ آبی، ثناء کنول، گیتی آراء اور درخشاں ضیاء، افسانہ آفتاب ڈیر آپ سب کا بے حد شکریہ میری تحریر کو پذیرائی و پسندیدگی کی سند بخشنے کا۔ صبا عبدالغنی آپ کا پیغام دل کو چھو گیا۔ اب بات ہو جائے اگست کے شمارے کی۔ ماہ اگست وہ مہینہ

علی، مہوش جواد، دانیہ آفرین، روشنی فاطمہ اور مابدولت کے انتخابات زبردست تھے۔ ”اشعار“ میں سب نے اچھا لکھا۔ ”اس ماہ میں“ فریدہ فرید، عانیہ نیازی، صبا سحر، نور بانو، نور ملک، فرزانہ شوکت، ریمانور رضوان، سیدہ فرزین اور ایس امتیاز احمد کے انتخابات اچھے لگے۔ ”خوشبو“ بہت زبردست رہا۔ ”ذرا پھر سے کہنا“ میں رابعہ افضل، زینب ملک ندیم، ثناء کنول اور شہلا گل سحر کی شاعری اچھی لگی۔ باقی سب کی شاعری بھی متاثر کن تھی۔ ”سندیے“ میں رابعہ افضل خان، مصباح مسکان اینڈ امینہ، درخشاں ضیاء اور عانیہ نیازی کے سندیسے زبردست تھے۔ صالحہ آپنی! آپ نے بھی اپنے تمام محبت کرنے والوں کو یاد رکھا بہت اچھا لگا۔ ”دوستوں کے نام پیغام“ بھی ہر بار کی طرح بیسٹ تھا۔ ”گوشہ چشم“ ہر بار کی طرح شاندار تھا۔ دانیہ آفرین کی والدہ کی رحلت کا پتا چلا۔ بہت افسوس ہوا۔ آپ کے اس عم میں ہم سب آپ کے ساتھ ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کے تمام گھر والوں کو صبر جمیل عطا فرمائے، آپ کی والدہ کے درجات بلند فرمائے اور انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے، آمین۔ سعدیہ اقبال، زینب ملک ندیم، رمانور، ثوبیہ ملک، بسمہ ناز اور رخشنہ علوی کو خوش آمدید۔ ردا کے سنگ اپنا سفر یونہی جاری رکھیے گا۔ ”عید سروے“ میں مصباح مسکان اینڈ امینہ، شہلا گل سحر اور مومن شاہ تینوں نے اچھے جوابات دیئے اور اچھا لکھا۔ کچن اور سنگھار دونوں ہی اپنی جگہ بے مثال تھے۔ آخر میں اس دعا کے ساتھ اجازت کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کی زندگی خوشیوں سے ہمکنار کرے۔“

### افشاں علی.....کراچی

پیاری سی صالحہ آپنی و نورین آپنی سمیت میرے ہر عزیز قارئین! محبتوں کی ٹھنڈی میٹھی ہواؤں کے سنگ اور خلوص کی رم جھم پھوار لیے افشاں علی



دکھائے اور کیا خوب صورتی سے دکھائے پڑھ کر مزا آگیا۔ ویل ڈن ڈیز۔ تم نے واقعی اچھا سر پرائز دیا۔ بیسٹ ناول آف دا ایئر کے لیے ایڈوائس مبارک باد اور تمہارے قلمی سفر کو تین سال کا عرصہ مکمل ہوا۔ دعا ہے کہ یہ سفر یونہی کامیابی کے ساتھ جاری و ساری رہے۔ نوٹ! میں تمام قارئین و رائٹرز سے التماس کرتی ہوں کہ وہ ہماری پیاری رائٹر فرزانہ حبیب فرزین کے مرحوم والد اور دانیہ آفرین کی مرحومہ والدہ کے لیے خصوصی دعا فرمائیں جو کہ گزشتہ ماہ رحلت فرما گئے۔ اللہ ان کے درجات بلند فرمائے اور گھر والوں کو صبر عطا فرمائے، آمین۔ ردا کی ڈائری سے لے کر سنگھار تک سب ٹپ ٹاپ رہا۔ ہمیشہ کی طرح اس بار تو گوشہ چشم بھی شامل رہا۔ واہ کیا کہنے۔ اب آتے ہیں سندھیوں کی جانب سب سے پہلا سندھیہ واہ جی صالحہ آپنی کی جانب سے آیا دل خوش ہو گیا۔ دعا ہے کہ آپ یونہی خوش رہیں ردا دن دو گنی ترقی کرے اور یونہی ردا کے سنگ ہم سب بھی جڑے رہیں۔ آمین مسکان بکھیرتی مصباح مسکان دعا کے لیے شکر یہ روشنی کی طرح چمکتی ہوئی درخشاں ضیاء آپ کے پیار بھرے شعر کے لیے شکر یہ جب کہ ہماری پیاری سسٹر عانیہ نیازی آپ نے بھی یاد کیا بہت شکر یہ اب اجازت آئندہ ماہ پھر حاضر ہوں گی سندھیے کے ساتھ۔“

**ثناء کنول اللہ دتہ..... لودھراں**

السلام علیکم! دوستوں بہنوں ساتھیوں اور میری زندگی کی خوشیوں آپ سب کی خدمت میں ثناء کنول حاضر ہے۔

دیر سے آنے کا سبب نہ پوچھ

رستے میں تھیں مشکلیں بہت

یہ میرا بھی ابھی تازہ تازہ شعر ہے آپ سب کے لیے تو خیر سے اس بار ردا چار تاریخ کو مل گیا۔ جی ہاں جتنے آپ حیران ہو رہے ہیں اتنی میں بھی حیران

ہے جو ہمارے پیارے پاکستان کی سالگرہ کا مہینہ ہے۔ وہیں یہ ردا کی سالگرہ کا بھی مہینہ ہے۔ تو میں دعا گو ہوں کہ اللہ رب العزت اس پاکستان کو اپنی امان میں رکھے اور ساتھ ہی ہمارے پیارے سے ردا کو بھی ہمیشہ ہمارے سر پر سایہ فلکین رکھے۔ آمین۔ فریش سا آگست کا سرورق دل کو بے حد بھایا۔ سب سے پہلے صالحہ آپنی سے باتیں کیں۔ مطلب ”گوشہ آگہی“ میں آپنی کی باتیں قطرہ قطرہ شبنم بن کر دل کے گلابوں پر بکھری

سالہ سفر کی داستان دو صفحوں میں رقم کر لینا آسان بات نہیں وہیں یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی کہ بہت جلد آپ کا نیا ناول ردا کی زینت بن رہا ہے۔ شاز یہ آپنی اور قمرش کے ناول کی قسطیں مزیدار تھیں۔ فاطمہ خان اور نائلہ طارق کے ناول غیر حاضر نظر آئے۔ ”اندھیری رات میں چاند نکلا“ تو ”چاند رات کی چاندنی پھیلی“، ”ردا اپنوں کے سنگ“ دیکھ کر دل بے ساختہ بولا ”اترے چاند درتے میں“، ”محبت شوگ ہے جاناں“ اور واقعی ”امتحان“ بھی پر ”جینا تو ہے“ کیونکہ ”ایک چاند ہمسفر ہے“، ”وطن کی مٹی گواہ رہنا“ اور ”سب ٹھیک ہو جائے گا“ نوشاہہ فاروق کا نام بہت ٹائم بعد نظر سے گزرا ناول اچھا لکھا۔ روشنی فاطمہ کا مکمل ناول خوب رہا۔ جنہیں راستہ میں خبر ہوئی کہ عنوان سے نیلم ریاست نے بھی اچھا لکھا۔ نائلہ طارق کے ناول کی قسط نہ سہی پران کی تحریر پڑھنے کو ملی۔ جو یہ بانو کا انداز تحریر کافی انوکھا اور اچھا لگا۔ ایقان علی، سحر مبین، راج کماری اور سب کے افسانے بھی اچھے تھے جب کہ حب الوطنی سے چور ثناء ناز کا افسانہ بھی اچھا رہا۔ اب بات ہو جائے اس افسانے کی جس نے محفل لوٹ لی جی بالکل ہماری پیاری رائٹر فرزانہ حبیب فرزین نے ”ردا کے رنگ اپنوں کے سنگ“



سی تھی۔ ٹائٹیل ماشاء اللہ اچھا تھا۔ ”گوشہ آگہی“ میں صالحہ آپنی آپ نے بالکل صحیح لکھا۔ کہانیوں میں ثناء ناز، سحر مبین، عائشہ الیاس اور ایقان نے بے حد زبردست لکھا۔ سچ بہت خوب، سارہ راجکماری، فرزانہ حبیب گڈ یار بہت زبردست لکھا۔ نوشابہ فاروق ویلکم ردا۔ روشنی فاطمہ، نیلم ریاست، آپ کو بھی ویلکم بہت پیارا لکھا آپ نے بھی نائلہ طارق دوست، بہن اور کیا (ساتھی لکھ سکتی ہوں) بہت خوب زبردست مزا آگیا بہت صحیح لکھا تم نے کہانی کا نام بھی اچھا تھا۔ شاعری میں سب نے زبردست لکھا اچھا اب اجازت۔“

**فریدہ فریدہ..... پاکستان شریف**  
 ردا احباب اور سکھی سہیلیوں کو سلام خلوص! خوب صورت چہرے اور بے کے ڈریس میں مزین ٹائٹیل گرل کو دیکھ کر غور کرتے رہے کہ اچھے خاصے سوٹ پر گلے کا ڈیزائن تو نہ اگلا جائے نہ نگلا جائے کی تصویر پیش کر رہا تھا۔ نیا پن بھی کوئی تک کا ہونا چاہیے بعد ازاں اشتہارات کی بانسی کی نسبت چھوٹی جمپ لے کر فہرست تک پہنچے۔ نوشابہ فاروق نے تو انٹری دے کر سچ میں ہماری عید کر دی ان کا ادھورا ناول تو ہنوز دل میں موجود ہے۔ بہر حال ترتیب وار مطالعہ کرتے ہوئے ”گوشہ آگہی“ میں آپنی جان کے عزم سفر کی داستان نے حوصلے مزید بلند کر دیے۔ آپنی جان شفقت و ہمت کا وہ چراغ ہیں جس سے کئی چراغ جلے ہیں۔ سلسلے وار ناولز میں شازیہ جی حسب معمول شادی کے ہنگاموں کے ساتھ موڈ خوشگوار بنا لگیں۔ روشنی فاطمہ سینئر رائٹرز میں سے ایک ہیں ان کے ناول کے بارے میں اتنا ہی کہہ دینا کافی ہے ”چھا گئے ہوسے“۔ قمرش جی دل دہلا دینے والی تحریر محبتوں کی چاشنی سے تر کہانی پڑھتے رہو ہوش نہیں رہتا کھڑے ہیں کہ بیٹھے ہیں آپ کو فسون خیز رائٹر کہنا بے جا نہ ہوگا۔ خرمن اس ماہ

غیر حاضر تھی مگر نائلہ جی ہمارے پاس تھیں خوب صورت ٹائٹیل، لاجواب تحریر، ذوالکفل کی انوکھی اور حسین فرمائش تلاوت قرآن سے دن کا آغاز و اختتام کہاں ہوتے ہیں ایسے لوگ؟ پہلے سوچا پھر خود کو تنبیہ کی کہ ہم کون سا جواہر جیسے ہیں۔ نائلہ جی ویلڈن۔ نیلم ریاست کی میری ناقص معلومات میں شاید فرسٹ اسٹوری ہے اگر ایسا ہی ہے تو پھر نیلم آپ نے تو آتے ہی میدان مار لیا۔ پختہ انداز تحریر، داؤ داؤر زوہیہ کا غیر روایتی ملن داؤد کا ایکشن بھی الگ مسئلہ تھا تو داؤد کی فیملی کاری ایکشن بھی انوکھا تھا۔ کہانی کا پلاٹ روایت سے ہٹ کر مگر دلچسپ تھا اب بات کریں پیاری سی نوشابہ جی کی تو شفا سے شفا یاب ناول دلچسپ تھا ٹوک جھوک، مکالمات فیملی گید رنگ سب انٹریٹنگ تھی اسد سے زیادہ افسر توجہ کا مرکز رہا۔ پاکستانی فلموں کا تجربہ بھی انتہائی حقیقت پر مبنی تھا اور آل ناول از دا بیسٹ۔ افسانے کی سر زمین ردا ہو اور افسانے با کمال نہ ہوں ناممکن ہے۔ عید رنگ سے جی تحریریں چاند رات کی چاندنی اچھی کاوش تھی۔ ایقان علی ہمیشہ متنوع موضوعات کے ساتھ آتی ہیں اور دل میں سما جاتی ہیں۔ سحر مبین مختصر اور جامع تحریر جی جویریہ بانو نثر اور نظم کا حسین امتزاج تھا تحریر میں۔ ثناء ناز اگست کی مناسبت سے اثر انگیز تحریر کے ساتھ اچھی لگیں۔ راجکماری سارہ جتنی مختصر تحریر بھی اسی قدر پراثر بھی اور ہماری پیاری دوست فرزانہ حبیب کو بیسٹ رائٹر آف دی ایئر بننا بہت بہت مبارک ہو۔ افشاں جی ایوارڈ لینے کے لیے جاتے ہوئے ہمیں بھی ساتھ لے جاتیں تھوڑی سی کلپنگ (تالیاں) ہی کر لیتے۔ عید سروے میں مصباح کے دلچسپ جوابات سے ملاحظہ ہوتے ہوئے ردا کی ڈائری سے افشاں علی کی انتخابی نظم کو چپکے سے قرطاس میں اتارا۔ ”اس ماہ میں“ نورین ملک کے انتخاب کو داد دئے بنا آگے



والی تمام کہانیاں دل میں اترتی محسوس ہوئیں اور آپنی آپ کے افسانے نے تو جیسے دل کو بھینچ لیا۔ افسانہ نصیحت آمیز تھا خاص کر وہ لاسٹ سین جب وہ گاڑی کی ونڈو میں سے ہاتھ نکال کر بارش کی بوندوں کو محسوس کرتی ہے اور روشن آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہتی ہے ”مجھے دکھ اس بات کا نہیں ہے کہ تم کیوں چلی گئیں دکھ تو اس بات کا ہے کہ میں اب تک زندہ کیوں ہوں۔“ کیا درد تھا اس میں آپ کے لکھتے وقت کے جذبات بہت نمایاں تھے اور آخر میں شعر کہانی کا نچوڑ تھا۔ میں نے پورا افسانہ زبانی اپنی ماما کو سنایا میری عادت ہے جو بات بھی میں دل سے محسوس کرتی ہوں وہ ماما کو لفظ بہ لفظ سناتی ہوں۔ ڈائلاگ میں کوئی غلطی ہوئی ہو تو معاف کیجئے گا کیوں کہ یہ میں نے بنا دیکھے لکھا ہے۔ بہر حال اب آتی ہوں اپنے اہم مقصد کی جانب تو آپنی سب سے پہلے آپ کو سالگرہ کی ڈھیروں مبارک باد معاف کر دیجئے گا۔ میرا خط بہت دیر سے پہنچا لیکن محبت تو تر و تازہ ہے نا۔ خدا آپ کو درازی عمر، صحت یابی، عزت اور اعلیٰ مقام عطا کرے۔ آپ کا شمار ان مختلف لوگوں میں ہوتا ہے جو آنکھ کی ظاہری روشنی سے نہیں بلکہ باطن کی روشنی سے دیکھتی ہیں جو بلاشبہ بہت گہری اور خوب صورت ہے آج جس طرح آپ یہ ادارہ چلا رہی ہیں یہ عورتوں کے لیے کچھ کر دینے کی بہترین مثال ہے۔ آپنی میں ردا میں بہت خط تو نہیں لکھتی لیکن اس کا ہرگز مطلب یہ نہیں ہے کہ میں کسی کو پڑھتی نہیں ہوں۔ ہاں تبصرہ کرنا ضروری ہے لیکن یقین جانے سب سے بڑا مسئلہ پوسٹ کروانے کا ہے میں کہانیاں بھی بڑی مشکل سے پوسٹ کروا پاتی ہوں۔ ہاں پوسٹ آفس میرے گھر کے برابر میں ہوتا تو یقین کریں ہر ماہ ایک خط میرا بھی ردا میں شامل ہوتا۔ بہر حال صبا کے لفظوں نے دل پر بہت اثر کیا کہ سینئر کی تو

بڑھنا ممکن ہی نہیں ہے۔ اس ماہ کی مزاحیہ نظم، ریمیا نور نے موڈ خوشگوار بنا دیا ایس امتیاز کے انتخاب اچھے ہوتے ہیں۔ ”خوشبو“ سلسلے میں رابعہ افضل، ثناء کنول، سعدیہ عابد سب کا انتخاب اچھا تھا۔ ”ذرا پھر سے کہنا“ میں ریمیل آرزو کی نظم اور فرزانہ شوکت کی نظم اچھا انتخاب تھا۔ ”کچن“ میں جب بریانی کا ذکر آجائے تو پھر کچھ اور اچھا نہیں لگتا۔ ”سندیے“ کی بات کرنے کے لیے تو اب ہم بے چین رہنے لگے ہیں۔ ردا و تاریخ کو ملا تو جہاں خوشی سے کھل گئے وہیں سندیے میں محفل ذرا سی سونی پا کر مرجھا سے گئے مگر ہماری رابعہ افضل ہیں ناں تو پھر کیا غم وہ ہوں ہم ہوں ایک ہی بات ہے۔ رابعہ آپ سے ہمیں دو وجہ سے انیت ہے ایک تو آپ بے حد پیاری ہیں اس لیے ہمیں اچھی لگتی ہیں دوسری وجہ یہ ہے کہ آپ رابعہ افضل ہیں اور ہم بھی شادی سے پہلے فریدہ افضل تھے۔ میری بڑی بہن کا نام رابعہ افضل ہی ہے اور وہ مجھے بہت پیاری ہے آپ کی طرح۔ مصباح مسکان ہم کچھ دن پہلے سوچ رہے تھے کہ تلاش گمشدہ کا ایڈے دیں مگر شکر ہے آپ جلد لوٹ آئیں اب غائب مت ہونا۔ درخشاں ضیاء آپ کی تحریر آپ کے نام کی مانند جگمگ ہوتی ہے اب ہم سے جدا مت ہوئے گا۔ عانیہ جی تو اپنی ذات میں خود انجمن ہیں۔ معتبر رائے کی حامل عانیہ کی ہر بات ہمیں اٹریکٹ کرتی ہے۔ عید سروے میں عانیہ اور ریمیا نور کو تو ہم تلاشے ہی رہے۔ آخر میں سب کو ڈھیروں پیارا اور خدا حافظ۔“

### عائشہ الیاس.....کراچی

السلام علیکم صالحہ آپنی امید ہے بخیر و عافیت سے ہوں گی۔ سب سے پہلے ردا کے خوب صورت عید نمبر کی مبارک باد وصول کریں۔ کیا خوب سب نے لکھا۔ تمام لکھاری بہنوں نے کیا خوب عید کی رونق کا سماں باندھا۔ بہترین نصیحت کے ساتھ لکھی جانی



لے کر سارا گھریلو زندگی کا تذکرہ ہو یا تہواروں کی خوشیاں سب نظر آتا ہے۔ ایسا نہیں کہ میں اس میں لکھتی ہوں تو سراہ رہی ہوں آپنی میں واقعی سخت قسم کی حقیقت پسند انسان ہوں اور جو میں نے حج کیا وہ بتا دیا۔ اچھا آپنی اب اجازت دیجیے زندگی رہی تو آئندہ بھی لکھوں گی آپ اپنا بہت خیال رکھیے گا نورین آپنی اور ردا کی تمام لکھاری بہنوں کو میرا دل سے سلام اور آپ سب ہی کو یوم آزادی اور عیداضی بہت مبارک ہو۔“

**عانیہ نیازی..... ربوہ**

پیاری سوٹ صالحہ آپنی اور نورین ملک آپ کو اور تمام پڑھنے والوں کو میرا سلام الفت قبول ہو۔ ماشاء اللہ ردا اپنی مسافت کے 20 سال کامیابی سے مکمل کر چکا۔ یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔ آپنی آپ کو اور تمام اشاف کو مبارک باد۔ آپنی آپ کو آپ کی سالگرہ کی بھی ڈھیروں مبارک باد۔ خدا آپ کو صحت والی لمبی زندگی عطا کرے، آمین۔ اب بات ہو جائے عید نمبر کی تو میرے پاس لفظ کم پڑ رہے ہیں اتنے شاندار عید نمبر کی تعریف سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ پھر وہ فریدہ فرید ہوں، روشنی فاطمہ، ایقان علی، عائشہ الیاس، ثناء کنول، نوشاہہ فاروق، نیواور سینئر رائٹرز کی تحاریر سے سچ عید نمبر بہت خوبصورت اور عید کی بہترین ٹریٹ تھے اور میرے طرف سے تمام رائٹرز کو بہت بہت مبارک باد۔ اب تو سندیے کی محفل بھی خوب سجنے لگی ہے اور بڑا اچھا لگتا ہے جب معتبر رائٹرز اپنے قلم سے دیگر رائٹرز کو سراہنے کے ساتھ مجھ ناچنے کو بھی یاد رکھتی ہیں۔ آپ کی محبتیں چاہتیں میرے لیے سرمایہ حیات ہیں۔ خوش رہیں اور یونہی ہم سب میں یہ پیار بھرا قلمی تعلق سدا قائم رہے، آمین۔

☆.....

ہر کوئی تعریف کرتا ہے لیکن ضروری ہے ان نئے لکھاریوں کو جو بالکل نئے ننھے پودے کی طرح ہوتے ہیں جنہیں بہترین نگہداشت سے ہی مضبوط پروان چڑھایا جاسکتا ہے تو اب میں بھی پوری کوشش کروں گی انہیں سراہ سکوں۔ آپنی ایک بات اور یوں تو ردا کی ڈھیروں تعریفیں آپ وصول کرتی ہیں لیکن آج میں بھی اس کے اعزاز میں کہنا چاہوں گی کہ واقعی جس طرح آپ نے اسے تخلیق کیا ہے اس پر سلام آپ کو ”کیوں“ وہ اس لیے کہ مجھے اپنے کچر اور روایتوں سے محبت ہے لیکن آج کے دور میں بہت سے میگزین کی کہانیوں نے اپنا کچر گنوا کر ویسٹرن کچر کی اہمیت کو اجاگر کر دیا ہے۔ میں اس کے خلاف نہیں ہوں لیکن یہ بھی حقیقت ہے آج بہت سی رائٹرائی کہانیوں میں تسلسل کے ساتھ ویسٹرن اسٹوریز کی جھلک دکھاتی نظر آتی ہیں۔ ٹھیک ہے انگریزی ناول پڑھنے میں کوئی قباحت نہیں لیکن کم از کم ہمیں تو اپنی کہانیوں میں اپنی ثقافت کو اجاگر کرنا چاہیے آنے والے نئے لوگ جب یہ پڑھیں تو انہیں ان کتابوں سے اپنا آپ نظر آنا چاہیے جو ان کا اصل ہے۔ ورنہ تو اگر یونہی چلتا رہا تو وہ وقت دور نہیں جب ہم اور ہماری ثقافت کم سے گنما ہو کر رہ جائے گی۔ جب میں نے یونیورسٹی میں ثقافت کے اوپر پریزینٹیشن دی تو پوری کلاس نے مجھے مبارک باد دی لیکن میری ٹیچر نے مجھے صرف اتنا کہا، میں پاکستان کی ثقافت کو نہیں مانتی کیوں کہ وہ اب زندہ ہی نہیں ہے۔ یہ میرے لیے ایک بڑی تلخ حقیقت تھی لیکن حقیقت تو تھی۔ جب ہم ہی اسے گنما کر رہے ہیں تو ہم ہی ہیں جو اسے اجاگر کر سکتے ہیں لیکن صد افسوس نہ جانے اب کیوں یہ کوئی سمجھنے کو تیار نہیں ہے لیکن ردا کے لیے میں ضرور کہوں گی مجھے اس میں ثقافت نظر آتی ہے جو ہماری پہچان ہے جس میں گاؤں سے



# فرشتوں کے نام سے دعا

صالحہ آپی اور نورین ملک کے نام

پیاری صالحہ آپی اور نورین جی السلام علیکم! نورین جی آپ سے میری فون پر بات ہوئی تھی میں نے آپ کو خوشی خوشی ردا کی سالگرہ کے موقع پر اپنے خصوصی سربراہ افسانے کا بتایا تھا اور اب اگست کا مہینہ ہمارے گھر کی فضا کو سگووار کر گیا۔ 23 جولائی 2015ء کو میرے پیارے والد، میرے دوست، میرے ہمراز خاموشی سے ہنستے مسکراتے اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔ اس سے پہلے میرے چار سو صرف خوشیاں اور کامیابیاں تھیں مگر ان کے جانے کے بعد زندگی ختم سی ہو گئی ہے ایسا لگتا ہے اب کچھ بھی کرنے کے لیے نہیں بچا مگر جینا تو پڑتا ہے۔ دعا کیجیے اللہ مجھے اور میری فیملی کو اس ناگہانی دکھ کو سہنے کی ہمت اور صبر عطا فرمائے اور مجھ پر جو ذمہ داریاں ہیں جو خواہشات اور آرزو میرے والد اپنے دل میں لے گئے ان کو پورا کرنے کی مجھے توفیق دیں۔ وہ میری ہر تحریر پر بہت خوش ہوتے تھے۔ وہ ہمارے درمیان نہیں مگر مجھے یقین ہے ان کی دعائیں ہمیشہ ہمارے ساتھ رہیں گی۔ تمام قارئین سے درخواست ہے کہ میرے والد کی مغفرت کے لیے ایک بار ضرور دعا کر دیں۔

وہ حلقہ یاراں، وہ میری شوخ مزاجی

اے گردشِ حالات بتا، وہ وقت کہاں ہے

صالحہ آپی! آپ سے مجھے بہت ملنے کی آرزو تھی افشاں سے بات ہوئی تھی سوچا تھا اپنے والد کے ساتھ ماہ اگست میں آپ سے ملنے آؤں گی اور ردا کی سالگرہ اور آپ کی سالگرہ کی مبارکباد رو برو دوں گی

مگر اللہ کی حکمت کے سامنے ہم انسانوں کی پلاننگ دھری رہ جاتی ہے۔ بس دعا ہے اللہ پاک آپ کو ہمیشہ خوش و آباد رکھے اور آپ کے دل کی ساری جائز خواہشات کو پوری کریں۔

☆ سوئٹ فرزانہ! آپ کا افسانہ اور آپ کا پیغام ملا۔ فرزانہ آپ کا سندیسہ پڑھ کر ہمیں بھی بہت دکھ ہوا۔ والدین دنیا کی عظیم ترین ہستیاں ہوتی ہیں۔ یقیناً آپ کے لیے یہ سانحہ بہت بڑا ہے۔ خدا آپ کو اور آپ کی فیملی کو صبر و جمیل عطا کرے اور آپ کے والد کے درجات بلند کرے، آمین۔

سیدہ فرزین حبیب۔ کراچی

ردا کی سہیلیوں کے نام

حسب عادت سب سے پہلے تمام خوب صورت بصارتوں اور سماعتوں کو میرا پیارا سا سلام الفیت قبول ہو، السلام علیکم۔ میری پیاری سی سہیلیوں افشاں علی، حمیرا عروش اور سدرہ شاہ آپ تینوں کو آپ کی برتھ ڈے کی ڈھیر ساری مبارکباد۔ افشاں علی! آپ کے لیے کیا لکھوں سمجھ میں ہی نہیں آ رہا۔ میں بہت خوش قسمت ہوں کہ مجھے آپ جیسی دوست ملی۔ میری دعا ہے کہ آپ سدا یونہی ہنستی مسکراتی رہیں اور ہمیں بھی ہنساتی رہیں، آمین۔ پیاری سی حمیرا عروش! کہاں کم ہیں آپ؟ پلیز جلدی سے تشریف لائیں۔ آپ کو آپ کی برتھ ڈے کے ساتھ ساتھ شادی کی بھی ڈھیروں مبارکباد۔ دعا ہے کہ آپ اپنے ہمسفر کی سنگت میں ہمیشہ خوش رہیں اور ردا سے جڑی رہیں، آمین۔ پیاری سی سدرہ شاہ! ویری بیڈ ایک بار حاضری کے بعد غائب ہونا اچھی بات

READING  
Section



نہیں۔ چلیں جلدی سے واپس آئیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کی ہر خواہش اور ہر دعا پوری کرے، آمین۔ ثناء کنول اللہ دتہ! آپ میری بہت اچھی بالکل پکی والی فرینڈ ہیں۔ آپ کی باتیں میرے لبوں پر مسکان بکھیر دیتی ہے اور جب میں خوش ہوں تو آپ کیسے اداس ہو سکتی ہیں۔ ایک مشورہ ہے میرا آپ کو کہ آپ جب بھی کبھی اداس ہوں تو مجھے یاد کر لیجئے گا۔ دیکھیے گا لبوں پر مسکراہٹ ضرور نمودار ہوگی۔ ڈیر رابعہ افضال خان! بڑی ہستی وہ ہوتی ہے جس کی قدر، عزت اور جگہ دل میں بڑی ہوتی ہے۔ اب تو آپ کو نہیں لگتا نا کہ آپ بڑی ہستی نہیں ہیں اگر اب بھی آپ کو ایسا لگتا ہے کہ میں نے غلط کہا تو آپ میرے دل میں جھانک کر دیکھ لیں پتا چل جائے گا کہ میں نے سچ کہا یا غلط۔ افسانہ آفتاب کاوش! میں آپ کو یاد کر رہی ہوں اور آپ کی تحاریر کو بھی۔ اس لیے پلیز جلدی حاضری دیں ردا میں۔ امیرین حیدر! جلدی سے ردا میں انٹری دیں اور اپنا بہت سا خیال رکھیں۔ سحر مبین! میری کیوٹ فرینڈ کیسی ہیں؟ آپ کی دوستی میرے لیے بہت اہم ہے۔ اسے ہمیشہ یونہی قائم و دائم رکھیے گا۔ فریدہ فرید! آپ نے میری تعریف کی۔ مجھے تو یقین ہی نہیں آیا۔ آپ جیسی سینئر راسٹرز کی تعریف میرے لیے کیا اہمیت رکھتی ہے کیسے بتاؤں؟ آپ نے میری کتنی حوصلہ افزائی کی ہے اور مجھے کتنی خوشی دی ہے میں آپ کو بتا نہیں سکتی۔ جزاک اللہ۔ مون شاہ! آپ چاہتی ہیں کہ ہم سب آپ کے لیے دعا گو رہیں۔ ڈیر فرینڈ! میں سب کے لیے دعا کرتی ہوں۔ اس میں آپ بھی شامل رہتی ہیں اور مجھے بھی دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔ ملالہ اسلم! آپ کہاں غائب ہیں؟ اور وہ آپ کی فرینڈ ماہادہ کیسی ہیں؟ جلدی سے ردا میں انٹری دیں اور میرے سوالوں کا جواب دیں ادکے۔ مصباح مسکان رؤف اینڈ امینہ! میرا سندیسہ پسند کرنے کا بے حد شکریہ اور آپ دونوں کے سندیسے اور عید سروے دونوں ہی زبردست تھے۔

آئندہ بھی سندیسہ لکھتے وقت مجھے ضرور یاد رکھیے گا۔ اور ہاں! مصباح مسکان آپ کا رزلٹ جیسے ہی آئے ہمیں ضرور بتائیے گا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ہر امتحان میں کامیابی عطا فرمائے آمین۔ سویٹ عانیہ نیازی! اپنے سندیسے اور پیغام میں آپ نے مجھے یاد رکھا اور اتنی ساری دعاؤں اور پیار سے نوازا۔ اس کے لیے جزاک اللہ۔ درخشاں ضیاء! میرا پیغام آپ کو پسند آیا جزاک اللہ۔ آپ کی بات بھی درست ہے کہ کہیں بھی جگہ بنانے میں وقت تو لگتا ہے۔ میں آپ کی بات سے اتفاق کرتی ہوں۔ آپ کا افسانہ بہت اچھا تھا اور اپنی فرینڈ ز لسٹ میں آپ نے مجھے بھی یاد رکھا۔ چلیں اب پکی والی فرینڈ شپ اوکے۔ جن دوستوں کے نام یاد نہیں رہے ان سے معذرت۔ امید ہے ناراض نہیں ہوں گی۔ آپ سب لوگ میرے لیے کیا اہمیت رکھتے ہیں۔ میں یہ شاید کبھی بھی ڈسکرائب نہ کر پاؤں۔ آپ لوگوں کی باتیں، آپ لوگوں کی تعریف اور ہنسی مذاق سب کچھ بہت خاص ہے بہت خاص۔ میرا رب مجھے اتنی ساری محبتوں سے نوازا رہا ہے جو میں نے کبھی بھی ڈیز رو ہی نہیں کیں۔ میں اپنے رب کی شکر گزار ہوں جس نے مجھے ڈھیر ساری نعمتوں سے نوازا۔ آخر میں اس دعا کے ساتھ اجازت دیجئے کہ اللہ تعالیٰ ردا سے جڑے ہر فرد کو بے انتہا خوشیوں، رحمتوں، نعمتوں اور برکتوں سے نوازے۔ آپ سب کو ہمیشہ خوش رہنے اور خوشیاں بانٹنے کی توفیق عطا فرمائے اور بیماروں کو شفا کاملہ عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین۔ سانسوں نے وفا کی تو پھر ملاقات ہوگی، اللہ حافظ۔“

صبا عبدالغنی۔ کراچی

صالجہ آبی اور نورین جی کے نام

میرے دلی جذبات

آپ کے اور

میرے

درمیاں

ردا ڈائجسٹ [215] ستمبر 2015ء

READING  
Section



سے رائٹرز کے لیے محبت بھرے پیغام بھیجتی ہو جو بہت پیارے لگتے ہیں۔ بالکل تمہاری طرح۔ خدا سے تمہارے لیے دعا ہے کہ خدا آنے والی زندگی کو خوشیوں سے بھر دے اور تمہارے نصیب کو اچھا کرے، آمین۔

عائشہ الیاس۔ کراچی  
روشنیوں کے شہر کراچی میں گم عزیز ہستی کے نام سوئیٹ R! سنا ہے آپ نے روشنیوں کے شہر کراچی میں بسرا کر لیا ہے اور ردا ڈائجسٹ سے دوستی کر لی ہے۔ اس کے توسط سے آپ سے مخاطب ہوں۔ 10 ستمبر آپ کا جنم دن ہے لیکن ہماری بے بسی دیکھو کہ ہم اس بار اس یادگار دن کو تنہا رہ کر گزاریں گے کیوں کہ آپ کو تو ویسے بھی ہم سے اب کوئی لگاؤ نہیں رہا اور بقول آپ کے، ہم جیسے محروموں کے ماروں اور سیاہ نصیبوں کو آپ پسند نہیں کرتے۔ یقیناً جانے۔ ہم نے تو اسی دن سے آپ کی طرف جانے والے دوستوں کے نشان مٹا دیئے ہیں۔ پھر بھی اس خوب صورت دن کے حوالے سے ہماری طرف سے جنم دن مبارک ہو۔ اللہ تعالیٰ آپ کو سدا خوشیوں و کامیابیوں سے ہمکنار کرے، آمین!

عابد محمود ملکہ ہانس۔ پاکپتن

صالحہ اور پیاری دوستوں کے نام

پاری صالحہ جی! میری دوست بہن ہمسفر ہم راہی۔ تمہاری ستمبر میں برتھ ڈے ہے تو پپی برتھ ڈے ٹویو۔ خدا آپ کی عمر دراز کرے۔ لاکھوں کروڑوں خوشیاں عطا کرے۔ ہمیشہ شادا اور آبا در ہیں، آمین۔

جب سے تیرے نام کر دی زندگی اچھی لگی  
تیرا غم اچھا لگا تیری خوشی اچھی لگی  
تیرا پیکر تیری خوشبو تیرا لہجہ تیری بات  
دل کو تیری گفتگو کی سادگی اچھی لگی  
پاری سی افشاں علی میری جان میری زندگی میری  
دھڑکن اور میرے چہرے کی مسکراہٹ۔ ستمبر میں تمہاری

ان دیکھا سا

رشتہ ہے

اس میں ڈھیر

سارا خلوص

محبت، پیار،

خیال، احساس

شامل ہے یہ

ان دیکھا رشتہ

ان رشتوں سے

قدر کے اول درجے

بہتر ہے جو صدا

ہمارے ساتھ

ہمارے پاس

رہتے ہیں

مگر ہمارا احساس

نہیں کرتے

مگر ہمارا خیال

نہیں کرتے

آپ کے اور میرے

درمیان

ان دیکھا سا رشتہ

رب سدا سلامت

و قائم رکھے

آمین!

ریمانور رضوان۔ کراچی

ثناء کنول اللہ دتہ کے نام

پاری سی ثناء کنول اللہ دتہ السلام علیکم امید ہے خیریت سے ہوں گی۔ منگنی کی بہت بہت مبارک ہو۔ منگنی کے خوب صورت احوال نے یقیناً جانو بالکل یہی احساس دلایا کہ ہم بھی جیسے وہاں موجود ان مناظر کو دیکھ رہے ہیں تم شاید مجھے نہ جانتی ہو لیکن میں تمہیں جانتی ہوں۔ ردا میں ہر ماہ بڑے خوب صورت طریقے



برتھ ڈے ہے تو بہت بہت مبارک ہو سدا خوش اور آباد رہو۔  
اس کو کیسے بھول جاؤں ناصر کیسی باتیں کرتے ہو  
صورت تو پھر صورت ہے وہ نام بھی اچھا لگتا ہے  
پیاری عانیہ نیازی اینڈ حافظہ مون شاہ بخاری! ستمبر  
میں تمہاری بھی برتھ ڈے ہے تو بہت بہت مبارک ہو۔  
سالگرہ سدا آباد اور شاد رہو۔ میری پیاری دوستوں خدا  
آپ کو سلامت رکھے۔ پیاری سی حمیرا عروش سوری حمیرا  
شعیب میری دوست پپی برتھ ڈے بہت بہت مبارک  
ہو۔ ہمیشہ آباد رہو۔ حمیرا عروش خدا آپ کو ہمیشہ سہاگن  
رکھے اور نئے رشتوں کو نبھانے کی توفیق دے۔ صنم ناز  
ستمبر میں آپ کی بھی برتھ ڈے ہے، سو پپی برتھ ڈے۔  
آپ سب کے لیے چھوٹی سی دعا۔  
ملے تجھے نہ دکھ زندگی میں  
پھول کی طرح مہکے خدا کرے

زندہ رہے نام ابد تک تیرا  
سالگرہ کی خوشیاں تجھے مبارک خدا کرے (آمین)  
پلیز دوستوں وعدہ کرو مجھ سے  
ساتھ چھوڑ کے کبھی ہم سے جدا مت ہونا  
وفا چاہیے آپ سے کبھی بے وفامت ہونا  
روٹھ جائے ساری دنیا ہم سے  
مگر آپ ہم سے کبھی خفامت ہونا (وعدہ؟)  
پیاری ایقان تمہاری تحریر امتحان بہت پیاری تحریر  
تھی۔ بہت میچورنی نظر آئی تمہاری کہانی میں گڑیا۔  
ثناء کنول اللہ دتہ۔ لودھراں

### ردا کے دوستوں کے نام

ہر انسان کی ازلی خواہش ہے "میرے مزاج کے  
سب موسموں کا ساکھی ہو"۔ الحمد للہ ہمارا دل عزیز ردا  
ڈائجسٹ ہمارے مزاج اور کائنات کے ہر موسم سے سجا  
ہر رنگ سے مزین ہے۔ ردا عید نمبر کے نام یہ پیغام بطور  
مزاج عقیدت ہے۔ آپنی جان کی ہمت و شفقت کا  
آئینہ دار ردا، نورین ملک کے اخلاق و خلوص کا سنگھار ردا  
سکھی سہیلیوں کی کاوش و خصائص سے مہکتا ردا عید نمبر

مسام جاں کو معطر کر گیا۔ ایک ایک سطر ایک ایک سلسلہ  
تحریر، اشعار، پکوان، بیوٹی ٹپس، سب عید نمبر کے  
عکاس تھے۔ آپنی نے مسکراتا "گوشہ آگہی" سے ابتدائی  
اینٹ رکھی اور پھر سینٹرز کے باکمال ہاتھوں کا اعجاز ناؤز  
کے بطور جلوہ گر ہوا۔ افسانے کی سر زمین ردا کو افسانوی  
سکھیوں نے چار چاند لگا دیا۔ چاہے وہ محترم صالحہ آپنی  
ہوں یا کیوٹ سی رابعہ افضال، سینٹر کیتی آراء سے لے کر  
جونیرز سعدیہ اقبال، ماریہ عمران، شیریں تبسم، نوشین  
طاہر، امبرین ناز، تبسم فیاض، مہرین کنول، امراء چنا  
ہوں ہر ایک انگوٹھی میں نکینے کی طرح فیک عید رنگوں میں  
نہلانی کائنات غزل، عائشہ ذوالفقار یا جگمگاتی درخشاں  
ضیاء ہر ایک نے اپنی اپنی جگہ سکھ جمایا عید سروے نے  
سکھیوں کے معمولات کارے آگاہی دی۔ شوخ و شنگ  
افشاں جی ہر لفظ میں کھلکھلاتی عید کی خوشیاں دو بالا کر  
کنیں۔ شازیہ جی، قمرش جی، سباس جی، روشنی فاطمہ،  
نانکہ جی کی بابت جان کر حیرت ہوئی ارے آپ لوگ  
بھی ہماری طرح ہی جیتے ہیں۔ ثناء کنول تازہ تازہ نچوگ  
اور ایسا روگ کس لیے؟ افسانہ آفتاب جناسنگ سلامت  
رہیں۔ مدیحہ اعجاز، زارا صدف انتہائی صاف گوجو بات  
ویل ڈن۔ فرح ناز، درخشاں ضیاء، سحر مبین، مہرین  
کنول، پیارے لوگ پیاری باتیں، ایقان علی، سوٹ  
افسانے اور تلخ ارادے کیوں یار؟ کیتی جی بندھن جتنا  
پرانا اتنا دلفریب ہے نا۔ ریمیل آرزو اور شاہدہ کی عید  
رہنمائی مزے کی تھی۔ فرزانہ حبیب عید سروے کا خوب  
صورت آغاز ہوا آپ کے خوب صورت لفظوں سے۔  
بہت پیاری رابعہ افضال عید نمبر تو آپ کے نام ہے۔ ہر  
سلسلے میں آپ کی بھرپور شرکت لاجواب انتخاب نہ  
سراہانا زیادتی ہے۔ آپ کے قلم میں بہت وسعت  
ہے۔ ریمیا نور اور عانیہ نیازی کتھے ہو سارا عید سروے  
چھان لیا۔ بہر حال ادور آل ردا عید نمبر از بیسٹ!  
فریدہ فرید۔ پاکپتن

☆.....



# گوشتہ چشم

یونہی مجھے ہر سال وش کرتی رہیں آپ کا مرتبہ بلند ہو  
اور خدا نصیب بہت اچھا کرے۔

سائرہ حبیب..... پنڈی  
سوئیٹ سائرہ! آپ کا کارڈ مجھ سے زیادہ  
میرے اسٹاف کو پسند آیا، بے حد شکریہ۔

عانیہ نیازی..... ربوہ  
سوئیٹ عانیہ! خوش رہیے آپ کے برتھ ڈے  
کارڈ اور دعاؤں کا بہت شکریہ خوش رہیے۔  
نور بانو..... کوئٹہ

پیاری نور بانو! آپ ہماری بہت پرانی اور ہر  
دل عزیز قاری ہیں۔ آپ کا کارڈ بھی بہت پیارا اور  
دلکش تھا۔ بہت شکریہ خوش رہیے۔

شائلہ وعبار..... عمان  
پیاری شائلہ! خوش رہیے بہت عرصے بعد آپ  
کی رد میں آمد اچھی لگی۔ آپ کی تحریر مل گئی ہے۔ انشاء  
اللہ قریبی اشاعت میں شامل ہوگی۔ اپنا خیال رکھیے  
اور رد سے جڑی رہیے۔

عائشہ خان..... ٹنڈو خان  
ڈیر عائشہ! آپ کا افسانہ مل گیا ہے۔ انشاء اللہ  
قریبی اشاعت میں شامل ہوگا۔

آسیہ مظہر چوہدری..... آزاد کشمیر  
سوئیٹ آسیہ! خوش رہیے آپ کی تحریر ہمیں مل گئی  
ہے۔ انشاء اللہ قریبی اشاعت میں شامل ہوگا۔ آپ  
نے سند یہ نہیں لکھا آئندہ سند یہ ضرور لکھیے گا اور اپنی  
تحریر کے ساتھ اپنا مکمل پتہ اور فون نمبر ضرور لکھیے۔

فرزانہ فرزین حبیب..... کراچی  
پیاری فرزانہ! آپ کا سند یہ بمع افسانہ موصول  
ہوا۔ آپ کا سند یہ دکھ اور آنسوؤں بھرا بڑھ کر ہم بھی  
افسردہ ہو گئے۔ بے شک والدین جیسی عظیم ہستی کوئی  
نہیں ہو سکتی اور جس طرح آپ کے والد نے آپ  
لوگوں کی پرورش و تربیت کی یہ بات قابل تحسین ہے۔  
ادارہ آپ کے غم میں برابر کا شریک ہے۔ خدا آپ کے  
والد کے درجات بلند کرے۔ آپ کو اور آپ کی فیملی کو  
صبر جمیل عطا کرے، آمین۔ تمام قارئین سے التماس  
ہے کہ وہ فرزانہ فرزین کے والد کے لیے دعا کریں۔

میتھی آراء..... کراچی  
سوئیٹ میتھی! آپ کا محبت نامہ ملا۔ پڑھ کر اچھا  
لگا۔ آپ کا عید کارڈ ہمیں اس بار موصول نہیں ہوا اور نہ  
یہ کیسے ممکن تھا کہ ہم آپ کو یاد نہ رکھتے۔ خوش رہیے اور  
آپ کا افسانہ بچت آنے والے دنوں میں لگ جائے  
گا۔ بس تھوڑا انتظار۔

ناصرہ مظہر..... کراچی  
سوئیٹ ناصرہ مظہر! ہماری بہت پیاری دوست  
جو کہ ہمیں 14 اگست کو ہماری سالگرہ وش کرنے  
ہمارے گھر آ رہی تھیں کہ راستے میں ڈاکوؤں نے  
انہیں لوٹ لیا اور اس طرح سے ہمارا گفٹ بھی چلا  
گیا۔ اب ناصرہ اگلی بار ذرا دیکھ بھال کے چلنا۔ اللہ  
سب خیر کرے گا۔

عائشہ الیاس..... کراچی  
عائشہ ڈیر! بہت شکریہ آپ کے برتھ ڈے کارڈ  
کا آپ کا کارڈ مجھے بہت پسند آیا۔ خدا کرے آپ



کراچی ..... حلیمہ ودود  
 پیاری حلیمہ ودود! کیسی ہیں آپ؟ افسوس کہ ہماری آپ سے بات نہ ہو سکی آپ پھر فوراً مجھے کال کر لیں اور رابطہ نمبر ضرور دیں۔ آفس میں ہم ملیں یا نہ ملیں۔ میں فون کرتی ہوں آپ کو مگر شاید آپ کا نمبر تبدیل ہو گیا ہے۔

امبرین حیدر ..... اسلام آباد  
 سوئیٹ امبرین حیدر! خوش رہیے آپ کی دعاؤں اور پیار کا بے حد شکریہ آنے والے دنوں میں آپ کی تحاریر ضرور شامل اشاعت ہوں گی۔

کراچی ..... مہربین کنول  
 سوئیٹ مہربین خوش رہیے! آپ کی تحریر کیٹ موصول ہوئی اس لیے اس بار شامل نہ ہو سکی مگر قریبی اشاعت میں ضرور شامل ہوگی۔

راولپنڈی ..... عینی سید  
 پیاری عینی! آپ نے بہت دنوں بعد ہمیں یاد کیا آپ کا پیار بھرا کارڈ ہمیں بہت پسند آیا۔ خوش رہیے۔

کراچی ..... افشاں علی  
 مائی ڈول افشاں علی! خوش اور سدا مسکرائی رہیں آپ نہ صرف قارئین کی ہر دل عزیز ہیں بلکہ ہمارے بھی دل سے بہت قریب ہیں خوش رہیں اور خدا کے اچھے نصیب کرے، آمین۔

کراچی ..... ریما نور  
 پیاری ریما! کیسی ہیں آپ اس بار آپ کی ڈاک ہمیں مل گئی تو آپ کی تحاریر شامل اشاعت بھی ہیں۔ اب تو یقیناً آپ خوش ہوں گی۔ فضا ڈول کو ہمارا پیار اور ردا سے جڑی رہیے ردا آپ کا اپنا ردا ہے۔

لاہور ..... نوشین مدثر  
 ڈیر نوشین! طویل غیر حاضری کے بعد آپ کی آہیں اچھی لگی۔ آپ کی نگارشات مل گئی ہیں۔

آنسہ احمد ..... پنڈی  
 ڈیر آنسہ احمد! آپ سے فون پر ہماری بات ہوئی تھی آپ کی تحریر کے متعلق تاحال آپ کی تحریر ہمیں موصول نہیں ہوئی۔ آپ اپنے قریبی پوسٹ آفس سے جا کر اس بابت معلومات کریں۔ ردا ہمیشہ آپ کو وائل کرتا ہے کیونکہ ردا آپ کا اپنا ردا ہے۔

کراچی ..... عشرت شفیع  
 پیاری عشرت شفیع! خوش رہیے آپ سے بات کر کے ہمیں بے حد خوشی ہوئی آپ نے ہماری اور ردا کی برتھ ڈے کو یاد رکھا اور ردا آپ کو بے حد پسند آ رہا ہے تو یقیناً یہ ردا کی رائٹرز کا کمال ہے جو اتنی باکمال تحاریر ردا کے لیے لکھ رہی ہیں۔

لاہور ..... شاہدہ علی  
 ڈیر! اس بار آپ کو ردا نہیں مل سکا۔ وجہ جو بھی رہی ہو۔ مگر اگلے ماہ آپ کو دونوں منٹھ کے ردا مل جائیں گے۔ ☆

**نئے لکھنے والے متوجہ ہوں**  
 ☆ سلسلے وار لکھنے سے پہلے ادارے سے اجازت لینی ضروری ہے۔  
 ☆ تحریر صاف ستھری پیچ کے ایک طرف لکھی ہو۔  
 ☆ پہلے مختصر افسانہ لکھیں پھر ناول یا ناولٹ۔  
 ☆ ہر تحریر کے آغاز میں اپنا نام اور اختتام پر اپنا فون نمبر اور مکمل پتہ ضرور لکھیں۔  
 ☆ ہمیشہ اور پینل مسودہ بھیجیں اور فوٹو اسٹیٹ کاپی اپنے پاس رکھیں۔  
 ☆ مستقل سلسلوں سے متعلق میٹرا لگ الگ صفحات پر لکھیں۔ ایک ہی صفحے پر تمام نگارشات نہ لکھیں۔





## مٹن حلیم

اجزاء

کھ اس دوران دالیں صاف کر کے (الگ الگ پیالوں میں) پانی میں دو گھنٹے کے لئے بھگو دیں تاکہ وہ نرم پڑ جائیں۔ پھر انہیں حسب ذائقہ نمک دال کر ابا لئے رکھ دیں۔ مٹن تیار ہو جائے تو بھون کر آنچ پر سے ہٹالیں۔ دالیں گل جائیں تو ٹھنڈا کر کے انہیں پیس لیں (یا گرائینڈ کر لیں) پھر دال کے اس آمیزے کو مٹن والے پین میں ڈال کر گھوٹا لگائیں اور پہلے کی طرح پانی ڈال کر پکنے دیں۔

کھ جب تک پانی خشک ہو بار بار پین میں گھوٹا لگاتی رہیں۔ جتنی گھوٹیں گی اتنی لذیذ حلیم تیار ہوگی۔ اس پین میں گندم کا دلیہ اور گرم مصالحہ اور ہری مرچیں ڈال کر خوب گھوٹیں اور پکنے دیں تاکہ پانی صرف ایک چوتھائی رہ جائے اور حلیم خوب گاڑھا ہو جائے۔ اب اس میں کارن فلور (پانی میں گھول کر) ٹپچ چلتے ہوئے مکس کر دیں۔

کھ تھوڑی دیر دھیمی آنچ پر پکنے دیں تیل اوپر آجائے۔ پھر لہسن اور پیاز کو ایک الگ پین میں براؤن کر کے اس کا تڑکہ حلیم میں لگائیں اور اوپر سے ہرا دھنیا اور ہری مرچیں ڈال کر گارنش کریں اور رک باریک کتر کر بھی ڈال سکتی ہیں۔ لیموں چھڑکنے سے بھی حلیم مزید ذائقے دار ہو جائے گی۔

نوٹ۔ آپ حلیم کو جس طرح چاہیں مزید مصالحوں سے گارنش کے سرد کر سکتی ہیں۔

مٹن ہڈی کے بغیر	تیل
ایک کلو	دال چنا
آدھا کلو	دال ماش
آدھا پاؤ	دال مسور
آدھا پاؤ	دال مونگ
آدھا پاؤ	حلیم مصالحہ
2 کھانے کے چمچ	گرم مصالحہ
2 کھانے کے چمچ	نمک
حسب ذائقہ	ادرک (کاٹ لیں)
12 آنچ کا ٹکڑا	لہسن
8 عدد	ہری مرچ
3 عدد	پیاز (کاٹ لیں)
100 گرام	دلیہ گندم
2 کھانے کے چمچ	کارن فلور

ترکیب:-

کھ مٹن کو دھو کر صاف کر لیں اور ایک بڑے پین میں ڈال دیں۔ لہسن کو گرائینڈ کر لیں اور اس کا جوس مٹن والے پین میں شامل کر دیں۔ اس کے ساتھ ہی اس پین میں ڈالیں پیاز، نمک، ہلدی، سرخ مرچ اور دو کلو پانی۔ پھر پین کو چولہے پر چڑھا دیں اور درمیانی آنچ پر پکنے دیں۔



حسب ذائقہ  
ڈیڑھ کپ  
1 ٹکڑا

نمک  
تیل  
کوئلہ

## اسپیشل ران روست

اجزاء  
مٹن ران

1 عدد

1 کپ

2 کھانے کے چمچ

1 کھانے کا چمچ

حسب ذائقہ

آدھا کپ

3 کھانے کے چمچ

آدھا کھانے کا چمچ

حسب ضرورت

دہی

لال مرچ

گرم مصالحہ پاؤڈر

نمک

سرکہ

لہسن، ادراک (پیسٹ)

اجوائن (پسی ہوئی)

تیل

ترکیب:-

گوشت کو پسندوں کی شکل میں پتلے پتلے پارچے بنالیں اور اس پر لیموں اور نمک مل دیں آدھا گھنٹہ لگا دہنے دیں اب دہی میں سوائے تیل اور کوئلے کے باقی تمام اجزاء اچھی طرح ملا لیں اور اس آمیزہ میں گوشت کو ڈال دیں اور دو گھنٹے میرینیٹ ہونے دیں۔

پتیلی میں حسب ضرورت تیل ڈال دیں اور اس میں گوشت والا آمیزہ ڈال کر 25 سے 30 منٹ تک ہلکی آنچ پر پکنے دیں پانی خشک ہو جائے تو ہلکی آنچ پر ہی بھونیں۔ کوئلہ دہرائیں اور پھر اس کا دم لگا دیں۔

بھاری کیو جیسا مزہ اٹھائیں۔ لیمن سلاد اور چلی ساس کے ساتھ سرو کریں۔

ران کو اچھی طرح صاف کر لیں پھر اس پر گہرے کٹ لگالیں دہی میں تمام اجزاء سوائے تیل کے مکس کر لیں اور اچھی طرح ران پر لگادیں دو گھنٹے میرینیٹ ہونے دیں۔ اب برتن میں حسب ضرورت تیل ڈال کر ران اس میں ڈال دیں درمیانی آنچ پر 20 سے 25 منٹ تک پکنے دیں۔ پھر پلٹ کر دوبارہ 20 منٹ تک پکائیں۔ گولڈن ہو جائے تو ٹشو پیپر پر نکال لیں۔ چلی ساس کے ساتھ سرو کریں۔

## کٹاکٹ

اجزاء:-

4 عدد

2 عدد

2 عدد

2 عدد (درمیانی

سائز کی)

بکرے کے گردے

بکرے کا دل

بکرے کا مغز

پیاز

ٹماٹر (باریک کاٹ لیں)

1 پاؤ

آدھا پاؤ

1 کپ

2 چائے کے چمچ

حسب ذائقہ

2 کھانے کے چمچ

1 چائے کا چمچ

2 چائے کے چمچ

دہی

تیل

مرچ پاؤڈر

نمک

لہسن/ادراک (پیسٹ)

گرم مصالحہ

سوکھی میتھی (پسی ہوئی)

## تکہ کباب

اجزاء:-

آدھا کلو

1 کھانے کا چمچ

1 عدد

آدھا کپ

2 کھانے کے چمچ

آدھا کھانے کا چمچ

1 کھانے کا چمچ

گوشت

لہسن، ادراک (پیسٹ)

پیاز (درمیانی پسی لیں)

دہی

سرکہ

گرم مصالحہ پاؤڈر

لال مرچ (کٹی ہوئی)



ترکیب:-

دل اور گردوں کے قیمے کی طرح موٹے موٹے ٹکڑے کر لیں۔ اب ان کو تیل گرم کر کے اس میں ڈال دیں ساتھ ہی لہسن، ادراک، مرچ، ہلدی، نمک اور اتنا پانی ڈالیں کہ گوشت گل جائے۔ پھر اس کو اچھی طرح بھون کر ٹماٹر، پیاز اور ہری مرچ کاٹ کر ڈالیں۔

جب یہ چیزیں بھن جائیں تو مغز ابال کر ڈالیں اور ساتھ ہی وہی بھی پھینٹ کر ڈال دیں جب وہی کا پانی اچھی طرح خشک ہو جائے تو سوکھی میتھی اور گرم مصالحہ ڈال کر ایک منٹ تک پکائیں پھر چولہا بند کر دیں راتے اور نان کے ساتھ گرم گرم نوش کریں۔

### لبنانی کباب

اجزاء:-

قیمہ	آدھا کلو
میکرونیز (ابلی ہوئی)	آدھا کپ
نمک	حسب ذائقہ
کالی مرچ (پسی ہوئی)	1 چائے کاجچ
ادراک/لہسن (پیٹ)	1 کھانے کاجچ
پیاز (موٹے کٹی ہوئے)	3 عدد
آلو (ابلے ہوئے)	3 عدد
ہری مرچ (کٹی ہوئی)	2-3 عدد
ٹماٹر (موٹے کٹے ہوئے)	2 عدد
مٹر (ابلے ہوئے)	1 کپ
انڈے	2 عدد
پودینہ	چند پتے
آئل	تلنے کے لئے

پین میں قیمہ، نمک، مرچ، ادراک اور پیاز ڈال کر مکس کر لیں۔ ڈھک کر ہلکی آنچ پر پکا میں پانی خشک ہونے پر بھون لیں۔ آلو کاٹ کر مٹر، ٹماٹر، میکرونیز، ہری مرچیں اور قیمہ ڈال کر گرائینڈ کر لیں۔ اس کے کباب بنائیں۔ انڈے پھینٹ لیں۔ کبابوں کو انڈے میں ڈپ کر کے تیل میں گولڈن فرائی کر لیں۔ لبنانی ڈش تیار ہے۔

### افغانی بریانی

اجزاء:-

1 کلو	مٹن/بیف
4 عدد	(ہڈیوں کے ساتھ)
8 عدد	پیاز
5 عدد	ٹماٹر (پیٹ)
4 عدد	کالی الائچی
4 عدد	چھوٹی الائچی
آدھا کلو	گاجر
6,7 عدد	بادام
آدھا کلو	چاول
(پانی میں بھگو کر رکھیں)	
5,6 عدد	سرخ میٹھی
6,7 عدد	زیتون کا تیل
2 کپ	زعفران
1 چنگلی	

ترکیب:- ایک پین میں پیاز سنہری کر لیں پھر اس میں گوشت مع گرم مصالحہ اور ٹماٹو (پیٹ کے ڈال دیں اور پین کو پکنے کو رکھ دیں تاکہ گوشت گل جائے مصالحے کو چند منٹ بھونیں پھر آدھا کپ پانی ڈال کر پانچ سے دس منٹ پکائیں گاجر کو باریک کاٹ کر فرائی کریں پھر



لگائیں۔ اگر سرخی پر آگئے ہیں تو تھالی تنور سے نکال لیں اور پراٹھوں کے ساتھ گرم گرم کھائیں۔ ان کے ہمراہ گاجر یا شلجم کا اجار یا مولی کے قتلے یا سلا ضرور کھانا چاہیے اس طرح ایک تو ان کی لذت بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے دوسرے یہ جلدی ہضم ہو کر جزو بدن بن جاتے ہیں۔

اس میں پستہ، بادام، کشمش، گاجر اور زعفران ڈال کر مکس کر لیں اوپر سے سبز الائچیاں چھڑک کر بریانی کو بیس منٹ کے لئے دم دیں اور سرو کریں۔  
نوٹ: دہی کے دلتے کے ساتھ بہت مزہ دیتی ہے۔

## تندوری تکے

اشیاء:

گوشت  
پیاز  
دہی  
آئل  
کچا پیتا  
زیرہ، تل، خشخاش  
بھنے ہوئے چنے  
لہسن  
ترکیب:

پیاز کے باریک لٹھے کاٹیں اور انہیں تھوڑے آئل میں تل کر لال کر کے نکال لیں۔ دیگر تمام مصالحے بھی اسی طرح گھی میں تل کر نکال لیں۔ اب انہیں پیاز کے ساتھ پارک پیس لیں پھر گوشت میں پہلے پیتا پیس کر ملا میں پھر پیاز ملاتے ہوئے مصالے بھی شامل کر دیں۔ اب گوشت کی بوٹیوں کو اچھی طرح مکس کر لیں تاکہ اس کے تمام اجزاء خوب اچھی طرح مل جائیں۔ اس میں پس ہوئی ادراک، سیاہوا لہسن، نمک اور دہی بھی ملا دیں اور کم از کم تین گھنٹے تک اسی حالت میں بڑا رنے دیں۔ (اس طرح گوشت کے ریشے مصالحہ جذب کر کے جلد گلنے کے قابل ہو جاتے ہیں) پھر انہیں کسی تھال میں پھیلا کر اودن یا بھٹی یا تنور میں اس طرح دم پر لگائیں کہ تھالی پر ڈھکنے یا سرپوش کی قسم کا کوئی برتن ضرور ہو۔ کچھ دیر بعد اس برتن کو اٹھا کر تکوں کی حالت کا اندازہ

## ہانڈی گولا کباب

اجزاء:

آدھا کلو  
ایک چائے کا چمچ  
ایک کھانے کا چمچ  
ایک کھانے کا چمچ  
ایک کھانے کا چمچ  
دس تا پندرہ عدد  
ایک کھانے کا چمچ  
ایک چوتھائی کپ  
ایک چائے کا چمچ  
ایک چائے کا چمچ  
ڈیڑھ کپ

قیمہ  
خشخاش  
سونف  
سوکھا دھنیا  
کھوپرا  
ثابت لال مرچیں  
پیتا  
بھنا چنا  
گرم مصالحہ  
نمک  
دہی

پیاز (کچی پس ہوئی) ایک عدد  
ادراک، لہسن دو چائے کے چمچے  
ترکیب: ایک برتن میں خشخاش، سونف، سوکھا دھنیا، کھوپرا اور لال مرچ کو بھونیں اور چنے کے ساتھ اچھی طرح پیس لیں۔ قیمے میں پیتا، نمک، ادراک، لہسن اور تمام بھونا ہوا مرکب ملا کر ایک یا دو گھنٹے کے لیے فریج میں رکھ دیں پھر دہی میں ملا لیں اور ان کو گول شکل میں بنالیں۔ تیل گرم کر کے تھوڑے تیل میں فرائی کریں۔ فرائی ہونے کے بعد انہیں پون کپ پانی ڈال کر ہلکی آنچ پر پکنے دیں۔ آخر میں ہری مرچیں، ہرا دھنیا ڈالیں اور چولھے سے اتار لیں۔  
لاجواب ہانڈی گولا کباب تیار ہیں۔



# فضائل قرآن

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا

- ★ تم میں سب سے بہتر وہ شخص ہے جو قرآن شریف کو سیکھے اور سکھائے۔
- ★ حق سبحانہ و تقدس کا یہ فرمان ہے کہ جس شخص کو قرآن شریف کی مشغولی کی وجہ سے ذکر کرنے اور دعائیں مانگنے کی فرصت نہیں ملتی، میں اس کو سب دعائیں مانگنے والوں سے زیادہ عطا کرتا ہوں اور اللہ تعالیٰ شانہ کے کلام کو سب کاموں پر ایسی ہی فضیلت سے جیسی کہ خود حق تعالیٰ شانہ کو تمام مخلوق پر۔
- ★ حصہ دو شخص کے سوا کسی پر جائز نہیں۔ ایک وہ جس کو حق تعالیٰ شانہ نے قرآن شریف کی تلاوت عطا فرمائی اور دن رات اس میں مشغول رہتا ہے دوسرے وہ جس کو حق سبحانہ نے مال کی کثرت عطا فرمائی اور وہ دن رات اس کو خرچ کرتا ہے۔
- ★ حق تعالیٰ شانہ اس کتاب یعنی قرآن پاک کی وجہ سے کتنے ہی لوگوں کو بلند مرتبہ عطا کرتا ہے اور کتنے ہی لوگوں کو پست و ذلیل کرتا ہے۔
- ★ قیامت کے دن صاحب قرآن سے کہا جائے گا کہ قرآن شریف پڑھتا جا اور بہشت کے درجوں پر چڑھتا جا۔ اور ٹھہر ٹھہر کر پڑھ جیسا کہ تو دنیا میں ٹھہر ٹھہر کر پڑھا کرتا تھا۔ بس تیرا مرتبہ وہی ہے جہاں آخری آیت پر پہنچے۔
- ★ جو شخص ایک حرف کتاب اللہ کا پڑھے اس کے لئے اس حرف کے عوض ایک نیکی اور ایک نیکی کا اجر دس نیکی کے برابر ملتا ہے۔
- ★ میں یہ نہیں کہتا کہ سارا (الم) ایک حرف ہے بلکہ الف ایک حرف، لام ایک حرف، میم ایک حرف ہے۔
- ★ جو شخص قرآن پڑھے اور اس پر عمل کرے اسکے والدین کو قیامت کے دن ایک تاج پہنایا جائے گا جسکی روشنی آفتاب کی روشنی سے بھی زیادہ ہوگی اگر وہ آفتاب تمہارے گھر میں ہو۔ پس کیا گمان ہے تمہارا اس شخص کے متعلق جو خود عامل ہے۔
- ★ جس شخص نے قرآن پڑھا پھر اس کو حفظ یاد کیا اور اس کے حلال کو حلال جانا اور حرام کو حرام حق تعالیٰ شانہ اس کو جنت میں داخل فرمادیں گے اور اس کے گھرانے میں سے ایسے دس آدمیوں کے بارے میں اس کی شفاعت قبول فرمادیں گے جس کے لئے جہنم واجب ہو چکی ہو۔
- ★ جس شخص کے قلب میں قرآن شریف کا کوئی حصہ بھی محفوظ نہیں وہ بمنزل ویران گھر کے ہے۔
- ★ دلوں کو بھی زنگ لگ جاتا ہے جیسا کہ لوہے کو پانی لگنے سے زنگ لگتا ہے پوچھا گیا کہ حضور ﷺ ان کی صفائی کی کیا صورت ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ موت کو اکثر یاد کرنا اور قرآن پاک کی تلاوت کرنا۔
- ★ تم لوگ اللہ جل شانہ کی طرف رجوع اور اس کے یہاں تقرب اس چیز سے بڑھ کر کسی اور چیز سے حاصل نہیں کر سکتے جو خود حق سبحانہ سے نکلے ہے یعنی کلام پاک۔
- ★ جو شخص ایک آیت کلام اللہ کی سنے اس کیلئے دو چاند نیکی لکھی جاتی ہے اور جو تلاوت کرے اس کے لئے قیامت کے دن نور ہوگا۔
- ★ کلام اللہ کو آواز سے پڑھنے والا اعلانیہ صدقہ کرنے والے کے مشابہ ہے اور آہستہ پڑھنے والا خفیہ صدقہ کرنے والے کی مانند ہے۔
- ★ قیامت کے دن اللہ کے نزدیک کلام پاک سے بڑھ کر کوئی سفارش کرنے والا نہ ہوگا نہ کوئی نئی نہ فرشتہ وغیرہ۔
- ★ اگر تو صبح کو جا کر ایک آیت کلام اللہ شریف کی سیکھے تو نوافل کی سو 100 رکعات سے افضل ہے اور اگر ایک باب علم کا سیکھے لے خواہ اس وقت وہ معمول بہ ہو یا نہ ہو تو ہزار رکعات نفل پڑھنے سے بہتر ہے۔
- ★ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے حضور ﷺ کو اطلاع دی کہ بہت سے فتنے ظاہر ہوں گے۔ حضور ﷺ نے دریافت فرمایا کہ ان سے خلاصی کی کیا صورت ہے انہوں نے کہا کہ قرآن شریف۔



# سنگھار

## قدرتی فیشل

میں آجائیں تو اسے چہرے پر لگائیں۔ ماسک کو پندرہ منٹ لگا رہنے دیں، بعد میں ٹھنڈے پانی سے منہ دھو لیں۔

ڈرائی اسکن: ڈرائی اسکن (خشک جلد) رکھنے والی خواتین کو چاہیے کہ وہ حسب ضرورت ناشپاتی لے کر اسے گرائنڈ کر لیں۔ اب گرائنڈ کی ہوئی ناشپاتی میں اتنا شہد ملائیں کہ وہ پیسٹ کی شکل اختیار کر جائے۔ اب اس پیسٹ کو چہرے پر فیس ماسک کی صورت میں لگائیں اور 10 منٹ کے لیے چہرے پر لگا رہنے دیں۔ اس ماسک کو آزمانے سے آپ کی ڈرائی اسکن میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑ جائے گی اور وہ نرم و ملائم نظر آنے لگے گی۔

مٹی جلی جلد: اگر آپ کی جلد مٹی جلی (یعنی کہیں سے چکنی اور کہیں سے خشک) ہے تو آپ چند پتیاں گلاب کی لے کر انہیں پیس لیں۔ اس میں چند قطرے عرق گلاب، تھوڑا سا دہی اور شہد ڈال کر پیسٹ سا بنالیں اور چہرے پر لگائیں۔ 10 منٹ لگا رہنے دیں، جب چہرہ دھوئیں گی تو چمکتی جلد دیکھ کر یقیناً آپ کا دل خوش ہو جائے گا۔

حساس جلد: ایک کپ دہی میں آدھا کپ دیہ ڈال کر مکس کر لیں۔ جب گاڑھا سا پیسٹ بن جائے تو اس کی گہری تہہ چہرے پر لگائیں اور اسے سوکھنے دیں۔ پندرہ سے بیس منٹ بعد جب ماسک سوکھنے لگے تو اسے سادے پانی سے دھو لیں۔ آپ کا چہرہ بغیر کسی کیمیکل پراڈکٹ استعمال کیے ہی چمکنے لگے گا۔

خواتین یہ چاہتی ہیں کہ ان کی جلد ہر دم فریش اور خوب صورت نظر آئے۔ وہ بھی بغیر پیسے خرچ کیے۔ مطلب یہ کہ وہ فیس ماسک ٹریٹمنٹ کے لیے بیوٹی سیلونز کا رخ کرنا نہیں چاہتیں بلکہ یہ چاہتی ہیں کہ بغیر خرچہ کیے ہی ان کا کام ہو جائے اور انہیں بیوٹی سیلون جا کر اپنا وقت اور پیسے برباد نہ کرنے پڑیں۔ اس قسم کی سوچ رکھنے والی خواتین کی ہم اس سلسلے میں کچھ مدد کر دیتے ہیں۔ ہم یہاں ان کے لیے چند فیس ماسک کے طریقے بتا رہے ہیں جنہیں وہ آزما کر وقت اور خرچہ دونوں ہی بچا سکتی ہیں لیکن ان تمام باتوں کے ساتھ ساتھ خواتین کو اس بات کا بھی خیال رکھنا پڑے گا کہ وہ اپنی جلد کے حساب سے فیس ماسک آزمائیں، یعنی کہ آپ کی جلد آٹلی ہے تو جو ماسک اس کے لیے بتایا جا رہا ہے وہی آزمائیں۔ اگر آپ کی جلد آٹلی ہے اور آپ نے بجائے آٹلی جلد کے ماسک کے خشک جلد کا ماسک لگا لیا تو ہو سکتا ہے کہ وہ آپ کی جلد کو سوٹ نہ کرے لہذا بہتر یہی ہے کہ جو ماسک جس اسکن ٹائپ کے لیے بتایا جا رہا ہے وہی اسکن رکھنے والی خواتین اسے آزمائیں۔

آٹلی اسکن: آٹلی اسکن رکھنے والی خواتین مندرجہ ذیل فیس ماسک آزما کر اپنی جلد کو تازگی بخش سکتی ہیں۔ یہ آسان ترین فیس ماسک ہے جسے کہیں بھی کبھی بھی باآسانی آزمایا جاسکتا ہے۔ ایک سے دو کیلے لے کر انہیں میس کر لیں۔ جب وہ پیسٹ کی شکل



# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✦ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسجے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

✦ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

✦ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

# WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on  
Facebook

[fb.com/paksociety](https://fb.com/paksociety)



[twitter.com/paksociety](https://twitter.com/paksociety)



نوٹ: ☆ جب بھی فیس ماسک لگائیں، کوشش کریں کہ آپ نے نئے کپڑے نہ پہنے ہوں۔  
☆ جو بھی ماسک لگائیں دھیان رکھیں کہ اسے آنکھوں اور ہونٹوں کے ارد گرد نہ لگائیں۔

☆ فیس ماسک کو بتائے گئے وقت تک ضرور چہرے پر لگائے رکھیں۔ وقت سے پہلے نہ اتاریں۔  
☆ ماسک لگانے سے پہلے بالوں کو اچھی طرح سمیٹ لیں۔ ہیئر بینڈ کا بھی استعمال کر سکتی ہیں تاکہ بال لگائے گئے فیس ماسک پر نہ آئیں۔

### ٹوٹلے

☆ اگر چہرے پر داغ، دھبے اور جھائیاں ہوں تو چہرے کی رنگت یکساں نظر نہیں آتی اور چہرہ بد نما لگتا ہے۔ اس مسئلے کے حل کے لیے ٹماٹر کارس اور جو کا آٹا ملا کر گاڑھا سا پیسٹ بنائیں اور ماسک کی طرح چہرے پر لگائیں۔ خشک ہونے تک اس ماسک کو لگا رہنے دیں پھر کیلی انگلیوں کی مدد سے آہستہ آہستہ رگڑ کر اتار دیں۔ اب ٹھنڈے پانی سے چہرہ دھولیں۔  
اس کے بعد نم چہرے پر وٹامن ای کا ایک کپسول توڑ کر اس کا آئل داغ دھبوں اور جھائیوں پر لگائیں۔

☆ بال اگر خشک، کمزور، بے رونق اور روکھے ہوں تو دو بڑے چمچے بادام کا تیل لے کر اس میں چھ قطرے ٹی ٹری آئل اور چھ قطرے روز میری آئل ملائیں اور رات سونے سے پہلے سر کی جلد پر اس کا مساج کر لیں۔ صبح کسی اچھے شیمپو سے بال دھولیں۔  
ہفتے میں تین مرتبہ اس طریقے پر عمل کرنے سے نہ صرف آپ کے بال نرم و ملائم اور چمکدار نظر آئیں گے بلکہ گرنا بھی بند ہو جائے گا۔

☆ چہرے اور ناک پر بہت زیادہ کیلیں، بلیک ہیڈز اور وائٹ ہیڈز ہوں تو اس کے لیے ہربل اسٹریجٹ تیار کریں۔ ایک چائے کا چمچ پودینے کا عرق لے کر اس میں برابر کی مقدار میں جو کا آٹا اور

چاول کا آٹا ملائیں اور چہرے پر صرف ان ہی جگہوں پر لگائیں جہاں کیلیں اور بلیک ہیڈز ہوں۔ جب ماسک خشک ہو جائے تو اتار دیں اور ٹھنڈے پانی سے چہرہ دھولیں۔ اس طریقے پر روزانہ عمل کریں۔ جلد ہی آپ کا چہرہ صاف ستھرا ہو جائے گا۔

☆ دانوں اور مہاسوں کے داغ چہرے پر پڑ جائیں تو انہیں دور کرنے کے لیے ایک چائے کا چمچ کوکونٹ ملک میں بقدر ضرورت کارن فلور ملا کر پیسٹ بنائیں اور ماسک کی طرح روزانہ چہرے پر لگائیں۔ ماسک خشک ہونے پر اسے اتار دیں اور ٹھنڈے پانی سے چہرہ دھولیں۔ اس سے نہ صرف ایکنی کے داغ دور ہوں گے بلکہ یہ ماسک بہترین اینٹی ایجنگ بھی ہے۔

☆ کپڑوں پر چائے یا کولڈ ڈرنک گر جائے تو فوراً ذرا سا نمک ڈال کر برف مل دیں پھر دھو کر استری کر لیں۔ داغ دور ہو جائیں گے۔

☆ سردیوں کے موسم میں چہرے کی جلد بھی خشک ہو جاتی ہے لہذا اس موسم میں خاص طور سے صابن سے چہرہ دھونے سے گریز کریں اور فیس واشر استعمال کریں۔ کیونکہ صابن آپ کی جلد سے چکنائی اور نمی کھینچ لیتا ہے۔

☆ موسم کوئی بھی ہو لیکن آپ مہینے میں دو مرتبہ اپنے چہرے کی کلیننگ ضرور کریں لیکن جب کہیں باہر مثلاً شاپنگ وغیرہ کے لیے جائیں تو گھر واپس آ کر کلیننگ کرنا نہ بھولیں۔

☆ ایسی اسکن کیئر پروڈکٹس کا استعمال اپنی جلد پر بالکل نہ کریں جن کا رنگ گلابی ہو۔ کیونکہ گلابی رنگ والی کریمز اور لوشنز میں کیمیکلز ہوتے ہیں جو آپ کی جلد کو نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ اس لیے ہمیشہ سفید رنگ کی یا ٹرانسپیرنٹ کریمز، لوشنز اور آئل استعمال کریں۔

☆.....